ٹیکس چور پاکستانیوں کے گرد شکنجہ کسا جا رہا ہے ...... چیئرمین ایف بی آر، طارق باجوہ کی چشم کشا باتیں

اُردو ڈائجسٹ

فروری 2015ء

www.urdudigest.pk

urdudigest.com

سیلز مین سے عالمی شہرت یافتہ
بالر بننے کی داستان جدوجہد

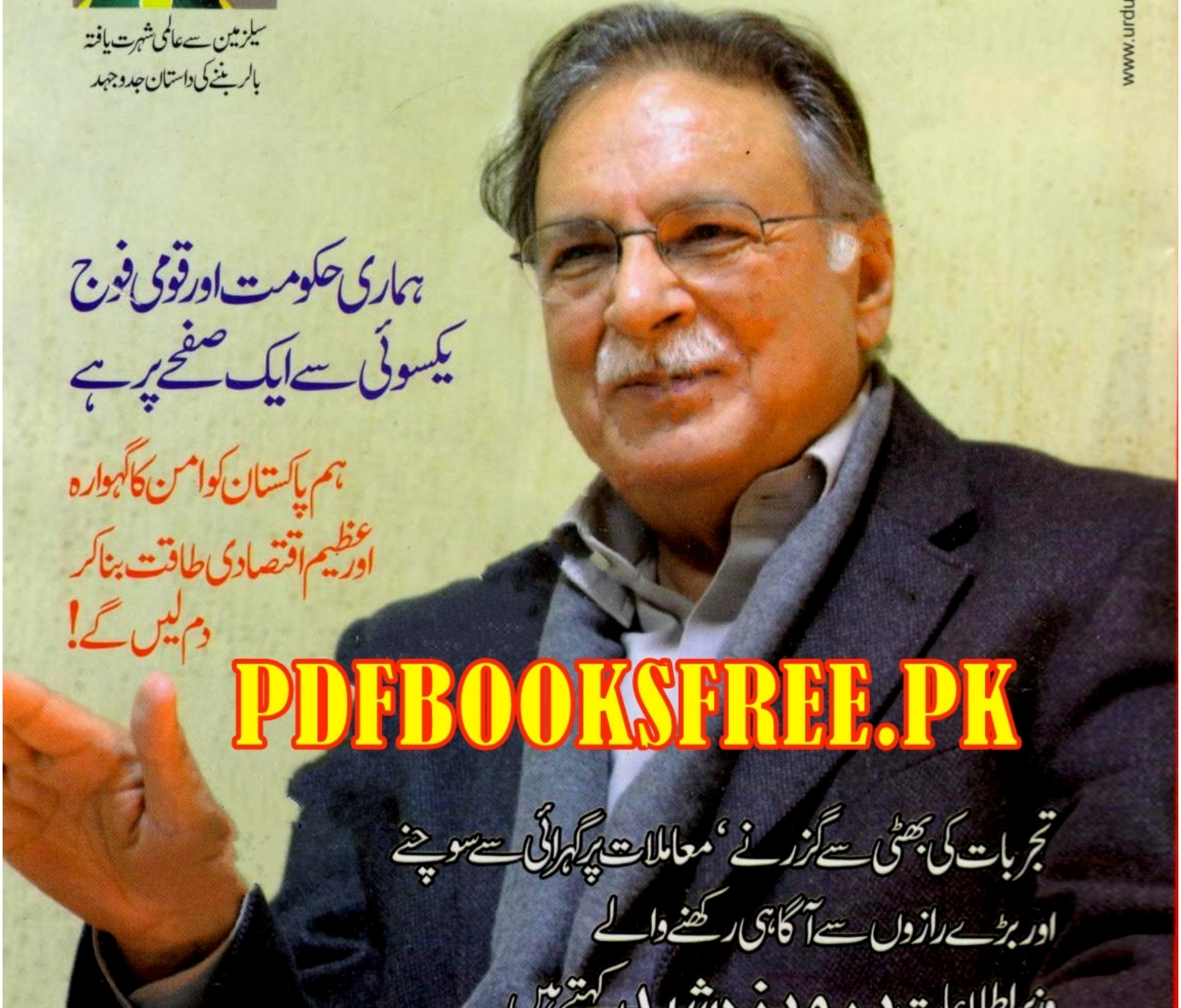

ہماری حکومت اور قومی فوج یکسوئی سے ایک صفحے پر ہے

ہم پاکستان کو امن کا گہوارہ اور عظیم اقتصادی طاقت بنا کر دم لیں گے!

PDFBOOKSFREE.PK

تجربات کی بھٹی سے گزرنے، معاملات پر گہرائی سے سوچنے
اور بڑے رازوں سے آگاہی رکھنے والے
وزیر اطلاعات **پرویز رشید** کہتے ہیں.....

پونچھ میں جنگِ کشمیر کی ولولہ انگیز کہانی

قدرتی علاج کے 100 بے مثال طریقے

چارلی ابدو کی ریاکاری افشا ہو گئی

www.pdfbooksfree.pk

آپ کے تعاون نے بدلی ہے ان کی زندگیاں

عبدالرشید [illegible]

ربیعہ حمید [illegible]

صائمہ گلزار [illegible]

محمد بلال [illegible]

فہد مسعود [illegible]

دلشاد رشید [illegible]

Meezan Bank میزان بنک سمن آباد، لاہور پاکستان اکاؤنٹ نمبر 0240 0100882859

BOP THE BANK OF PUNJAB

بنک آف پنجاب سمن آباد، لاہور پاکستان اکاؤنٹ نمبر 0110 002 000424 0003

بنک آف پنجاب شاہراہ فیصل کراچی پاکستان اکاؤنٹ نمبر 0247 002 000827 0003

لاہور 19/21 اے کریم بلاک ایوان اردو ڈائجسٹ سمن آباد، لاہور فون: 42-37522741-042 فیکس: 042-37552576

آفس موبائل: 0345-8461122, 0333-8461122, 0321-8461122 ای میل: info@kif.com.pk

کراچی آفس: 3/1 جی، بلاک 6۔ پی ای سی ایچ ایس، کراچی فون: 021-34382303 فیکس: 021-34532420 موبائل: 0300-9280487

اسلام آباد آفس: کمرہ نمبر 5، فرسٹ فلور سرت آرکیڈ G-11 مرکز، اسلام آباد فون: 051-2220933 موبائل: 0321-5587250, 0300-8187044

USA Address: 'Karwan-e-ilm Foundation' 19-West 34th Street 1024, New York, NY 1001.
Ph: (212) 268-3500/3501, Fax: (212) 268-3502

http://www.bookstube.net/

www.pdfbooksfree.pk

Copyrighted material

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللہ کا قرآن

وہی سیدھے راستے پر ہیں

اور ہم تمھیں آزمائیں گے کسی قدر خوف سے اور بھوک سے اور مال اور جانوں اور میووں کے نقصان سے اور صبر کرنے والوں کو خوشخبری دو O ان لوگوں کو جب کوئی مصیبت پہنچتی ہے، تو کہتے ہیں کہ ہم تو اللہ ہی کا مال ہیں اور ہم اُسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں O ایسے ہی لوگوں پر پروردگار کی عنایتیں ہیں اور رحمت اور وہی سیدھے راستہ پر ہیں O (سورہ بقرہ ۲: ۱۵۷-۱۵۵)

کتنے منہ اس دن روشن ہوں گے O ہنستے خوشیاں مناتے O اور کتنے منہ اس دن گرد آلود ہوں گے O ان پر سیاہی چڑھ رہی ہوگی O یہ وہی لوگ ہیں جو منکر اور ڈھیٹ ہیں O

(سورہ عبس ۸۰: ۴۲-۳۸)

رسول ﷺ کا فرمان

علماء کی جگہ جاہل فتوے دیں گے

رسول کریم ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ علم کو اس طرح نہیں اٹھائے گا کہ اسے لوگوں کے دلوں سے محو کر دے گا بلکہ علم اس طرح ختم ہوگا کہ علما ختم ہو جائیں گے حتیٰ کہ جب ایک بھی عالم باقی نہ رہے گا، تو لوگ جاہلوں کو سردار بنا لیں گے اور ان سے مسائل کے بارے میں پوچھا جائے گا اور وہ علم کے بغیر فتوے دیں گے، جو خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔''

(صحیح بخاری کتاب: ۳- باب ۳۴: مسلم کتاب العلم- باب ۵)

رسول کریم ﷺ نے فرمایا: ''جب زمانہ قیامت کے قریب ہو جائے گا تو (نیک) عمل گھٹ جائیں گے، لوگوں کے دلوں میں بخل اور لالچ ڈال دیا جائے گا، ہر طرف فتنہ وفساد عام ہو جائے گا اور قتل کی کثرت ہوگی۔

(بخاری کتاب: ۹۲- باب ۵: مسلم کتاب العلم- باب ۵)

http://www.bookstube.net/

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

آنے والے دنوں کا منظرنامہ

اسلام آباد جانا ہو، تو میری اولین ترجیح موٹروے ہی ہوتی ہے۔ ایک تو سفر محفوظ اور دوسرا آرام دہ رہتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس خوشی کا احساس دامن گیر ہوتا ہے کہ ہمارے ملک میں بھی ترقی یافتہ ممالک کی طرح بڑی شاہراہیں بن سکتی ہیں اور موٹروے پولیس جیسا قابلِ فخر ادارہ کامیابی سے اپنا کام کر رہا ہے۔ اس بار بھی ہم موٹروے کے ذریعے ہی اسلام آباد پہنچے۔ مقصد ملک کی اہم ترین شخصیات سے آپ کی ملاقات کرانا تھی۔ اگلے صفحات میں آپ ان شخصیات کے خیالات پڑھ کر اپنی مضبوط رائے قائم کر سکیں گے۔ یقیناً بہت سی معلومات آپ کے لیے نئی ہوں گی۔ ٹی وی اور اخبارات کے ذریعے آپ ان سے ملتے رہتے ہیں، لیکن ہمارے پینل نے تفصیلی انٹرویو کے ذریعے ان کے بہت سے چھپے گوشوں کو بے نقاب کیا ہے۔ ڈھائی دن اسلام آباد گزارنے کے بعد احساس ہوا کہ کئی ماہ سے جاری طوفان جیسے تھمنے کو ہے۔ اس طوفان نے بڑے بڑے سورماؤں کے کس بل نکال دیے ہیں اور کئی موقع پرستوں کے خواب خس و خاشاک کی طرح بکھر کر رہ گئے۔ گو طوفان کی شدت ابھی بھی محسوس کی جا رہی ہے، لیکن موسم کی سختیاں اور حالات کا جبر بہت سے نئے فیصلے جنم دینے والا ہے اور ملاح کشتی کو ساحل تک پہنچانے میں کامیاب ہو جائے گا۔ یقیناً آپ نواز شریف کو عنقریب بہت سے جوان اور نئے چہروں کے ساتھ "فل ایکشن" میں دیکھیں گے۔ گورنر صاحب کا استعفیٰ اس ایکشن فلم کا ٹریلر ثابت ہو سکتا ہے جن کی تعیناتی سے لے کر استعفے تک قوم کے لیے معمہ ہے۔ سب معلوم ہے کہ برطانیہ کی ایک باوقار اور تجربہ کار شخصیت غریب پاکستانی قوم کی حالت تبدیل کرنے کے بجائے وسیع و عریض اور عالیشان گورنر ہاؤس میں بیٹھ گئی ہے اور دوسری شخصیت "تبدیلی" کے جن کو قابو کرنے کے عزم کے ساتھ اسلام آباد...... روحانی مہمانوں کی آمد پر خوشی کے نغمے گائے جاتے ہیں، لیکن خواب بکھرنے پر کچھ ہی عرصہ بعد آنسوؤں کے ساتھ وہ رخصتی کی خبر بن جاتے ہیں۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ غیر ملکی مہمانوں کی

فروری 2015ء
ربیع الثانی 1436ھ
جلد نمبر 55 شمارہ نمبر 2

urdudigest.com www.urdudigest.pk

ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی

الطاف حسن قریشی

طیب اعجاز قریشی

سید عمر محمود

غلام سجاد

حافظ فاروق حسن، نوید اسلم صدیقی، علی اعوان

فاروق اعجاز قریشی

ایقان کامران قریشی

خالد محی الدین

عبدالرحمٰن، اشرف سعید

ڈائریکٹر: ... اعجاز قریشی 0300-8460093

advertisement@urdu-digest.com
منیجر ایڈورٹائزمنٹ: ... 0300-4005579
لاہور: ندیم حامد
اسلام آباد: ... کراچی: شارق ... 0345-2558648

خریداری کے لیے رابطہ subscription@urdu-digest.com
فون: 92 42 37589957 19/21 ... سمن آباد، لاہور
پاکستان 560 الگ سے، 1000 روپے میں
بیرون ملک 60 امریکی ڈالر
اندرون و بیرون ملک سے خریدار اپنی رقم بذریعہ بینک ڈرافٹ درج ذیل اکاؤنٹ نمبر پر ارسال کریں

URDU DIGEST Current A/C No. 800380
Bank of Punjab (Samanabad, Lahore)
Branch Code No 110

اپنی تحریریں اس پتے پر بھیجیں

325, G-III جوہر ٹاؤن، لاہور
فون نمبر +92-42-35290738 فیکس +92-42-35290731
ای میل editor@urdu-digest.com

... 24 ...

http://www.bookstube.net/

www.pdfbooksfree.pk

آمد و رفت کا سلسلہ کب تک جاری رہے گا اور تبدیلی کا جن بوتل سے کب باہر آسکے گا۔ عمران خان ایک حقیقت بن چکے، لیکن جس طرح انھوں نے اب تک سیاست کی ہے، اسلام آباد کی محفلوں میں خان صاحب کے اتالیقوں کی سرعام سرگوشیوں کے مطابق وہ بھارت کے AK-49 کا لقب پانے والے اروند کیجریوال کی طرح اپنی جلد بازی پر مبنی فیصلوں کا شکار ہو چکے ہیں اور اب خان صاحب کا واپس فارم میں آنا ناممکن نہیں، تو مشکل بہت ہو چکا۔

واپسی پر فیصلہ ہوا کہ جی ٹی روڈ کے ذریعے سفر اختیار کیا جائے۔ لالہ موسیٰ کے کرمیاں جی کے ہوٹل سے دال پراٹھے سے لطف اٹھایا جائے۔ کئی سال بعد جی ٹی روڈ کے سفر سے دل خوش ہو گیا۔ جو سڑک ٹوٹ پھوٹ کا شکار رہتی تھی اب ایک اچھی ہائی وے کی شکل اختیار کر چکی۔ جگہ جگہ رونق دیکھی۔ لاہور تک قریباً تمام روڈ کی مرمت ہو چکی۔ بڑے بڑے پلازے تعمیر ہو چکے جن میں ملکی اور غیر ملکی برانڈز کے اپنے آؤٹ لیٹ کھل گئے ہیں۔ شادی گھر جو بڑے شہروں میں امیروں کی تقریبات کے لیے سمجھے جاتے، اب جی ٹی روڈ کے دونوں اطراف قائم ہیں اور ایک وقت میں ہزاروں لوگ ان تقریبات میں شریک ہوتے ہیں۔ سفر کے دوران گاڑیوں کی اتنی تعداد دیکھی کہ اگر وہ موٹروے پر آ جائیں تو ٹریفک پر قابو پانا مشکل ہو جائے۔ فرنیچر، الیکٹرونکس سازی، باتھ روم فٹنگ غرض بے شمار صنعتوں سے تعلق رکھنے والی کمپنیوں کے شوروم دیکھ کر موٹروے کی ویرانی کھٹکنے لگی۔ لالہ موسیٰ پہنچ کر میاں جی کے ہوٹل سے کھانا اور چائے پی کر احساس ہوا کہ اگر دل سے محنت کی جائے، تو اللہ تعالیٰ دال اور چائے کو بھی سونا بنا سکتا ہے۔ پچاس سال پہلے ایک ٹوٹے پھوٹے کھوکھے سے دال بیچنے کا سفر اب ایکڑوں پر محیط شادی گھر تک پہنچ گیا ہے۔ ہوٹل سے ملحق مسجد میں نماز پڑھ کر رب کا شکر ادا کیا اور دعا کی کہ میاں جی جن کے چار بیٹے اب بازو بن چکے، ان کے رزق میں مزید برکت دے اور ہمیں بھی رب تعالیٰ اپنے شکرگزار بندوں میں شمار کر لے۔

اور آخر میں ایک دانا کا قول: "اگر انسان اپنی انگلیوں کا استعمال اپنی ہی غلطیوں کو گننے کے لیے کرے، تو دوسروں پر انگلی اٹھانے کا وقت ہی نہ ملے۔"

tayyab.aijaz@urdu-digest.com

تجربات کی بھٹی سے گزرنے'
معاملات پر گہرائی سے سوچنے
اور بڑے رازوں سے آگاہی رکھنے والے
وزیر اطلاعات ..... کہتے ہیں.....

http://www.bookstube.net
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

عائشہ شاہد

ہم وطنوں کی مثبت سوچ ابھارتا شہ پارہ

حبیب اشرف صبوحی

مذہبی سوالات کے جوابات کوئی قادیانی رہنما نہیں دے سکا

سید ابوالاعلیٰ مودودی

ایک مسلم کو جنت کا حقدار بنا دینے والی روح پرور نصیحتیں

مولانا محمد عدیل باسط زید

ازدواجی زندگی خوشگوار کرنے والا تاریخ اسلام کا چشم کشا واقعہ

محمد احمد ترازی

عجائبات عالم میں شمار ہونے والا اندلسی فن تعمیر کا لازوال شاہکار

کرسٹوفر زیدان

تحریک کشمیر کا روشن باب

سید عاصم محمود

امکانات کے کشادہ دریچے

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

مغربی استعمار
کی انوکھی
اذیت ناک ایجاد

ابوصالح

چیئرمین ایف بی آر طارق باجوہ کی چشم کشا باتیں

رضیہ جمیل

بھارتی انتہا پسندوں کا مطالبہ

ان رشاقی غذاؤں کا مفید تذکرہ جو ادویہ
کے بغیر انسان کو شفایاب کرواتی ہیں

ڈاکٹر آصف محمود جاہ

سیلزمین سے شہرت یافتہ بلے باز بننے تک

رضوان شاہ

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

عرفان جاوید
ایک خوش فہم کا ماجرائے غم

نورین قادر قریشی
بدی کا اندھیرا اس کی نیکی کے روشن اجالے نے دور کر ڈالا

دانیہ صالح
نیکی اگر معمولی بھی ہو تو کبھی رائیگاں نہیں جاتی

جمیل اختر
زندگی میں ہر پل تبدیلیاں لانے والے ایک شوقین کا ماجرا

محمد آصف بھلی
کہاں کی اینٹ کہاں کا روڑا

انوار ایوب راجا
ایک محنتی پاکستانی کا قصہ الم

نیلم احمد بشیر
زندگی کو لوٹ کر چاٹنے والی زندہ لاش کا المناک قصہ

سلمیٰ اعوان
ایک ڈرامائی معاشرتی کتھا

محمد حامد سراج
ایک قانع مزاج شخص کا روح پرور فسانہ

آفاق اللہ خان
گھریلو مسائل سے نمٹنے کی خاطر آقا و چپراسی کے دو مختلف حل

سراج دین
گھمنڈی سردار کی عبرت انگیز داستان

راشدہ علوی
دیارِ غیر میں گزرے تلخ و شیریں لمحات کی دلچسپ یادیں

اشفاق احمد
دو دلوں کی داستان جو پیار کا قرب پا کر بھی ایک نہ ہو سکے

اشرف صبوحی
ایک ہوس پرور کا ناقابل فراموش قصہ

مرزا محمد منور
ہم سا ہو تو سامنے آئے

ڈی ایس پی (ر) دلاور حسین
تھانیدار کا زور بازو آزمانے والے قمار باز کی عبرت اثر داستان

سہیل یوسف
سینہ بہ سینہ چلی آرہی ریاضی کی پیچیدگیاں بیان کرتی کہانی

نیلوفر اقبال
بے رحم باپ کے ہاتھوں پٹے ایک معصوم بچے کا نوحہ

الیگزینڈر پشکن
خیال جب عمل میں ڈھل گیا

ڈان راس
ایک فاتر العقل نوجوان کی کتھا جس کا بچہ چال بسا تھا

مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی
سنت نبوی اپنا کر نفرت و چھوت سے چھٹکارا پایئے

صدیق ہاشمی
شہر پہلواناں کا دلچسپ قصہ

محسن فارانی
اس دورِ حکومت میں بلوچستان کے عوام میں غم و غصہ بڑھ گیا

شفق حیات
ارے شہر والو ہوشیار خبردار

http://www.bookstube.net/

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

الطاف حسن قریشی

چند سال پاکستان پر بہت گراں گزرے ہیں۔ ایسے ایسے طوفان آئے کہ قصرِ دل لرزنے لگا۔ دہشت گرد اور انتہا پسندی کا ناسور ہماری قومی زندگی پر گہرے منفی اثرات مرتب کر رہا ہے۔ ہماری حکومت اور ہماری فوج نے دہشت گردوں کے خلاف ہمہ جہت جنگ کا اعلان کر دیا ہے۔ شمالی وزیرستان میں ان کے ٹھکانے اور ان کا مواصلاتی نیٹ ورک اور ان کے خودکش جیکٹ تیار کرنے والے کارخانے تباہ کیے جا رہے ہیں اور ان کی طاقت پر کاری ضرب لگی ہے۔ آپریشن ضربِ عضب کے خلاف ان کا ردِعمل سامنے آ رہا ہے۔ آرمی پبلک اسکول پشاور میں ایک سو چالیس کے لگ بھگ پھولوں جیسے بچے اور فرض شناس اساتذہ ذبح کر دیے گئے اور شکارپور امام بارگاہ میں خودکش حملہ آور نے ساٹھ سے زائد نمازی شہید کر دیے۔ اسی طرح کے خودکش حملوں کے دوران ۲۰۱۳ء میں انتخابات ہوئے۔ ورنئی حکومتیں قائم ہوئیں، مگر ایک سال بعد ان میں وسیع پیمانے پر دھاندلی کا تنازع کھڑا ہو گیا اور کپتان عمران خاں اور علامہ طاہر القادری نے دارالحکومت اسلام آباد کا محاصرہ کر لیا۔ چار مہینے دھرنے جاری رہے اور بعض اوقات یہ احساس بھی ہوا کہ ریاست کی نبضیں ڈوبنے لگی ہیں، مگر فیاضِ قدرت حکمرانوں کو مہلت عطا کرتی رہی۔ اسی دوران جنرل پرویز مشرف کے خلاف بغاوت کے مقدمے نے سول ملٹری تعلقات میں دراڑیں ڈال دیں۔ اسی اثنا میں توانائی کا بحران گہرا ہو گیا اور پٹرول پمپوں پر کئی روز تک لمبی لمبی قطاریں لگی رہیں۔ چہار سو ایک بابا کار مچ گئی کہ پٹرول کے بغیر جنگ کیسے لڑی جائے گی۔ کراچی میں ایم کیو ایم اور پیپلز پارٹی کے درمیان شدید کشمکش نے بدامنی کا مسئلہ پیدا کر دیا اور ٹارگٹ کلنگ کے واقعات انتہائی ہولناک صورتِ حال اختیار کرتے گئے۔ اس نازک موڑ پر گورنر پنجاب چودھری محمد سرور مستعفی ہو گئے اور انہوں نے اپنی پریس کانفرنس میں بوسیدہ اور کرپٹ نظام کے خلاف چارج شیٹ جاری کر دی جو ہر جگہ موضوعِ گفتگو بنی ہوئی ہے۔

ان اعصاب شکن حادثات و واقعات میں قوم نے بڑے حوصلے کا ثبوت دیا ہے اور فطرت نے بھی اچھے مواقع فراہم کیے ہیں۔ جب عمران خاں پارلیمانی جمہوریت پر حملہ آور ہوئے تو تمام پارلیمانی جماعتیں متحد ہو گئیں اور پارلیمان کے مشترکہ اجلاس کئی ہفتے چلتے اور وزیرِاعظم کی حمایت کرتے رہے۔ ناگاہ تحریکِ انصاف کے منتخب صدر مخدوم جاوید ہاشمی نے اپنے قائد کے درپردہ عزائم بے نقاب کر کے ان عناصر کو پسپائی پر مجبور کر دیا جو غیر آئینی طریقے سے ملک میں تبدیلی لانا چاہتے تھے۔ اسی طرح ۱۶ دسمبر کی صبح پشاور آرمی پبلک اسکول میں دہشت گردوں کی بربریت نے پوری قوم کو جھنجوڑ ڈالا اور سیاسی اور عسکری قیادت کو آنِ واحد میں یک جان کر دیا۔ قوم، فوج اور اداروں نے مکمل اتفاقِ رائے سے فیصلہ کیا کہ دہشت گردی کے مکمل خاتمے تک چین سے نہیں بیٹھیں گے اور تمام وسائل بروئے کار لائے جائیں گے۔ سزائے موت پر عمل درآمد کا جو سلسلہ پانچ سات سال سے رکا ہوا تھا، اس کے دوبارہ جاری ہونے سے دہشت گرد سولی پر لٹکائے جانے لگے۔ عوام کا یہ مطالبہ زور پکڑتا گیا کہ "ہارڈ کور" دہشت گردوں کے مقدمات برق رفتاری سے نمٹائے جائیں تاکہ قانون کی حکمرانی قائم ہو۔ ان کے اسی روز افزوں اضطراب کے پیشِ نظر پارلیمان نے اکیسویں ترمیم اتفاقِ رائے سے منظور کی، مگر عجلت میں کچھ سقم رہ گئے جنہیں دور کرنے کے لیے بائیسویں ترمیم لائی جا رہی ہے مگر وکلا برادری اور سول سوسائٹی کا عمومی میلان یہ ہے کہ فوج پر مزید بوجھ

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

ڈالنے کے بجائے سول اداروں خاص طور پر خفیہ پولیس اور سول انٹیلی جنس ایجنسیوں کو پوری قوت سے متحرک اور فعال کیا جائے۔ پہلے قدم کے طور پر آئی جی پولیس کو انتظامی خودمختاری دی جائے اور فرض شناس اور باصلاحیت اہلکاروں پر تفتیش کاروں اور پروسیکیوٹرز کی ٹیمیں تیار کی جائیں جنہیں بہت اچھے مشاہرے دیے جائیں۔ جج صاحبان، گواہوں اور وکیلوں کی حفاظت کا کام رینجرز یا انسداد دہشت گردی فورس کے سپرد کیا جا سکتا ہے۔ پنجاب میں اس فورس کے قیام نے قوم کو امید اور حوصلے کا پیغام دیا ہے جس کی تربیت میں ہمارے اور ترک فوجی افسروں نے ایک شاندار کردار ادا کیا ہے۔ اس فورس کی پاسنگ پریڈ میں وزیر اعظم اور وزیر اعلیٰ پنجاب کے علاوہ آرمی چیف جنرل راحیل شریف اور ترکی اور سعودی سفیروں کی شرکت نے ایک نیا منظر نامہ تخلیق کر دیا ہے۔ آرمی چیف کے پاسنگ آؤٹ پریڈ میں غیر معمولی انہماک نے یہ گہرا تاثر دیا ہے کہ فوج تمام قانون نافذ کرنے والے اداروں کی استعداد بڑھانے میں پرعزم ہے۔

اس وقت ہم پر قدرت کا خاص انعام یہ ہے کہ تمام مکاتب فکر کے علما دہشت گردی کے خاتمے پر بھرپور تعاون کے لیے تیار ہیں اس لیے اسلامی نظریاتی کونسل کو ان کے ساتھ مشاورت سے دہشت گردوں کے بیانیے کے جواب میں انتہائی آسان زبان میں ایک بیانیہ تیار کرنا چاہیے جس کی طاقت سے عوام کے اندر انتہا پسندی کے خلاف ایک زبردست مزاحمتی تحریک پھیل جائے۔ اصل مقصد قرآن و سنت کی تعلیمات کی روشنی میں ذہنوں کو منور کرنا اور انہیں اعتدال اور میانہ روی کی طرف مائل رکھنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خوش قسمتی سے ہمارے لیے عظیم امکانات کے ان گنت دریچے وا کر دیے ہیں۔ روس کی معیشت کو تباہ کرنے کی امریکی حکمت عملی تیل کی قیمتوں کو کم ترین سطح پر لے آئی ہے جس سے پاکستان کی معیشت اور معاشرت میں ایک عظیم الشان انقلاب رونما ہو سکتا ہے۔ عمدہ منصوبہ بندی کے ذریعے پٹرولیم مصنوعات کی درآمدات میں ایک سال کے اندر اربوں ڈالر بچائے جا سکتے ہیں جن کی بدولت بہت بڑے پیمانے پر منصوبوں کی تشکیل بھی ہو سکے گی اور ایسے منصوبے بھی پایۂ تکمیل کو پہنچ جائیں گے جن سے ہم وافر توانائی حاصل کر سکیں گے اور انسانی وسائل کو فروغ دے سکیں گے۔ امریکی صدر اوباما کا دورۂ بھارت بظاہر جنوبی ایشیا میں طاقت کا توازن بگاڑنے کا باعث بن سکتا ہے مگر اس نے عالمی سطح پر پاکستان کے حق میں ایک سازگار فضا تیار کر دی ہے۔ بھارت اور امریکہ کے درمیان جو معاہدے ہوئے ہیں ان کا بنیادی مقصد چین کے مقابلے میں بھارت کو تیار کرنا ہے۔ اس نے قدرتی طور پر چین اور پاکستان کے تعلقات میں بہت زیادہ گہرائی اور مضبوطی پیدا کر دی ہے اور چین کی اعلیٰ ترین قیادت نے ہمارے آرمی چیف جنرل راحیل شریف اور قومی اسمبلی کے اسپیکر سردار ایاز صادق سے دوران گفتگو یہ عندیہ دیا ہے کہ پاکستان کا کوئی ''متبادل'' نہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ آنے والے منظر نامے میں پاکستان کا حلیف چین ہوگا جو تیزی سے ایک ابھرتی ہوئی عالمی طاقت اور معاشی قوت بنتا جا رہا ہے اور پاکستان بھی اس کی ایک ناگزیر ضرورت ہے۔

یہ بھی نہایت اچھی خبر ہے کہ پاکستان کے روابط روس کے ساتھ مستحکم ہو رہے ہیں جو توانائی کے منصوبوں میں ہمہ پہلو تعاون فراہم کرنے میں غیر معمولی دلچسپی لے رہا ہے۔ گوادر کی بندرگاہ جو ۲۰۱۷ء تک فعال ہو جائے گی اس کی بدولت اس پورے خطے کی اقتصادیات میں زبردست انقلاب رونما ہوگا اور چین کے ساتھ اقتصادی راہداری کی تعمیر سے جنوبی مشرق اور وسطی ایشیا کو تجارت میں غیر معمولی فائدہ پہنچے گا۔ سب سے زیادہ خوش آئند خبر یہ کہ پاکستان اور افغانستان کے مابین مفاہمت اور اعتماد کے رشتے قائم ہو رہے ہیں جو دہشت گردی کو جڑ سے اکھاڑ دینے میں اہم کردار ادا کریں گے۔ تاہم ان فیوض و برکات سے ہم اسی وقت بہرہ ور ہو سکیں گے جب پارلیمان میں فیصلے ہوں گے سول ملٹری تعلقات متوازن رہیں گے اور خود احتسابی کا نظام صحیح معنوں میں موثر ہوگا۔ یہ عظیم کام اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں کا شکر ادا کرنے مثبت سوچ کو اپنانے اور ذاتی مفادات پر عوامی فلاح و بہبود کو ترجیح دینے اور اختیارات کو نچلی سطح تک منتقل کرنے ہی سے سرانجام دیا جا سکے گا۔

الطاف حسن قریشی

http://www.bookstube.net/

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

انٹرویو پینل: الطاف حسن قریشی
طیب اعجاز قریشی، کامران الطاف

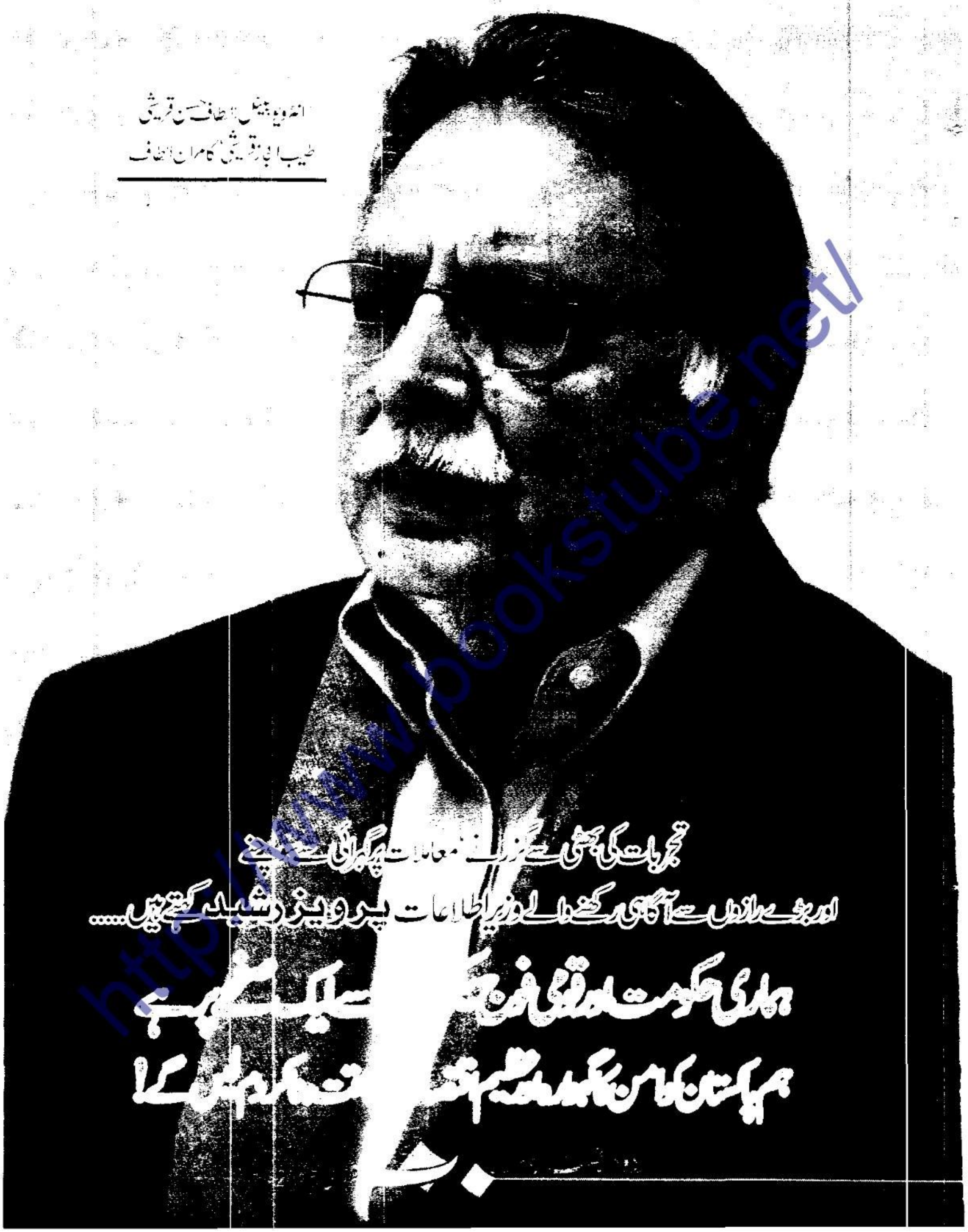

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

ہم جب ۲۷ جنوری کی صبح گیارہ بجے اسلام آباد روانہ ہوئے تو دھند چھائی ہوئی تھی۔ عزیزم طیب اعجاز بڑی احتیاط سے کار چلاتے ہوئے ہمیں دو گھنٹے میں بھیرہ لے آئے۔ ریستوران کے صحن میں ہم نے کھانا کھایا اور دھوپ سے خوب لطف اندوز ہوئے۔ ہوا میں قدرے خنکی تھی جو بہت بھلی لگ رہی تھی۔ ہم وہاں آدھ گھنٹہ ٹھہرے اور میرا ذہن مجھے ماضی کی طرف لے گیا جب وزیرِاعظم نواز شریف نے لاہور اسلام آباد موٹروے کا منصوبہ پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ اس کی تعمیر سے بہت بڑا صنعتی انقلاب آئے گا اور موٹروے کے مختلف منطقوں میں انڈسٹریل زون قائم کیے جائیں گے۔ اس منصوبے پر کوتاہ نظر لوگوں نے بڑی تنقید کی اور اسے معیشت کے لیے "سفید ہاتھی" قرار دیا مگر اردو ڈائجسٹ نے اس منصوبے کی حمایت کی۔ صدر اسحٰق خان نے اپریل ۱۹۹۳ء میں نواز شریف حکومت برطرف کر دی اور نئے انتخابات میں بے نظیر بھٹو کی حکومت قائم ہوئی جس نے موٹروے منصوبے کو طاقِ نسیاں میں رکھ دیا۔ فروری ۱۹۹۷ء کے انتخابات میں نواز شریف صاحب دوسری بار وزیرِاعظم بنے اور اسی سال انھوں نے موٹروے کا افتتاح کیا۔ میں اس تقریب میں شامل تھا۔ کلر کہار کے ریسٹ ہاؤس میں ہم نے یہ خبر سنی کہ کوئٹہ میں سپریم کورٹ کے بنچ نے پاکستان کے چیف جسٹس سجاد علی شاہ کی تقرری کے خلاف حکمِ امتناعی جاری کر دیا ہے کیونکہ وہ سپریم کورٹ کے سینئر ترین جج نہیں تھے۔ موٹروے کا افتتاح ہو گیا اور اس تاریخی سفر میں بلوچستان کے وزیرِاعلیٰ سردار اختر مینگل وزیرِاعظم کی گاڑی چلا رہے تھے۔ وہ عہد بیت گیا اور ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ء کی شام فوج نے اقتدار پر قبضہ کر لیا اور نواز شریف آٹھ سال ملک سے جلاوطن رہے جس کے سبب موٹروے پر صنعتی زون قائم نہ ہو سکے۔ میں سوچ رہا تھا کہ میں پرویز رشید صاحب سے پوچھوں گا کہ وہ صنعتی انقلاب کب آئے گا جس کا وعدہ عوام سے کیا گیا تھا۔

ہمیں اگلے روز وزیرِاطلاعات جناب پرویز رشید کا انٹرویو لینا تھا۔ وہ گزشتہ بیس ماہ سے اپنی حکومت کا بڑی ہنرمندی اور دانش وری سے دفاع کرتے آئے تھے اور صحافتی اور سیاسی حلقوں میں گفتگو کا موضوع بنے ہوئے ہیں۔ ایک حلقہ ان کی

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

باتوں کو منطقی اور اشتعال انگیز بیان کرتے ہیں جبکہ ان کے چاہنے والے ان کے دلائل کی گہرائی اور ان کے لہجے کے ٹھہراؤ سے بہت متاثر ہیں۔ ان کے سینے میں تاریخ کے ان گنت راز پوشیدہ ہیں اور وہ بڑے بڑے واقعات کے چشم دید گواہ ہیں۔ انھوں نے ہمیں تین گھنٹوں کے لگ بھگ وقت دیا اور ہمارے تند و تیز سوالات پر جس تحمل اور حقیقت پسندی کا ثبوت دیا اس نے ان کی شخصیت کا وہ رخ نمایاں کیا جو ٹی وی اسکرین پر نظر آنے والے رخ سے یکسر مختلف اور پرکشش تھا۔ وہ ہمیں اپنے دفتر کے عقبی کمرے میں لے گئے۔ وہ مقررہ وقت سے ڈیڑھ گھنٹہ تاخیر سے پہنچے تھے کہ وزیراعظم کی صدارت میں ہونے والا اجلاس طویل ہو گیا تھا۔ میں ابھی سوال کرنے ہی والا تھا کہ پرویز رشید نے گفتگو کا آغاز کر دیا:

''میں ۱۹۶۴ء سے چودہ سال کی عمر سے اردو ڈائجسٹ کا قاری ہوں۔ آپ راولپنڈی میں مستحہ روڈ پر آ کر ٹھہرتے تھے اور وہاں اختشام اور میں کھیل رہے ہوتے تھے۔ میں نے ایک دفعہ اختشام سے پوچھا کہ یہ صاحب کون ہیں جو آپ کے گھر کے سامنے کار اسٹاپ پر جاتے ہیں۔ اس نے حیرت سے پوچھا، آپ انھیں نہیں جانتے؟ یہ اردو ڈائجسٹ کے ایڈیٹر الطاف حسن قریشی ہیں۔ تب میں اردو ڈائجسٹ باقاعدگی سے پڑھا کرتا تھا۔ خاص طور پر آپ کا اداریہ اور انٹرویو۔ مجھے یاد ہے کہ آپ نے ایک مرتبہ جسٹس صاحب کا انٹرویو کیا تھا جس میں ان کے کمرے کا نقشہ کھینچا تھا اور سرخ پردوں کا خاص طور پر ذکر کیا تھا۔'' مجھے وہ سارا دور یاد آ گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب میں راولپنڈی جاتا تو اپنے محترم دوست سید ضمیر جعفری کے ہاں قیام کرتا جہاں میری عظیم ادبی شخصیات سے ملاقاتیں ہوتیں اور مجھے سید ضمیر جعفری کی شخصیت اور فن سے خوشہ چینی کا موقع ملتا۔ یہ دور سات برسوں پر محیط رہا تھا۔

پرویز رشید صاحب کے حالات زندگی کا سراغ لگانے کے لیے طیب اعجاز نے کہا

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

"میں نے آپ کا پروفائل پڑھا ہے جس میں آپ کے والد کا تحریک پاکستان سے تعلق بتایا گیا ہے۔"

انھوں نے دو ٹوک الفاظ میں کہا "وہ غلط ہے۔ ویسے تو کوئی بھی شخص ایسا نہیں ہوگا جو اس کو غلط کہے گا۔ شاید میں پہلا ایسا آدمی ہوں۔ میرے والد عبدالرشید صاحب کا تجارت سے تعلق تھا۔ تقسیم سے پہلے وہ برما آئل کمپنی کے ملازم اور انڈیا میں برما کی کراچی برانچ کے منیجر تھے۔ پھر انھوں نے برما آئل کمپنی کی ملازمت چھوڑ کر اپنی تجارت شروع کر دی۔ اس زمانے میں اتوار کے دن چھٹی ہوتی تھی۔ مجھ سے بڑی دو بہنیں تھیں، جب میں پیدا ہوا تو اتوار کے روز پیدا ہوا تھا لہٰذا وہ بھی چھٹی منایا کرتے تھے۔ یہ میں آپ کو اس لیے بتا رہا ہوں کہ میری زندگی میں حیثیت کیا ہے۔ راولپنڈی کے سینٹ پیٹرک مشنری اسکول سے تعلیم حاصل کی اور گارڈن کالج سے گریجویشن کی۔ پنجاب یونیورسٹی سے فلسفے میں ایم اے کیا۔ ایوب خان کی حکومت کے خلاف ایجی ٹیشن سے میرے سیاسی کیریئر کا آغاز ہوا۔ اس سے پہلے جس چیز نے مجھے متاثر کیا وہ ایوب خان کی حکومت کی طرف سے جماعت اسلامی کے جلسے میں گولی چلانا اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی طرف سے زبردست مزاحمت کا مظاہرہ تھا۔ غالباً یہ ۱۹۶۳ء کے آخری مہینوں کا ذکر ہے۔ مجھے مزاحمت کرنے والے لوگ بہت پسند ہیں۔ اسی طرح تاشقند معاہدے کے خلاف بھٹو صاحب نے جو مزاحمت کی تھی اس سے بہت متاثر ہوا تھا۔ پھر اکتوبر ۱۹۶۸ء میں ایوب خان کے خلاف راولپنڈی کے طلبہ نے مزاحمت کی تحریک شروع کی تو میں اس کا حصہ تھا۔"

"کیا اس میں شیخ رشید شامل تھے؟" میں نے یادداشت سے مدد چاہتے ہوئے پوچھا۔ جواب میں انھوں نے کہا "شیخ صاحب تو کافی بعد میں آئے تھے۔ وہ [illegible] کالج سے تھے اور [illegible] گارڈن کالج سے۔ وہ راولپنڈی کالج کے تھے۔ میں پہلے ہی [illegible] تھا۔ [illegible] ان کا [illegible] [illegible] کا ساتھ [illegible] [illegible] ایوب خان کے [illegible] آزادی ہے جبکہ طالب علم [illegible] [illegible] [illegible]

http://www.bookstube.net/

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

ایوب خان کے بیٹوں کو ہر قسم کی آزادی حاصل تھی

صاحب پشاور سے راولپنڈی آئے۔ ایجی ٹیشن میں جن لڑکوں کو پولیس نے پکڑا اور مارا، بھٹو صاحب نے ان کو اپنا لیا اور اس طرح ایک تعلق پیدا ہو گیا۔ اس کے دوسرے تیسرے دن وہ بھی لاہور میں گرفتار کر لیے گئے۔ اس واقعے سے میرے اندر سیاسی جراثیم پرورش پانے لگے تھے۔“

وہ بات کر ہی رہے تھے کہ اُن کے پھرتیلے ڈائریکٹر شفقت عباسی اندر داخل ہوئے اور یہ خبر لے کے آئے کہ دو بجے جوڈیشل کمیشن کا اجلاس ہے اور سپریم کورٹ بار ایسوسی ایشن کے سابق صدر جناب یاسین آزاد کا یہ خیال ہے کہ اگر آپ بیس منٹ پہلے آ جائیں، تو اجلاس سے پہلے بعض نکات پر مشاورت ہو جائے گی۔ انھوں نے کہا کہ میں وقت پر پہنچ جاؤں گا اور مجھے اب ڈسٹرب نہ کیا جائے کہ الطاف صاحب انٹرویو کر رہے ہیں۔“

طیب اعجاز نے کہا کہ آپ کے پروفائل میں سن پیدائش ۱۹۴۷ء درج ہے۔

انھوں نے فی الفور کہا:

”نہیں میرا سن پیدائش ۱۹۵۰ء ہے۔ لوگوں نے اپنی طرف سے تاریخ پیدائش لکھ لی ہے۔ میں نے کبھی اپنی پروفائل بنائی ہے نہ کبھی پروفائل انٹرویو کسی کو دیا ہے کیونکہ اپنے بارے میں گفتگو کرنا مجھے پسند نہیں جس میں ہر چیز ’میں‘ سے شروع ہوتی ہے۔ میں یہ وضاحت بھی کرنا چاہتا ہوں کہ میں جدوجہد کا حصہ تو رہا ہوں، لیکن میں نے کسی جدوجہد کو جنم نہیں دیا۔ مجھے بلاوجہ کریڈٹ لینے کا کوئی شوق نہیں اور غلط بیانی کے ذریعے تاریخ کو مسخ کرنے کا ہمیں کوئی حق نہیں پہنچتا۔ میں اس امر کی تردید بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ میں کوئی ذہین طالب علم نہیں تھا۔ کالج میں پہلی پوزیشن رئیس حاصل کرتا اور میری دوسری یا تیسری پوزیشن آتی تھی اور فرق بھی پچاس اور ساٹھ نمبروں کا ہوتا۔“

جناب پرویز رشیدکی باتیں سن کر میں نے بے اختیار کہا کہ آج شاید آپ اپنی ذات کی نفی پر اُترے ہوئے ہیں۔ اس پر اُن کی سفید گھنی مونچھیں مسکرانے لگیں اور انھوں نے ملائم لہجے میں کہا:

”الطاف صاحب! آپ جانتے ہیں کہ خودنمائی بہت بڑی معاشرتی خرابی ہے جس سے ایک سیاسی کارکن کو ہر طرح محفوظ رہنا چاہیے۔“

مجھے محسوس ہوا کہ بعض حلقوں میں پھیلی ہوئی بدگمانی کے مقابلے میں وہ ایک صاف گو اور کھرے انسان ہیں اور جھوٹے اور مانگے تانگے سہاروں سے نفرت کرتے ہیں ورنہ ہم نے بڑی بڑی شخصیتوں کو دیکھا ہے جو اپنی تعریف و توصیف میں کتابیں شائع کرانے کے فن میں ید طولیٰ رکھتے ہیں اور اپنے گرد عظمت کا ہیولہ تخلیق کرتے رہتے ہیں۔ مجھے اُن کے مزاج کی سادگی اور طبیعت کی بے ساختگی پر رشک آیا اور میں نے اُن کے حالات زندگی کا سراغ لگانے کے لیے پوچھا:

”مجھے یاد پڑتا ہے کہ آپ تعلیم کی تکمیل کے بعد صوبہ سرحد چلے گئے تھے۔“

انھوں نے تفصیلات بتاتے ہوئے کہا:

”پی پی کے نصر اللہ خان خٹک جب سرحد میں وزیر بنے، تب پی پی پی جدوجہد کے مرحلے سے گزر رہی تھی۔ نصر اللہ

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

صاحب راولپنڈی میں میرے ہمسائے تھے اور ان سے میرے تعلقات بہت اچھے تھے۔ وہ وزیر بنے، تو انھوں نے بھٹو صاحب سے کہا کہ ہمارے ہاں اسٹوڈنٹس پالیٹکس بہت ہوتی ہے اس لیے پرویز کو میں پشاور لانا چاہتا ہوں۔ وہ مجھے اپنے ایڈوائزر کے طور پر لے گئے۔ میں ۱۹۷۵ء سے ۱۹۷۷ء تک اُن کے ساتھ رہا۔ ڈیرہ اسماعیل خان کے کسانوں کی کچھ شکایات عنایت اللہ گنڈاپور کے خلاف تھیں جو اس وقت سنیئر وزیر تھے اور میں کابینہ میں ایڈوائزر تھا لیکن میں ڈیرہ اسماعیل خان جا کر ان کے خلاف تقریریں کرتا رہا۔ اس پر گنڈاپور، سیف اللہ اور خٹک فیملی کے لوگ اکٹھے ہو کر بھٹو صاحب کے پاس چلے گئے اور انھیں کہا کہ یہ ہماری کابینہ میں ہوتے ہوئے ہمارے خلاف تقریریں کرتا ہے۔ اس وقت کولیشن حکومت تھی۔ بھٹو صاحب اس صوبے میں جیت نہیں سکے تھے۔ انھوں نے نصراللہ خٹک سے کہا کہ مجھ سے استعفا لے لیا جائے۔ میں نے ۳۱ر دسمبر ۱۹۷۶ء کو استعفا دے دیا۔"

"آپ کی عادتیں بڑی دلچسپ ہیں۔" میں نے بے ساختہ کہا اور مجھے ان کی روداد سننے میں بڑا لطف آنے لگا۔ ان سے پوچھا "پشاور کے بعد اپنا اگلا قدم کہاں رکھا۔" انھوں نے کتاب زندگی کا نیا ورق الٹتے ہوئے کہا:

"میں واپس راولپنڈی آ گیا، تو مجھ سے چھوٹے بھائی جاوید نے شادی کر لی تھی۔ اب میری والدہ مجھ پر زور دینے لگیں کہ چھوٹے نے شادی کر لی ہے اور تم ابھی تک کنوارے ہو چنانچہ میں نے بھی شادی کر لی اور اپنا کوئی چھوٹا موٹا کاروبار شروع کرنے کے بارے میں سوچنے لگا۔ میرا سسرال پشاور میں تھا۔ وہاں یونس سیٹھی صاحب سے ملاقات ہوئی اور ان سے مشورہ کیا۔ ہم ان کے جس گھر میں بیٹھے مشورہ کر رہے تھے، وہ ابھی زیرِ تعمیر تھا۔ انھوں نے پائپ کا ایک چھوٹا ٹکڑا اٹھایا اور کہا کہ یہ چیز پاکستان میں نئی نئی شروع ہوئی ہے اور نئے کام میں مقابلہ کم ہوتا ہے، چنانچہ یہ کام تمہارے لیے اچھا رہے گا۔ میں پائپ کا ٹکڑا اٹھا کر لاہور آ گیا جہاں میرے ایک دوست افتخار پلائی وڈ کا کام کرتے تھے۔ انھوں نے کہا کہ فیکٹری کے انجینئر سے پوچھ کے بتاؤں گا۔ پھر مجھے ایک انجینئر سے ملوایا جس نے کاغذ پر مجھے وہ مشین بنا کر دکھا دی جو پائپ بناتی ہے۔ میں نے وہ مشین بنوانا شروع کر دی۔ اس نے کہا کہ یہ ۸۰ ہزار روپے میں بنے گی۔ وہ ۸۰ ہزار کی مشین بنی، تو ایسے لگا جیسے آپ پاکستان کا نیوکلیئر پلانٹ بنا رہے ہوں۔ مشین میں ایک طرف سے کیمیکل ڈالن اور دوسری طرف سے پائپ نکلنا تھا۔ ہوا یہ کہ ہم اس میں کیمیکل ڈالتے، تو دوسری طرف سے بھی کیمیکل نکل آتا۔ اس کے سامنے کنویئر بیلٹ ہونا چاہیے تھا جس کا انھیں کچھ پتہ نہیں تھا۔ یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ اس کے ساتھ کولنگ سسٹم بھی ہوتا ہے۔ بہرحال وہ تجربوں کا زمانہ تھا۔ اس وقت بھٹو پر قتل کا مقدمہ چل رہا تھا اور میں ایک گرفتاری بھی کاٹ آیا تھا۔"

"کوئی بڑی سیاسی مہم جوئی کی ہو گی آپ نے؟" میں نے تجسس آمیز لہجے میں کہا۔ انھوں نے آہستگی سے جواب دیا:

"بس ایک دو پمفلٹ لکھے تھے آمریت کے خلاف، جبکہ آج لوگ روزانہ ہمارے خلاف لکھتے ہیں اور کوئی پوچھتا ہی نہیں۔ شادی کو ابھی تین چار ہفتے ہوئے تھے کہ مجھے اگست ۱۹۷۷ء میں پشاور جیل بھیج دیا گیا۔"

"کیا راجہ انور بھی آپ کے ساتھ پمفلٹ لکھتے تھے؟"

"راجہ انور نے پمفلٹ نہیں لکھے تھے، بلکہ ایک تحریک چلائی تھی۔ لوگ آتے اور گرفتاریاں دیتے تھے۔ پنڈی میں بھی

http://www.bookstube.net/

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

کاروبار شروع کرنے کی خاطر بیگم کے زیور بیچے جو پھر نہ بن سکے

اور لاہور میں بھی۔ اور تب کچھ خودسوزی کے واقعات بھی ہوئے تھے۔ ہماری گرفتاری کے خلاف قاضی انور نے رٹ دائر کی اور چھے ماہ بعد ہمیں ہائی کورٹ نے چھوڑ دیا۔ وہاں سے سیدھا لاہور آیا کہ دیکھوں مشین کا کتنا کام رہ گیا ہے۔ میں نے مشین مکمل کرائی اور اپنی پوری توجہ کاروبار پر مرکوز کر دی۔ جس دن میری مشین سے پائپ کی پہلی پروڈکشن ہوئی، اس دن میں نے میٹھے چاولوں کی دیگ پکانے کے لیے کہا، لیکن اسی دن بھٹو صاحب کو پھانسی ہو گئی۔ میں نے فوری طور پر اپنا پروگرام ملتوی کر دیا اور اس سے چار پانچ روز بعد اپنا کام شروع کیا۔ انہی دنوں پشاور میں ایک سینما میں کچھ لڑکوں نے سیٹ کے نیچے بم رکھا اور خود فلم دیکھنے کے بجائے سینما چھوڑ کے باہر جانے لگے، تو گیٹ کیپر نے انھیں پکڑ لیا۔ میں نے ان لڑکوں کو کچھ پمفلٹ لکھ کر دیے تھے۔ انھوں نے میرا نام لے لیا اور ضیاالحق کی عدالتوں میں مقدمے چلنا شروع ہو گئے، لیکن اس دفعہ میں عدالت میں پیش نہیں ہوا اور خاموشی سے اپنے کاروبار میں لگا رہا۔ فوج والے راولپنڈی میں میرے گھر آتے، تو والد صاحب کہتے کہ میرا اس سے کوئی رابطہ نہیں، وہ شاید ملک سے باہر چلا گیا ہے۔ میں نے ایک خط پی آئی اے کے کسی ملازم کو لکھ کر دیا تھا جس نے جرمنی سے میرے گھر پوسٹ کر دیا۔ وہ خط میرے والد صاحب انھیں دکھا دیتے۔ ضیاالحق تو میری طرف سے بے فکر ہو گئے لیکن اس کی عدالتوں کی طرف سے مجھے ۱۲۳ سال کی سزا سنائی گئی۔

''۱۹۸۵ء میں جب تک جونیجو صاحب نے مارشل لا کا خاتمہ نہیں کیا، تب تک میں منظرِ عام پر نہیں آیا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ میں نے تمام تر توجہ اپنے کاروبار پر مرکوز رکھی۔ اس طرح وہ پنجاب کا بہت بڑا بزنس پراجیکٹ بن گیا۔ میں نے کام زیرو سے شروع کیا تھا اور تمام سرمایہ مشین بنوانے پر لگ گیا تھا، چنانچہ اپنی بیگم کے زیور بھی بیچنا پڑے جو آج تک بنوا کے نہیں دے سکا۔ وہ اتنی شریف عورت ہے کہ مجھ سے اپنے زیورات کا تقاضا نہیں کیا۔ میری ایک پراڈکٹ کا نام رستم اور دوسری راول تھی۔ میں نے پانی، سیوریج اور ٹیوب ویل کے ہر قسم کے پائپ بنانا شروع کر دیے تھے اور آدھے انچ سے لے کر سولہ انچ تک کے پائپ تیار کرتا تھا۔ امریکہ سے مشینیں امپورٹ کرنا شروع کر دی تھیں۔ پلانٹ گلبرگ میں محمد علی کے گھر کے عقب میں تھا۔ ۱۹۹۳ء سے ۱۹۹۶ء تک مسلم لیگ کا میڈیا سیل میری فیکٹری ہی میں تھا۔''

''آپ مسلم لیگ میں کب آئے؟'' میں اتنی بڑی سیاسی تبدیلی کا پس منظر معلوم کرنا چاہتا تھا۔ جناب پرویز رشید نے کسی لاگ لپیٹ کے بغیر جواب دیا:

''۱۹۸۶ء میں محترمہ جب پاکستان واپس آئیں، تو پیپلز پارٹی میں میرے لیے کشش باقی نہ رہی تھی کیونکہ محترمہ مزاحمت ختم کر کے آ رہی تھیں۔ پھر جب میاں نواز شریف نے غلام اسحٰق خان کے خلاف مزاحمت کی تحریک شروع کی، تو مجھے کشش محسوس ہوئی اور ان کا ویژن بھی اچھا لگا۔ میں اور مشاہد حسین سید الگ الگ مسلم لیگ کے زیرِ اثر آئے تھے۔ ۱۹۸۵ء میں مارشل لا ختم ہوا، تو میں پہلی مرتبہ لاہور سے باہر نکلا۔ اس سے پہلے میں نے راوی کا پل بھی پار نہیں کیا تھا۔ اس دوران میرے چھوٹے بھائی طلعت کی شادی ہوئی، اس میں بھی شامل نہیں ہوا۔ میں مری گیا اور دو بیٹیاں میرے ساتھ تھیں۔ مری کی سڑک نئی بنی تھی۔ اس سے پہلے ایک چھوٹی سی سنگل سڑک ہوتی تھی اور اب کارپیٹڈ روڈ تھی جس پہ سائیڈ مرر لگے تھے اور

http://www.bookstube.net
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

حفاظتی دیوار بھی بنی تھی۔ میں نے پوچھا، یہ سڑک کس نے بنائی؟ معلوم ہوا یہ وزیراعلیٰ پنجاب نے بنائی ہے۔ میری فیکٹری میں سب سے زیادہ کام الیکٹرک کا ہوتا تھا اور موٹریں وائنڈنگ کرانا پڑتی تھیں۔ جس آدمی سے میں موٹر وائنڈ کراتا، اسے شام کو دیتا اور دوسرے دن دوپہر تک وہ مجھے تیار کر کے واپس کر دیتا۔ جب میاں صاحب وزیراعظم بنے، تو میرے کام میں تاخیر ہونا شروع ہوگئی۔ میں نے پوچھا تاخیر کی وجہ کیا ہے؟ وہ کہتا، پرویز بھائی کام ہی بہت زیادہ ہے۔ میاں صاحب نے آزاد معیشت کی پالیسی اختیار کی، تو لوگوں کو کاروبار ملنا شروع ہوگیا۔ میں نے اکنامکس پڑھی تھی، اس لیے اُن کی سیاست کے بجائے مجھے ان کی اقتصادی پالیسیاں متاثر کرنے لگیں اگرچہ بھٹو صاحب کا گلیمر ان میں نہیں تھا۔ جب انھوں نے غلام اسحٰق خان کے خلاف مزاحمت شروع کی، تو بھٹو والا گلیمر اور اکنامک پالیسی، دونوں مجھے اچھی لگیں۔ پھر یہ احساس شدت اختیار کرتا گیا کہ اس شخص کا ساتھ دینا چاہیے۔ جب وہ استعفا دے کے آئے، تو انھوں نے موچی دروازے میں تقریر کی۔ میں نے وہ تقریر سنی۔ میں نے پہلی دفعہ انھیں ٹرک پر کھڑے ہو کر تقریر کرتے دیکھا، اس سے پہلے میں نے انھیں دیکھا بھی نہیں تھا۔

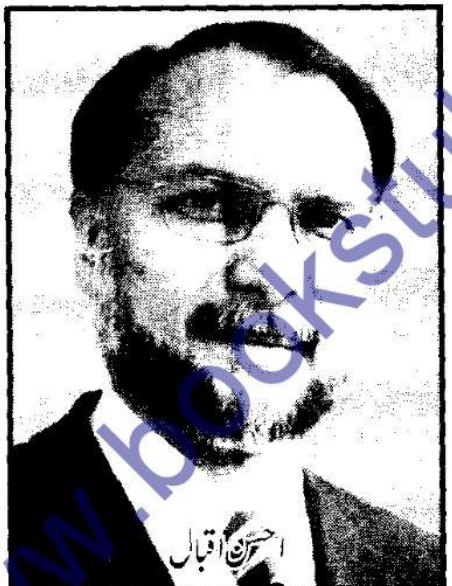

احسن اقبال

میں اگلے دن ماڈل ٹاؤن ان کے گھر چلا گیا۔ میں اس وقت گارڈن ٹاؤن میں رہتا تھا۔ وہاں پر نذیر ناجی صاحب ملے۔ ان سے جان پہچان تھی۔ انھوں نے میرا شہباز شریف سے تعارف کرایا۔ اُن کے ساتھ احسن اقبال صاحب کھڑے تھے۔ شہباز شریف نے احسن اقبال سے کہا کہ پرویز صاحب پارٹی کے لیے کام کرنا چاہتے ہیں، تو آپ ان سے کوئی کام لیں۔ احسن اقبال نے گلبرگ میں میڈیا سیل بنا رکھا تھا۔ وہ مجھے وہاں لے گئے اور میں احسن کا شاگرد بن گیا۔

''احسن نے میرے ذمے یہ کام لگایا کہ میں سارے اخبار پڑھ کر ان میں جتنی بھی خبریں ہمارے حق میں یا خلاف لگتی ہیں، انھیں نشان زد کر کے صبح انھیں دے دیا کروں۔ میں نے کام شروع کر دیا۔ کوئی آٹھ دس روز بعد میاں نواز شریف صاحب کے ڈرائنگ روم میں بڑے میاں صاحب، احسن صاحب اور میں کھڑے تھے۔ احسن صاحب نے کہا کہ آپ کی بڑی مہربانی کہ آپ نے مجھے ٹکٹ دیا ہے۔ میں آج نارووال جا رہا ہوں۔ میاں صاحب نے پوچھا، میڈیا کا کام کون کرے گا۔ احسن صاحب نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا کہ پرویز صاحب کریں گے۔ میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ احسن صاحب مجھے اس آزمائش میں دھکا دے کر خود الیکشن لڑنے نارووال چلے گئے۔ مشاہد صاحب اسلام آباد میں ہوتے تھے اور میں لاہور میں۔ مشاہد صاحب نے بھی مجھے بہت کچھ سکھایا۔ ان کے پاس ٹیم بہت اچھی تھی۔ صدیق الفاروق تھے، خلیل ملک، عرفان غازی یہ سارے لوگ سینئر تھے۔ اس زمانے میں آپ لوگوں کی معاونت بھی بہت رہی تھی۔ آپ بھی مسلم لیگی بن کے کام کر رہے تھے۔ آپ تھے، شامی صاحب تھے اور یوں وہ تین سال اپوزیشن کے اس طرح گزر گئے جس طرح ایک مضبوط اپوزیشن گزارتی ہے۔''

انھوں نے ایک پارٹی سے دوسری پارٹی کی طرف منتقل ہونے کی بڑی خوبصورت اور ذہن کو متاثر کرنے والی تصویر کھینچ

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

دی تھی جس کے ذریعے جناب پرویز رشید کے مائنڈ سیٹ تک پہنچا جا سکتا ہے۔ اُن کی آئیڈیالوجی میں جذبۂ مزاحمت، اقتصادی ویژن اور جمہوری ماحول بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔ وہ اپنے سیاسی سفر کی داستان سنا چکے، تو طیب اعجاز نے پوچھا کہ آپ کے بزنس کا کیا بنا؟ اس کے جواب میں انھوں نے افسانۂ غم سناتے ہوئے کہا:

''میرا بزنس کامیاب رہا، لیکن ۱۹۹۹ء میں جنرل مشرف نے اسے ڈبو دیا۔ ہمارے خلاف چار پانچ درخواستیں رہائشی لوگوں سے دلوائیں اور ہماری بجلی کاٹ دی، حالانکہ وہ رہائشی علاقہ نہیں تھا۔''

''کیا جنرل مشرف نے آپ سے اس بات کا انتقام لیا تھا کہ آپ نے ٹی وی کے چیئرمین کی حیثیت سے اُن کی برطرفی کی خبر چلائی تھی؟''

''جی ہاں، خبر بھی چلائی تھی اور دو تین فوجیوں کو گرفتار کر کے کمرے میں بند بھی کر دیا تھا۔ جمہوریت دو تین منٹ کے لیے واپس آ گئی تھی۔''

''پرویز رشید صاحب! اس تاریخی واقعے کی پوری تفصیل بیان کیجیے کہ ہماری نئی نسل کو ٹھیک طور پر معلوم ہو جائے کہ ہمارے ملک میں کیا کچھ ہوتا رہا ہے۔'' طیب اعجاز نے بےچینی سے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ دو بجنے میں پچیس منٹ رہ گئے تھے اور ہم گرم گرم سوپ پی چکے تھے۔ جناب پرویز رشید نے کہا کہ باقی باتیں شام کے چھے بجے ہوں گی۔

ہم چار گھنٹے بعد اسی چھوٹی سی میز کے گرد آن بیٹھے اور پرویز رشید صاحب نے ۱۲؍اکتوبر کو پیش آنے والے واقعات بیان کرنا شروع کیے:

''ہم اس روز ملتان سے آئے تھے۔ وزیراعظم صاحب نے مجھے خبر دی کہ میں نے چیف آف آرمی اسٹاف تبدیل کر دیا ہے۔ میں ٹی وی اسٹیشن گیا اور پانچ بجے شام کی خبروں میں یہ خبر چلا دی۔ وہاں سے واپس آیا، تو مجھے اطلاع ملی کہ ٹی وی اسٹیشن پر آرمی والے آ گئے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ آپ یہ خبر نہ چلائیں۔ میں بریگیڈیئر کو ساتھ لے کر ٹی وی اسٹیشن آیا۔ میں نے سوچا تھا کہ فوج والے میری بات تو نہیں مانیں گے۔ جب میں وہاں پہنچا، تو یہ لوگ نیوزروم کے اندر تھے۔ نیچے ایک جیپ کھڑی تھی جس پر گن نصب تھی۔ بندوق کی شکل اتنی قریب سے دیکھ کر مجھے خوف محسوس ہوا۔ میں نے ان سے پوچھا، آپ لوگ یہاں کیا کر رہے ہیں؟ انھوں نے کہا کہ ہم یہ خبر رکوانے آئے ہیں اور ہمیں اوپر سے حکم آیا ہے۔ میں نے کہا، اوپر تو یہاں پر میں ہوں کہ پی ٹی وی کا چیئرمین ہوں اور میرے اوپر وزیراطلاعات مشاہد حسین سیّد ہیں۔ آپ سے کہنے کی کیا ضرورت تھی انھیں؟ ان کے بعد وزیراعظم صاحب ہیں جن کے پاس سے میں ابھی اٹھ کر آ رہا ہوں۔ انھوں نے بھی مجھ سے یہ بات نہیں کی، وزیراعظم سے اوپر اللہ میاں ہیں۔ میں چاہ رہا تھا کہ وہ اپنے منہ سے کہیں کہ ہمیں جنرل مشرف کا حکم ہے، تو میں اُن سے کہتا کہ مشرف تو برطرف ہو چکا ہے۔ اتنی دیر میں بریگیڈیئر صاحب نے ان سے کہا کہ تم نے یہ غیرقانونی حرکت کی ہے اور یہاں سے نکل جاؤ۔ خیر وہ آٹھ دس منٹ بعد چلے گئے۔ میں اسٹوڈیو میں داخل ہوا، تو شائستہ زیدی انگلش کی خبریں ختم کر رہی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی انھوں نے کہا کہ سر

http://www.bookstube.net/

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

میں نے وہ خبر پڑھ دی ہے۔اس کے بعد میں ڈائریکٹر نیوز کے کمرے میں آن بیٹھا۔ایک طرف کھڑکی تھی جہاں سے مجھے باہر کا گیٹ نظر آرہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ کالی وردیوں میں لوگ آئے ہیں۔ میرے خیال میں وہ پنجاب کی ایلیٹ فورس تھی۔ ابھی ان کے قدم نہیں جمے تھے کہ خاکی وردیوں والے آگئے۔ انھیں دیکھتے ہی ایلیٹ والے چلے گئے اور انھوں نے دیواریں پھلانگ کر اندر آنا شروع کر دیا' کیونکہ گیٹ بند تھا۔ وہ اندر آئے، تو ہمارا ایک ملازم انھیں لے کر سیدھا اس کمرے میں آیا جہاں میں بیٹھا تھا۔ وہاں انھوں نے دو بندوقوں والے میرے پاس کھڑے کر دیے اور حکم دیا کہ یہاں سے آپ کہیں نہیں جائیں گے۔اس کے بعد ٹیلی فون کی تاریں کاٹ دیں۔ میں رات کے پونے بارہ بجے تک وہاں بیٹھا رہا۔

''تھوڑی دیر بعد ایک میجر صاحب آئے اور مجھے چلنے کے لیے کہا۔ میں نے سوچا کہ اب یہ کہیں جا کر مجھے گولی ماریں گے کیونکہ میری بغاوت ناکام ہو چکی تھی۔ نیچے لا کر مجھے جیپ میں بٹھایا اور اس نے خود اسٹیرنگ سنبھال لیا۔ ہمارے آگے پیچھے بندوقوں والے تھے۔ جیپ وہاں سے نکلی' تو سوچنے لگا کہ یہ میرے ساتھ کیا کریں گے؟ مجھے گولی ماریں گے یا کہیں لے جا کر بند کر دیں گے؟ میں نے سوچا، میجر کا مزاج معلوم کیا جائے' چنانچہ میں نے پوچھا میجر صاحب! کیا آپ کی سردیوں اور گرمیوں کی وردی ایک ہی ہوتی ہے۔ اگر اس نے کہا، بکواس بند کرو تو اس کا مطلب ہے گولی اور اگر موٹی سی گالی دی' تو مطلب اس سے بھی زیادہ بھیانک سزا۔ وہ مجھے وردی سے متعلق بتانے لگا کہ جولائی سے ستمبر تک ایسی ہوتی ہے اور ستمبر سے اکتوبر تک ایسی۔ میں سمجھ گیا کہ اس کے ارادے خطرناک نہیں

1999ء میں فوجی پی ٹی وی کا دروازہ پھلانگ کر داخل ہو رہے ہیں

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

ہیں۔ گفتگو کے دوران اس نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کا فلیٹ نمبر کیا ہے؟ میں نے پارلیمنٹ لاجز کا فلیٹ نمبر بتایا۔ وہ مجھے فلیٹ میں لے آیا۔ وہاں کوریڈور میں پندرہ بیس فوجی پہلے ہی کھڑے تھے۔ میرا ٹیلی فون کنکشن کاٹ دیا گیا' میرا موبائل فون اس نے اپنے پاس رکھ لیا اور کہا کہ آپ باہر نہیں نکلیں گے' آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہوئی' تو دروازہ اندر سے کھٹکھٹائیں گے۔ باہر ہمارا آدمی کھڑا ہے' وہ اندر آئے گا اور اسے آپ اپنی ضرورت بتا دیں گے۔ میرا کچن بند کر دیا اور ملازم کو اپنے ساتھ لے گئے۔ میں ٹیلی ویژن کے سامنے جنرل صاحب کی تقریر سننے کے لیے بیٹھا رہا جو غالباً صبح چار پانچ بجے ہوئی تھی۔ کوئی دس پندرہ دن انھوں نے مجھے یہاں رکھا اور اس کے بعد کہا کہ آپ لاہور چلے جائیں اور کسی قسم کی سیاسی سرگرمی میں حصہ مت لیں۔ اب میں آزاد تھا۔ نیچے اترا جہاں میری گاڑی کھڑی تھی، اس میں بیٹھ کر لاہور آ گیا اور ساتھیوں کو فون کیا۔ پتہ چلا کہ تہمینہ دولتانہ کے گھر میٹنگ ہو رہی ہے۔ میں وہاں پہنچ گیا جہاں اخبارنویس بھی آئے ہوئے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ یہ جو کچھ ہوا' غیرقانونی اور غیرآئینی ہے اور ہم اس کی مذمت کرتے ہیں۔ میں گھر آیا، تو اعجاز الحق کا فون آیا کہ آپ کو اتنا سخت بیان نہیں دینا چاہیے تھا۔ میں نے کہا کہ اعجاز بھائی اتنا سخت قدم اٹھ گیا ہے اور پندرہ دن گزر چکے ہیں جبکہ پارٹی خاموش ہے۔ یہ بیان نہ دیتا، تو کیا کرتا؟ ان کا فون بند ہوا' تو میرے ایک دوست جو اخبار میں کام کرتے تھے اور ان کا گھر میرے نزدیک ہی تھا' وہ میرے پاس آ گئے۔ ہم محوِگفتگو تھے کہ گیٹ پر گھنٹی بجی۔

میں باہر گیا' تو پوری گلی گاڑیوں اور جیپوں سے بھری ہوئی تھی۔ گیٹ پر جو صاحب کھڑے تھے انھوں نے کہا کہ آپ میرے ساتھ چلیں۔ میں نے کہا، اجازت ہو تو چپل پہن لوں۔ انھوں نے اثبات میں سر ہلایا۔ اندر چپل پہننے آیا، تو بیوی سے کہا کہ یہ لوگ مجھے لے جا رہے ہیں۔ انھوں نے مجھے گاڑی میں بٹھایا اور چل پڑے۔ کوئی پانچ سات منٹ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد گاڑیاں اچانک رک گئیں۔ انھوں نے مجھے دوسری گاڑی میں بٹھایا اور میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی۔ اس کے بعد نہیں معلوم کہ مجھے کہاں لے گئے۔ بس ایک کمرہ تھا جس میں کوئی چیز بھی نہیں تھی۔ کرسی، چارپائی، گلاس کچھ بھی نہیں تھا۔ اس دن سردی بھی شدید تھی۔ میں فرش پر لیٹ گیا۔ اب معمول یہ تھا کہ صبح سویرے کچھ فوجی صاحبان آ جاتے اور سوال جواب کرتے رہتے۔ انھوں نے کہا کہ مغربی پریس میں بدمعاش (Rogue) آرمی کا اشتہار چھپا ہے' یہ تم نے چھپوایا ہے۔ میں نے کہا، اس اشتہار کے خلاف مہم ضرور چلائی تھی اسے چھپوایا ہرگز نہیں تھا۔ میں نے جو مہم چلائی تھی' اس کا ریکارڈ ہر جگہ موجود ہے' لیکن چھپوانے کا کوئی ریکارڈ نہیں۔ اگر آپ کے پاس ہے' تو مجھے دکھائیں۔ مغرب کے اخبارات میں کچھ بھی مفت نہیں چھپتا، اس کی پیمنٹ کسی نے کی ہوگی جس کا پتہ لگایا جا سکتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اشتہار کس نے چھپوایا ہے' یہ تو ہم پتہ کر لیں گے مگر ''بدمعاش'' کا لفظ آپ کو ڈیسائی دے کر گئے تھے۔ میں نے کہا کہ ڈیسائی صاحب سے میری ملاقات ہی نہیں ہوئی۔ ان کو میں نے اتنی ہی دوری سے دیکھا تھا جتنا باقی لوگوں نے دیکھا تھا۔ انھوں نے کہا، ہمارے پاس ملاقات کا ریکارڈ ہے۔ میں نے کہا، مجھے وہ ریکارڈ دکھائیں۔ اس دوران وہ ہر طرح کا

http://www.bookstube.net

www.pdfbooksfree.pk

Copyrighted material

تشدد بھی کرتے رہے جو ان کا طریقہ ہے۔ کبھی تفتیش سے پہلے، کبھی تفتیش کے دوران اور کبھی تفتیش ختم ہو جانے کے بعد۔ کچھ دن اسی طرح گزر گئے اور پھر مجھے کوٹ لکھپت جیل میں ڈال دیا گیا۔ آخری دنوں میں میری حالت یہ ہوگئی تھی کہ ایک آدمی مجھے بازوؤں کے سہارے اُٹھاتا تھا۔ مزے کی بات یہ کہ جو کیس مجھ پر چلایا گیا وہ بڑا دلچسپ ہے۔ ان کے بقول ایک محبِ وطن گلی سے گزر رہا تھا کہ اس نے سنا کہ میں محبِ وطن جنرل انچیف پرویز مشرف کی توہین کر رہا ہوں اور انھیں گالیاں نکال رہا ہوں۔ اس پر اس شہری کو دکھ ہوا اور جا کر تھانے بتایا۔ فرض شناس تھانیدار سارے کام چھوڑ کر سیدھا میرے گھر آیا اور مجھے گرفتار کر کے لے گیا۔ یہ ایف آئی آر تھی۔"

پرویز رشید مہینوں جس کرب سے گزرے اور جس بہیمانہ تشدد کا شکار ہوئے، اس کا ذکر کرتے ہوئے اُنھوں نے کمال ضبط سے کام لیا۔ اُنھوں نے اصولوں کے ساتھ وابستگی اور جرأت اظہار کی بھاری قیمت ادا کی۔ اُن کے زخم مندمل ہونے میں بڑا وقت لگا جبکہ روح کے زخموں کی کسک باقی ہے۔ اُن کی اولوالعزمی نے سیاست کا وقار بلند کیا اور یہی اُن کی سب سے بڑی داخلی قوت ہے۔

داستانِ خونچکاں سنتے ہوئے طیب اعجاز نے سوال کیا:

"اس کمرے کی نسبت جیل آپ کو زیادہ بہتر لگی ہوگی؟"

انھوں نے بڑے پُرسکون اور باوقار انداز میں جواب دیا:

"جیل میں بیرک کے باہر برآمدے میں لوہے کی جالیاں اور جنگلے لگے ہوئے ہیں اور اُن کے اندر چھے سات کمرے ہیں۔ سارے کمرے انھوں نے خالی کرا دیے اور ایک کمرے میں مجھے بند کر دیا۔ وہ کمرہ اس لیے بہتر تھا کہ وہاں تشدد نہیں ہوتا تھا اور سونے کے لیے وہاں مٹی کا چبوترہ تھا۔ مٹی کا ایک گھڑا بھی تھا اور ایک بیت الخلا، البتہ ایک قباحت تھی کہ اسی گھڑے سے میں پانی پیتا اور اسی سے طہارت بھی کرتا تھا۔ تقریباً چھے ماہ بعد ہائی کورٹ سے میری ضمانت ہوگئی، لیکن ضمانت کے بعد پھر مجھے دوبارہ پکڑ لیا اور کیمپ جیل میں ڈال دیا۔ الزام یہ لگایا کہ میں نے کسی زمانے میں ایک سپاہی سے بندوق چھینی تھی۔ وہ روزانہ مجھے انسدادِ دہشت گردی کی عدالت میں لے جاتے، وہاں تاریخ مل جاتی اور اسی طرح چکر لگتے رہتے۔ ایک دن عدالت میں حاضر ہوا تو وہاں ایک نئے جج براجمان تھے جو میری فائل پڑھ رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر پوچھا کہ پرویز رشید آپ ہیں، میں نے کہا، جی ہاں، تو انھوں نے پولیس والے سے کہا کہ آپ نے انھیں ہتھکڑی کیوں لگا رکھی ہے؟ عدالت میں ہتھکڑی لگا کر ملزم پیش نہیں کیے جاتے، ان کی ہتھکڑی کھول دو۔ میں نے سوچا کہ یہ کوئی مختلف آدمی ہے۔ پولیس والے نے میری ہتھکڑی کھول دی۔ جج صاحب نے پوچھا، ان کا کیس کیا ہے؟ یہ مقدمہ تو کسی زمانے میں بے نام لوگوں کے خلاف بنا تھا جسے وزیراعظم صاحب دس سال پہلے واپس لے چکے ہیں، تو انھیں کیوں پکڑ رکھا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں کیس واپس لینے کا ریکارڈ نہیں ملا۔ جج صاحب نے کہا کہ اگر ریکارڈ نہیں مل رہا، تو قصور آپ کا ہے یا ان کا؟ انھیں چھوڑ دو۔ جج صاحب نے مجھ سے کہا، پرویز صاحب! آپ اپنے گھر جائیں۔ میں نے اس فرشتہ صفت انسان سے کہا کہ نہ کوئی شخص مجھے یہاں سے لے جانے والا ہے، نہ کوئی ایسا آدمی ہے جو ضمانت کے کاغذات پُر کر سکے۔ انھوں نے کہا کہ کوئی بات نہیں آپ جائیں اور شام کو کسی کو لے آئیے

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

خوشی ہو یا تکلیف‘ یہ دونوں زندگی میں گزر جانے والے عمل ہیں

جو مچلکے پر دستخط کردے۔ میں نے آپ کی ضمانت لے لی ہے۔ آپ کے ساتھ بہت زیادتی ہوئی ہے۔ میں نے ان سے درخواست کی کہ اپنے ٹیلی فون سے مجھے گھر فون کرنے دیں۔ انھوں نے کہا چیمبر میں جا کے فون کرلیں۔ میں نے گھر فون کیا اور ڈرائیور آکر مجھے لے گیا۔ شام کے وقت میں نے قانونی ضروریات پوری کردیں۔ زوار حسین شاہ ان کا نام تھا جن کا جنوبی پنجاب سے تعلق تھا۔ میں ان سے ملتا جلتا رہتا ہوں۔ انھوں نے کبھی کسی سے ذکر نہیں کیا، لیکن جب کہیں بھی بات ہوتی ہے، تو میں ان کو یہ قصہ ضرور سناتا ہوں۔ دوسرے صابری صاحب تھے جو روز مجھے عدالت میں ملتے تھے۔ ایک دن میں وزیراعلیٰ صاحب سے ملاقات کرنے گیا‘ تو وہاں بیٹھے تھے۔ میں انھیں پہچان نہ سکا۔ وہ وزیراعلیٰ سے اپنی کوئی صفائی پیش کررہے تھے۔“

میں نے جناب پرویز رشید سے پوچھا، یہ آپ کن دنوں کی بات کررہے ہیں؟ انھوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا:

”شہباز شریف جب دوبارہ نئے نئے وزیراعلیٰ بنے‘ تو میں ان سے ملنے گیا۔ انھوں نے مجھ سے پوچھا، آپ صابری صاحب کو جانتے ہیں۔ انھوں نے صابری کہا‘ تو مجھے یاد آ گیا کہ یہ تو وہی جج ہیں۔ شہباز شریف نے مجھ سے کہا کہ یہ کہتے ہیں کہ مشرف حکومت نے ان سے بڑی زیادتی کی ہے جبکہ مسلم لیگی کارکن مجھے بتاتے ہیں کہ یہ ان کے ساتھ بڑی زیادتی کرتا رہا۔ میں نے کہا کہ ان کی قسمت خراب ہے جو میں یہاں آ گیا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ آپ کے پاس یہ کیوں بیٹھے ہیں۔ ان سے پوچھیے کہ انھوں نے میرے ساتھ کیا کچھ کیا تھا۔ بچارے صابری کا کام خراب ہو گیا۔ شہباز صاحب کی فیملی میں سے کوئی بچہ صابری صاحب کی بیگم کے پاس پڑھتا تھا اور اس نے سفارش کی تھی۔ اسی وقت شہباز شریف نے فون اٹھا کے کسی بچے سے بات کی۔ مجھے یہ نہیں معلوم کہ وہ بچہ کس کا تھا، بھائی کا تھا یا رشتے داروں میں سے کسی کا۔ انھوں نے اس سے کہا کہ یہ آدمی اچھا نہیں اور اس نے ہمارے کارکنوں پہ بڑا ظلم کیا ہے اور مجھے بہت افسوس ہوا ہے کہ تم نے اس کی سفارش کی۔ مکافاتِ عمل اسی کا نام ہے۔“

کامران الطاف نے سوال کیا‘ کیا آپ کی پارٹی کے لوگ عدالت میں پیشی پر آتے تھے۔ آپ نے کہا کہ ضمانت والے دن وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔

پرویز رشید نے توانا آواز میں کہا:

”وہ اتفاقاً ایسا تھا، وگرنہ کارکن ہر پیشی پر آتے تھے۔ اس دن مجھے یاد ہے کہ شدید سردی تھی اور فروری کے آخری دن تھے۔ میں کھڑکی سے دیکھ رہا تھا کہ بسنت کی گڈیاں بچے اڑا رہے ہیں۔ کبھی کبھار صحافی بھی آجاتے۔ میں جب کوٹ لکھپت جیل میں تھا‘ تو ادیب جاودانی اور عطاالحق قاسمی صاحب آئے تھے اور کھانا وغیرہ بھی لائے تھے۔ میں چیزوں کو نارمل لیتا ہوں۔ خوشی ہو یا تکلیف‘ میں سمجھتا ہوں کہ دونوں گزر جانے والے عمل ہیں۔“

پرویز رشید صاحب کی اس بات میں بڑی حکمت پوشیدہ تھی کہ خوشی اور غمی کے زمانے زندگی میں آتے رہتے ہیں اور انسان کو اعتدال پر رہنا چاہیے۔ میرے اندر یہ معلوم کرنے کی جستجو پیدا ہوئی کہ فوجیوں نے انہیں جس بے دردی سے ذہنی

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

اور جسمانی اذیت پہنچائی تھی، وہ اُن کے ذہن پر کس حد تک اثر انداز ہوئی ہے، چنانچہ میں نے اُن سے براہِ راست پوچھ لیا:

''فوج نے آپ کے ساتھ جو زیادتی کی ہے اس کے باعث آپ کے دل میں کدورت اور تلخی تو نہیں آ گئی اور آپ کے رویے فوج کے بارے میں عدم توازن کا شکار تو نہیں ہو گئے؟''

انھوں نے کسی تذبذب کے بغیر بڑی رسائی سے کہا:

''الطاف صاحب! اس ضمن میں آپ کو دو واقعات سناؤں گا۔ یحییٰ خان کے زمانے میں ایک مارشل لا ملٹری کورٹ سے مجھے چھے سال کی سزا ہوئی۔ آپ کو یاد ہوگا کہ بھارت نے پی آئی اے کی پروازوں پر پابندی لگا دی تھی۔ اس حوالے سے میں نے راولپنڈی میں تقریر کر ڈالی جس میں یحییٰ خان کو بہت زیادہ تنقید کا نشانہ بنایا اور انڈیا کو بھی لعن طعن کیا۔ میں نے کہا کہ اگر عوامی حکومت ہوتی، تو ڈٹ کے مقابلہ کرتی اور اس طرح ہتھیار نہ ڈال دیتی۔ ہم ان دنوں ہر چیز کے اندر سے جمہوریت نکال لاتے تھے، تو مجھ پر کیس بنا اور مجھے چھے سال کی سزا ہوئی۔ اگست میں جیل ہوئی اور دسمبر میں الیکشن ہوئے، تو ان کے فوری بعد رہائی مل گئی۔ میں ابھی جیل ہی میں تھا، تو میں نے اخبار میں پڑھا کہ شمالی علاقہ جات میں برف باری ہو رہی ہے اور جو فوجی تعینات ہیں، اُن کے پاس جرابیں نہیں ہیں یا بہت کم ہیں۔ میں جب جیل سے نکلا، تو گھر جانے کے بجائے تاجروں کے بازار چلا گیا جہاں گرم ملبوسات بکتے ہیں۔ میرے ساتھ دو تین دوست بھی آ ملے جن میں حافظ طاہر خلیل بھی تھے۔ پورے بازار سے دو تین ٹرک جرابوں کے اکٹھے کیے۔ اس وقت احمد صادق ڈپٹی کمشنر تھے اور ہم نے وہ ٹرک ان کے حوالے کیے کہ یہ فوج کو بھجوا دیں۔ اگر فوج کے بارے میں کوئی غصہ ہوتا یا نفرت ہوتی، تو ہم یہ کام ہرگز نہ کرتے۔ دوسرا واقعہ ڈیڑھ سال بعد کا ہے کہ میں اپنے کالج میں گھوم رہا تھا کہ ایک لڑکا مجھے ملا اور پوچھا، داخلہ فارم کہاں سے ملتے ہیں؟ میں نے کہا، میں آپ کو داخلہ فارم لے دیتا ہوں۔ وہ میٹرک کے امتحان سے ابھی فارغ ہوا تھا۔ میں نے اس کے ساتھ جا کر داخلہ فارم لیا، اسے پُر کیا اور پرنسپل کے دفتر میں جمع کرا دیا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ لڑکا کون ہے۔ کچھ دنوں بعد وہ مجھے ڈھونڈتا ہوا آیا اور کہنے لگا کہ میں نے والد صاحب کو بتایا ہے کہ آپ نے میری مدد کی ہے اور آپ کا نام بھی لیا، تو انھوں نے مجھ سے کہا کہ انھیں میرا سلام کہنا اور بتانا کہ تم میرے بیٹے ہو۔ اس بچے کے والد اسپیشل ملٹری کورٹ کے سربراہ تھے جس نے مجھے سزا دی تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ لاکھوں لوگوں کا قصور نہیں ہوتا۔ یہ اوپر والے چند لوگ ہوتے ہیں جو اپنے مقاصد کی خاطر ایسا کرتے ہیں۔''

اب میں ایک نہایت حساس اور نازک معاملے کو زیرِ بحث لانے لگا تھا۔ عوام و خواص میں حکومت اور فوج کے تعلقات کے بارے میں طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں اور عجب عجب نتائج اخذ کیے جا رہے ہیں۔ میں نے پرویز رشید سے صاف صاف پوچھ لیا:

''آپ واقعی یہ سمجھتے ہیں کہ سیاسی اور عسکری قیادت قومی معاملات میں یکسو ہیں؟''

انھوں نے آٹومیٹک جواب دیتے ہوئے کہا:

''دونوں ہی نے اپنے تجربات سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ یکسوئی اس حد تک ہے کہ پاکستان کی خارجہ پالیسی کا ایجنڈا، دہشت گردی کے خاتمے کا ایجنڈا، دوسرے ممالک سے معاشی امداد کا ایجنڈا، اس میں جتنی کامیابیاں اب تک پاکستان کو ملی

ہیں، اس کے اندر عسکری رویے کا بڑا دخل ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ جہاں سے وزیراعظم ہو کر آتے ہیں یا اُنھیں جہاں جانا ہوتا ہے، وہیں آرمی چیف جاتے ہیں۔ اگر وہ باتیں کچھ اور کرتے اور سیاسی قیادت کچھ اور کہتی، تو پھر آپ کو یہ کامیابیاں کبھی نہ ملتیں۔ ذرا موازنہ کیجیے کہ ہماری حکومت بننے سے پہلے مغربی پریس ہمارے متعلق کیا کہتا تھا اور اب کیا لکھتا ہے۔ ان کے دفتر خارجہ طرح طرح کی باتیں کیوں نہیں کرتے؟ وہ اس لیے کہ انھیں جو بات وزیراعظم ہاؤس میں سننے کو ملتی ہے وہی بات انھیں فوج کی طرف سے سنائی دیتی ہے۔ اگر دونوں ایک صف میں نہ ہوتے، تو دھرنا تو ہمارے دروازوں تک پہنچ گیا تھا۔ قبریں بھی کھود لی گئیں اور کفن بھی پہن لیے گئے تھے۔ یقیناً عسکری قیادت میں وہ لوگ پرعزم تھے جو سمجھتے تھے کہ جو کچھ ہو رہا ہے، قطعی طور پر درست نہیں۔''

جناب پرویز رشید بڑے اعتماد سے اپنا نقطۂ نظر پیش کرتے ہوئے اور واقعات کی جو تعبیر پیش کر رہے تھے، اس میں وزن محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے درپردہ حقائق معلوم کرنے کے لیے پوچھا کہ پانچ کور کمانڈروں کی جو کہانیاں پھیل رہی تھیں، اُن کی حقیقت کیا تھی اور وہ حالات پر کس قدر اثرانداز ہو رہے تھے۔ انھوں نے صاف گوئی سے، کام لیتے ہوئے کہا:

''میں ذاتی طور پر نہیں جانتا کہ وہ چار تھے یا پانچ یا چھے۔ میں نے بھی وہی سنا تھا جو آپ سن رہے تھے اور تحقیق کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ میں تو چیف کو دیکھتا تھا جو ایک ہی بات کہتا تھا کہ آپ کی طرف سے کوئی غلطی نہ ہو جس سے کسی کو انارکی پھیلانے کا موقع ملے، باقی کام میں سنبھال لوں گا۔ وہ ہم پر بڑا مشکل وقت تھا اور انھوں نے بھی بڑی ذہانت کے ساتھ پورے معاملے کو سنبھالے رکھا۔ ظاہر ہے اُن پر بھی پریشر آتا ہوگا، لیکن اگر ہم سے کوئی غلطی ہو جاتی، تو وہ کہتے کہ آئین کی ایسی کی تیسی۔ انھوں نے اس کٹھن مرحلے میں اپنی وفاداری ثابت کی۔ اس کے بعد حالات اچھے ہوتے گئے۔ عمران خان کو پتہ چل گیا تھا کہ ان کے سر پر اب کوئی ہاتھ نہیں رہا ہے۔''

''گویا خان صاحب کو پہلے گمان تھا کہ ان کے سر پر کسی کا ہاتھ ہے؟'' میں تہہ تک پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''گمان تو انھیں تھا۔''

''محض گمان تھا یا کوئی سچ مچ کا اشارہ تھا۔''

''ریٹائرڈ فوجی بڑے سرگرم تھے اور وہ ان کو گائیڈ کرتے تھے کہ اس طرح سے کرو اور پھر فکر مت کرو، باقی خود بخود ہو جائے گا' کیونکہ حکومت کے اندر بڑے تضادات ہیں اور ان کے پاس کوئی چارہ نہیں رہے گا۔ اتالیق کئی تھے۔ اب دیکھیں الطاف صاحب! میں آپ کی تحریریں پڑھتا رہا ہوں جس وقت آپ نے وہ باتیں لکھیں آپ کو کچھ خبر نہیں تھی کہ صبح کیا ہوگا اور آپ کہاں ہوں گے۔ اس کے باوجود آپ نے جرأت اور کومٹ منٹ کے ساتھ لکھا، میں کہتا ہوں کہ معاشرے کا ایک مضبوط حصہ اپنی روایات کے ساتھ ڈٹا رہا۔ الطاف صاحب! آپ کہہ سکتے تھے کہ مجھے تو کبھی نواز شریف نے ٹیلی فون کر کے نہیں بلایا، لیکن آپ نے کہا کہ جو صحیح ہے وہی لکھوں گا۔ یہ سوچ ہر جگہ اور ہر طبقے میں تھی اور فوج میں بھی تھی۔ آپ کے کالم کے سامنے دوسرا کالم بھی چھپتا تھا کہ آج ہی جا کے وزیراعظم کو گردن سے پکڑ لو۔ پہلے ہر دفعہ دوسری سوچ غالب آتی رہی، جبکہ اس دفعہ آپ کی سوچ

http://www.bookstube.net
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

غالب اور کامیاب رہی۔ آپ کی سوچ اس لیے غالب آئی کہ جو اوپر بیٹھے تھے، وہ آپ سے متفق تھے۔“

اُن کی آنکھوں سے ایک سرشاری جھانک رہی تھی اور اُن کی پیشانی پر حرفِ عبودیت نمایاں تھا کہ وہ دل میں اللہ تعالیٰ کا شکر بجالا رہے تھے۔ بات کو آگے بڑھاتے ہوئے طیب اعجاز نے پوچھا:

”بات چار حلقوں سے شروع ہوئی تھی، اس پر چودھری نثار نے بھی کہا تھا کہ ہم حلقے کھول دیں گے، لیکن بات آگے بڑھ گئی، یہ چار حلقے کھولنے میں رکاوٹ کیا تھی؟“

انھوں نے برجستگی سے کہا:

”حلقے اسی وقت کھل گئے تھے۔ خان صاحب پورے آٹھ مہینے اس ٹریبونل میں نہیں گئے۔ حلقے ہماری وجہ سے نہیں اُن کی وجہ سے بند رہے۔ آج انھوں نے کہہ دیا ہے کہ میں اس ٹریبونل کے فیصلے کو مانتا ہی نہیں۔ اُن کا مسئلہ یہ ہے کہ فیصلہ میرے حق میں آئے گا، تو مان لوں گا اور وہ میری مرضی کا نہیں، تو نہیں مانوں گا۔“

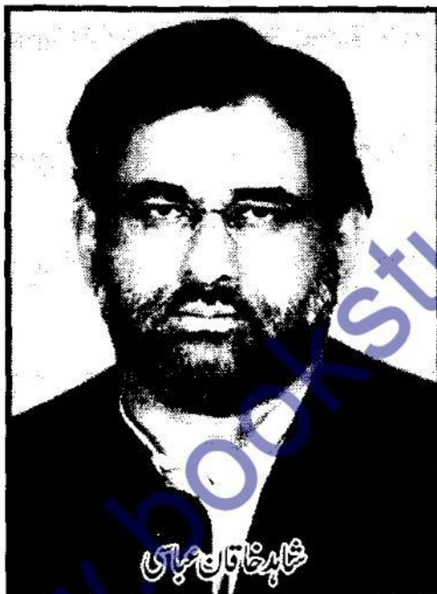
شاہد خاقان عباسی

ہمارا انٹرویو ماضی کے تلاطم خیز واقعات سے گزرتا ہوا حال اور مستقبل کے دیو قامت مسائل پر مکالمے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ عوام کے اندر یہ تشویش پائی جاتی ہے کہ حکومت کی کارکردگی اُن کی توقعات سے بہت کم ہے اور ایک وزیر پر کئی وزارتوں کا بار ڈال دیا گیا ہے۔ میں نے ان عوامی احساسات کو سوال کے قالب میں ڈھالتے ہوئے کہا:

”آپ کی حکومت نے کفایت شعاری سے کام لیتے ہوئے دو دو تین تین وزارتیں ایک وزیر کو دے رکھی ہیں اور آپ کے پاس بھی تین اہم وزارتیں ہیں۔ کیا آپ ان سب کے ساتھ انصاف کر پا رہے ہیں؟“

انھوں نے سادگی میں پُرکاری کا رنگ بھرتے ہوئے جواب دیا:

”وزیر اعظم صاحب الیکشن سے پہلے کہہ چکے تھے کہ ہم اس وقت تک چھوٹی کابینہ سے کام چلائیں گے جب تک اپنی معیشت کو مستحکم نہیں کر لیتے۔ اس وقت ہم نے ایک سال کا وقت طے کیا تھا۔ درمیان میں دھرنا آ گیا اور کئی ماہ ضائع ہو گئے۔ اب وزیر اعظم صاحب کابینہ میں توسیع پر کام کر رہے ہیں۔ کچھ نوجوانوں کو وزرائے مملکت لگانا ہے جو سینئر لوگوں کے ساتھ کام کریں گے۔ بعض بڑی وزارتوں میں ایک سے زیادہ وزرائے مملکت مقرر کرنا ہوں گے۔ پنجاب کے وزیر اعلیٰ بجلی اور پانی کے معاملات میں اس لیے ایک سرگرم کردار ادا کر رہے ہیں کہ ان کے صوبے کے پراجیکٹ بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔“

”پرویز رشید صاحب! یہ تاثر عام ہے کہ آپ کی حکومت بہت تاخیر سے فیصلے کرتی ہے۔ ایک تاثر یہ بھی ہے کہ ایک وزیر دوسرے وزیر سے بات تک نہیں کرتا، یہ چیزیں اخبارات میں چھپ رہی ہیں۔ ایک چھوٹی سی کابینہ میں بھی ہم آہنگی نہ ہو، تو اس سے زیادہ تکلیف دہ بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ پٹرول کے بحران پر جتنے متضاد بیان آئے ہیں، وہ اندر کے کھوکھلے پن کو واضح کرتے ہیں۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ آپ سیاسی وحدتِ فکر سے کام لیں، اتنا بڑا چیلنج ہے اور آپ

http://www.bookstube.net/

www.pdfbooksfree.pk

حد درجہ سست گام ہیں' اس کے اصل اسباب کیا ہیں؟''

''الطاف صاحب! جمہوریتوں میں اکثر دوسرے نظاموں کی نسبت فیصلہ سازی کا نظام قدرے سست ہوتا ہے۔''

''پرویز رشید صاحب! یہ تو وہ بات ہے جو آپ اکثر کہتے رہتے ہیں، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ بیشتر جمہوری ملکوں میں عوامی مسائل حل کرنے پر سب سے زیادہ توجہ دی جاتی ہے اور بروقت فیصلے ہوتے ہیں۔ حکومت کی گڈ گورننس ختم ہو رہی ہے۔ میرے خیال میں آپ کو انہی حقیقتوں کا ادراک اور احساس ہی نہیں۔ اگر آپ ناراض نہ ہوں.....؟''

''الطاف صاحب! ناراض کیوں ہوں گا۔ کم از کم دو اشخاص ایسے ہیں جو آپ سے ناراض نہیں ہو سکتے۔ ایک میں اور دوسرا احسن اقبال۔ ہم آپ کے پرستاروں میں سے ہیں۔ الطاف صاحب! امر واقعہ یہ ہے کہ ایک تو آپ کو مشاورت کرنا پڑتی ہے۔ دوسرا ہماری پارٹی مختار کل نہیں ہے' کیونکہ تین صوبوں میں دوسری پارٹیاں برسر اقتدار ہیں۔ اٹھارہویں ترمیم سے اختیارات مرکز سے نکل کر صوبوں کے پاس چلے گئے ہیں۔ علاوہ ازیں ہمارے پاس سینیٹ میں اکثریت نہیں ہے۔ آپ کو ہر فیصلے کے قانونی تقاضے پورے کرنا ہوتے ہیں۔ سینیٹ کو بھی ساتھ لے کے چلنا ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں ہر فیصلے کے مالیاتی پہلو بھی ہیں۔ بعض اوقات آپ فیصلہ کر لیتے ہیں، لیکن پیسے نہیں ہوتے۔ ہماری حالت ایسی ہو گئی تھی کہ ہمارے ریزرو بہت کم تھے اور ڈالر ہمارے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ ہم نے مختلف اداروں کے سربراہ لگانا شروع کیے، تو سپریم کورٹ نے حکم امتناعی جاری کر دیا۔ ہماری حکومت کے پہلے چھ مہینے چودھری افتخار نے ضائع کر دیے۔ پہلے حکم ہوا کہ اشتہار دو گے پھر بورڈ بنے گا اور شارٹ لسٹنگ ہو گی۔ اب یہ کوئی کلرک کا اشتہار تو نہیں کہ پانچ چھے ہزار لوگ درخواستیں لے کر آ جائیں۔ آپ کو چیف ایگزیکٹو لگانے ہیں۔ دنیا میں کون سا ملک ہے جس کے چیف ایگزیکٹو لگانے کا اشتہار دیا جاتا ہے؟ قابل آدمی اور اپنے فن کا ماہر کبھی درخواست نہیں دیتا۔''

مجھے اُن کی باتیں سن کر یہ مصرع یاد آ گیا کہ دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے، لیکن اُن کے مسکراتے چہرے کو دیکھ کر بات کو آگے بڑھانے کا حوصلہ ہوا اور میں نے نکتہ اُٹھایا:

''چلیے وہ معاملہ تو اب ختم ہو گیا۔ یہ بتائیے کہ کیا آپ کی حکومت نے اچھے اور باصلاحیت افراد کی تلاش کا عمل شروع کر دیا ہے؟''

''ہم تلاش کر رہے ہیں۔''

''نظر تو کچھ بھی نہیں آ رہا۔''

''نظر اس لیے نہیں آ رہا کہ پاکستان میں آ کر کوئی کام کرنے پر آمادہ نہیں۔ وزیراعظم صاحب لوگوں کی منتیں کر رہے ہوتے ہیں۔ جواب میں وہ کہتے ہیں میاں صاحب! جو خدمت کہیں گے میں نیویارک میں بیٹھ کر سرانجام دے دوں گا' لیکن پاکستان نہیں آؤں گا۔ کوئی کہتا ہے میرے بچے نہیں آنا چاہتے، کیونکہ سیکیورٹی کا مسئلہ ہے۔ دوسرا ایشو یہ ہے کہ آپ کی حکومت قائم رہتی ہے یا نہیں۔ مسائل تو ہیں۔ آج ایک اجلاس میں بات ہو رہی تھی کہ سیالکوٹ کا جوائیر پورٹ بنا ہے

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

اگر حکومت بناتی، تو ۳۰، ۳۵ ارب روپے میں تیار ہوتا۔ صنعت کاروں نے تین چار ارب روپے میں تعمیر کر کے فعال کر دیا ہے۔ یہ بات احسن اقبال نے میاں صاحب کو بتائی۔ بات شروع ہوئی تھی کہ خاقان عباسی نے گیس کے لیے ٹرمینل بنایا ہے، وہ ایک سال میں مکمل ہو گیا، جبکہ عام طور پر ٹرمینل بنانے میں چار سے پانچ سال لگتے ہیں۔ میاں صاحب خاقان عباسی سے پوچھ رہے تھے، یہ کام اتنا جلدی کیسے ہوا؟ انھوں نے کہا کہ میاں صاحب! سرکار کے کاموں میں بڑا وقت لگتا ہے۔ اوپر سے فائل چلے گی، تو نیچے آتے آتے دس جگہوں پر رکے گی۔ جہاں کوئی رشوت نہیں دے گا وہاں رک جائے گی۔ پرائیویٹ سیکٹر نے دن رات کام کر کے وہ ٹرمینل مکمل کر لیا۔ پیسے بھی تھوڑے لگے۔ سرکار کے اندر پورا ایک سسٹم اور ایک پوری زنجیر ہے۔ یا تو وہ اسی جذبے سے کام کر رہی ہو جس جذبے سے قیادت سرشار ہے۔ اب ایسی کوئی جادو کی چھڑی نہیں کہ آپ ایک دن میں انھیں تبدیل کر دیں۔ پی ٹی وی ہی کو لیجیے۔ میں سمجھتا ہوں کہ نیوز ڈائریکٹر معیار کے مطابق کام نہیں کر رہا۔ یہی مسئلہ جیو کا ہے، تو وہ جس کو چاہیں گے اٹھائیں گے اور لگا دیں گے، لیکن یہاں میں جس کو لگاؤں گا، تو ایک ہنگامہ کھڑا ہو جائے گا۔ لوگ فوراً عدالتِ عظمیٰ سے حکمِ امتناعی لے کر آئیں گے۔ سپریم کورٹ کہے گی تم کون ہوتے ہو گروپ ۶ کو لگانے والے، گروپ ۷ میں فلاں آدمی بیٹھا ہے۔ میں کہوں گا کہ جی اس کو لکھنا ہی نہیں آتا۔"

مجھے احساس ہوا کہ انھیں سنگین حقیقتوں کا ادراک بھی ہے اور عوامی جذبات کا احساس بھی، مگر ان کی حکومت کو ایک سازگار ماحول میسر نہیں آیا اور اسے توقعات پر پورا اترنے میں گوناگوں مشکلات پیش آ رہی ہیں۔ اس کے باوجود اس کی طرف ایک اُمید بھرا پیغام دیا جانا ضروری ہے۔ میں نے وزیرِ صاحب سے کہا:

"تو آپ یہ تاثر دے رہے ہیں کہ پاکستان میں کوئی آنے کو اور کوئی کام کرنے پر تیار نہیں۔ نیچے لوگوں کو آپ بدل نہیں سکتے، تو کیا آپ پیغام یہ دے رہے ہیں کہ صورتِ حال جوں کی توں رہے گی؟"

"الطاف صاحب! میں یہ پیغام نہیں دے رہا۔ میں اس سوال کا جواب دے رہا ہوں کہ فیصلہ سازی میں دیر کیوں ہو رہی ہے۔ آپ سو اچھے کام کرتے رہیں، لیکن ایک دھماکا ہو گا تو سب صفایا ہو جائے گا۔ آپ کہیں گے کہ حکومت نے بیس مہینوں میں یہ دھماکے ختم کیوں نہیں کیے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے ہوم ورک بڑی محنت سے کیا ہے اور پالیسیاں بھی بنائی ہیں، مگر دہشت گردی کی تباہ کاریوں نے گمبھیر مسائل پیدا کیے ہیں۔"

طیب اعجاز نے ایک اور پہلو کی طرف توجہ دلاتے ہوئے تفصیل سے بتایا کہ ہمیں مختلف شعبوں میں کوئی حکومتی پالیسی نظر نہیں آ رہی۔ مثلاً مجھے ایک پیپر مل لگانی ہے جس کے لیے مجھے دس میگاواٹ بجلی چاہیے، تو کیا میں اپنی بجلی پیدا کروں یا فرنس آئل یا کوئلے پر انحصار کروں؟ اسی طرح ہم فروٹ اور سبزی کے بہت بڑے ایکسپورٹر ہیں اور پیکجنگ انڈسٹری میں بھی ہیں جو تمام صنعتوں کی ریڑھ کی ہڈی ہے۔ ایف ایم سی جی سے لے کر چمڑے تک کی تمام انڈسٹری کو ہم نے پیکجنگ دینا ہوتی ہے۔ ہم جب کسی بورڈ میں بیٹھتے ہیں، تو ہمیں حکومت کی طرف سے کوئی پالیسی نہیں ملتی، تو ہم کیا لائحہ عمل اختیار کریں؟

پرویز رشید صاحب ان کی بات بڑے غور اور تحمل سے سنتے رہے اور پھر ایقان افروز لہجے میں کہنے لگے:

"ہم انڈسٹری کے لیے دنیا بھر کی پالیسی بنا کے دے بھی دیں، لیکن اگر توانائی دستیاب نہیں، تو کچھ نہیں۔ اسی طرح اگر لا اینڈ آرڈر ٹھیک نہیں، تو بھی کچھ نہیں۔ ان دو برسوں میں ہم نے آپ کو گیس اور بجلی کی وہ تکلیف نہیں ہونے دی جو اس

http://www.bookstube.net/

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

سے پہلے پہنچتی رہی ہے۔ اب زیرو لوڈشیڈنگ وزیراعظم کا ماٹو ہے۔ ایل این جی اس لیے درآمد کی جا رہی ہے کہ انڈسٹری کے لیے توانائی کی قلت پیدا نہ ہو۔ مشکل حالات میں بھی گیس ٹیکسٹائل کو ملتی رہی ہے۔ اس دور میں بھی جب گھروں کے چولھے ٹھنڈے ہونے لگے تھے اور لوگوں کو تھوڑی سی تکلیف ہوئی تھی، لیکن ہم نے انڈسٹری کو تکلیف نہیں ہونے دی، کیونکہ اس سے لوگوں کا روزگار اور ہماری ایکسپورٹ وابستہ ہے۔ ہم نے توانائی کی قلت اور دہشت گردی کے خاتمے کو ترجیح دی ہے۔ جب تک یہ مسئلے حل نہیں ہوتے، تو کوئی سرمایہ کاری کے لیے آئے گا نہ اعلیٰ پائے کی خدمات بجالائے گا۔"

اس مرحلے پر طیب اعجاز نے اس مسئلے کے دوسرے پہلو کو اجاگر کرتے ہوئے کہا:

"میں تو ملکی سرمایہ کاری کی بات کر رہا ہوں۔ میں سرمایہ کاری کرنا چاہتا ہوں، مجھے بینک بھی پیسے دینے کو تیار ہے اور میرے پاس سرمایہ کار موجود ہیں، لیکن سب سے کم گیس پنجاب کو مل رہی ہے اور سب سے زیادہ لوڈشیڈنگ بھی یہیں ہو رہی ہے۔ حوصلہ افزا بات یہ ہے کہ دھماکوں کے باوجود پنجاب میں انڈسٹری چل رہی ہے۔ ملک کے اندر جو سرمایہ کاری ہو رہی ہے، اسے تو تحفظ فراہم کرنا چاہیے، لیکن تاحال کوئی پالیسی یا لائحہ عمل سامنے نہیں آیا۔"

جناب پرویز رشید نے چند لمحے توقف کیا اور تازہ ترین معلومات کا انبار لگانا شروع کر دیا:

"اٹھارھویں ترمیم کے مطابق صوبے پہلے اپنی ضرورت پوری کریں گے اور بعد میں دوسرے کو دیں گے۔ ان شاءاللہ مارچ میں یہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔ ۳۱ مارچ ہماری ڈیڈ لائن طے ہے۔ قطر اور ملائیشیا سے بات چیت چل رہی ہے۔ آج ہماری میٹنگ ہوئی جس میں شاہد خاقان عباسی نے وزیراعظم کو بتایا کہ قطر والے کہتے ہیں کہ حکومت سے حکومت کے درمیان ڈیل نہیں ہوگی اور معاہدے پرائیویٹ کمپنیاں کریں گی جو لانگ ٹرم ہوں گے۔ آپ ہم سے دو معاہدے کریں۔ ایک کم مدت والا ہوگا جس میں ہم قیمت مارکیٹ کے مطابق اوپر نیچے کرتے رہیں گے۔ لمبے عرصے والے معاہدے میں قیمت متعین ہوگی۔ شاہد خاقان عباسی کہتے ہیں کہ میں نے پھر ملائیشیا کی کمپنی سے بات کی، تو انھوں نے کہا کہ ہم آپ کو ۲۰۱۶ء سے گیس مارکیٹ ریٹ پر دیں گے۔ بحرین بھی گیس دینے کو تیار ہے۔ خاقان صاحب کہتے ہیں کہ ہم تین چار ملکوں سے معاہدہ کریں گے کہ اگر کسی کی قیمت میں کمی بیشی ہوتی ہے، تو ایک اچھی اوسط نکل آئے گی۔ قطر والے کہتے ہیں کہ ہم جو ریٹ دیں گے وہ باقی تین ممالک سے کم ہوگا، چنانچہ انڈیا کے مقابلے میں زیادہ ہوگا، کیونکہ یہ ریٹ انڈیا کی اپنی کمپنی شیل نے دیا ہے جو وہاں سرمایہ کاری کر رہی ہے۔ بحرین والے ۳۶۰۰ میگاواٹ کا گیس پلانٹ لگانے کے لیے تیار ہیں جسے دو سال میں مکمل کر دیں گے۔ اس کے علاوہ پاکستان میں بہت سارے مقامات پر گیس نکل رہی ہے جو مین پائپ لائن میں نہیں آ رہی۔ اس کا طریقہ یہ نکال رہے ہیں کہ ہم نے بجلی پیدا کرنے والی کمپنیوں کو اجازت دے دی ہے کہ جہاں گیس موجود ہے، وہاں آپ پلانٹ لگائیں اور بجلی پیدا کریں۔ اس وقت کوئی ۳۶ مقامات نشان زد کیے ہوئے ہیں جن سے ہمیں ۲ ہزار میگاواٹ بجلی مل سکتی ہے۔ اس گیس سے فقط پلانٹ چل سکتے ہیں۔ بجلی پیدا کرنے والی کمپنیاں اس میں دلچسپی لے رہی ہیں۔ خاقان صاحب کا خیال تھا کہ ایک سال کے اندر ہمارے ایسے بیشتر پراجیکٹ مکمل ہو جائیں گے، کیونکہ لوگ اپنے نئے پاور پلانٹ لے کر آئیں گے اور کام شروع کر دیں گے۔ ان سے ہمارا معاہدہ یہ ہوگا کہ جب ہمیں

http://www.bookstube.net/

www.pdfbooksfree.pk

Copyrighted material

ضرورت ہوگی، ہم بجلی ان سے خریدیں گے۔ پہلے یہ ہوتا تھا کہ آپ بجلی خریدیں یا نہ خریدیں انھیں پیسے دینا پڑتے تھے۔ ان منصوبوں سے ہماری اوسط قیمت نیچے آجائے گی۔ وزیراعظم کی خواہش ہے کہ ہم اسے سنگل ہندسے میں لے آئیں۔"

ان تفصیلات سے اندازہ ہوا کہ حکومت توانائی کی قلت پر قابو پانے اور قیمتیں کم کرنے کے لیے بڑی منصوبہ بندی اور جانفشانی سے ٹھوس اقدامات کر رہی ہے اور ایک سال بعد اچھے دن آسکتے ہیں۔ طیب اعجاز نے توانائی کے حوالے سے ایک اہم نکتہ اُٹھایا:

"فرنس آئل اتنا سستا ہوگیا ہے کہ میں اپنا پلانٹ لگالوں، تو مجھے ۴ روپے یونٹ پڑتا ہے۔"

"انھوں نے کہا اس نکتے پر آج ہی بات ہوئی ہے۔ وزیراعظم نے کہا کہ جب اللہ تعالیٰ ہم پر مہربان ہوگیا ہے، تو ہمیں بھی اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ پٹرول کی قیمت بھی نیچے آگئی ہے اور عوام کو اس سے کافی ریلیف ملا ہے۔ اس دفعہ افراطِ زر ۶ء۴ کی سطح پر آگیا ہے۔ اگر افراطِ زر گیارہ بارہ فیصد سے ۶ء۴ کی سطح پر آتا ہے، تو اس کا مطلب ہے کہ مہنگائی کم ہوئی ہے۔"

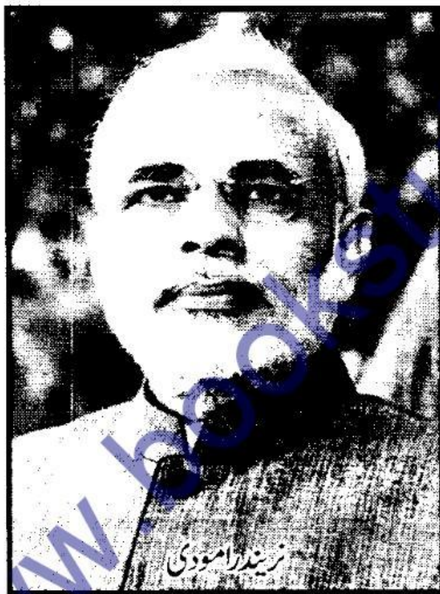
نریندرا مودی

گفتگو کا موضوع بدلنے کے لیے میں نے اس شعبے کے بارے میں سوال کیا جس کے ساتھ جناب پرویز رشید کا بہت گہرا تعلق ہے:

"میڈیا کے ساتھ حکومت کے تعلقات سے کیا آپ مطمئن ہیں یا انہیں مزید بہتر بنانے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں؟"

"الطاف صاحب! بہتری کی گنجائش ہر وقت رہتی ہے، لیکن میں اس لحاظ سے مطمئن ہوں کہ نیشنل ایکشن پروگرام کے سلسلے میں آپ کی جتنی بھی تنظیموں سے ملاقات ہوئی ہے، انھوں نے مکمل تعاون کا یقین دلایا ہے۔ کوئی فرمائش، کوئی جھگڑا اور کوئی مطالبہ نہیں ہوا۔ انھوں نے کہا، یہ ہمیں آپ بتائیں گے، کیا چلانا اور کیا نہیں چلانا ہے، اس پر پورا پورا عمل کریں گے۔ نیشنل ایکشن پلان کے حوالے سے ان کی طرف سے ہمیں مکمل تعاون مل رہا ہے۔"

"پرویز رشید صاحب! یہ تو ایک ہنگامی صورتِ حال ہے۔ عام حالات میں کیا وہ حکومت کو سپورٹ کر رہے ہیں اور کیا آپ میڈیا ڈویلپمنٹ پر سنجیدگی سے کام کرنے کے منصوبے بنا چکے ہیں؟"

"ڈویلپمنٹ کے حوالے سے ہم نے میڈیا سے کہا ہے کہ ہم آپ کے لوگوں کو تربیتی کورسز کرائیں گے۔ اس سے پہلے ہم نے پولیس والوں کی تربیت بھی شروع کردی ہے۔ ہم جدید خطوط پر میڈیا کے لوگوں کو خارجہ پالیسی اور دہشت گردی کے خلاف جنگ سے متعلق کورسز کرانا چاہتے ہیں۔ خاص طور پر ان معاملات میں کہ لائیو کوریج کے دوران ان کا رویہ کیسا ہونا چاہیے۔ نوے کی دہائی کے مقابلے میں میڈیا بہت بڑا ہوگیا ہے اور اب تو وہ میڈیا ہاؤسز کے کنٹرول میں بھی نہیں رہا۔ جس کے منہ میں جو آتا ہے وہ کہہ دیتا ہے۔ شام کو اینکر اپنی مرضی کی باتیں کر جاتا ہے۔ ان تمام باتوں کے باوجود مجھے میڈیا کی طرف سے زیادہ تعاون مل رہا ہے۔

(پڑھیے بقیہ صفحہ نمبر 96 ض)

http://www.booksfree.net
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

دل پہ ہاتھ رکھ کر سوچیے

اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے گھر آئیں تو......

تہذیب مغرب کی چکا چوند سے متاثر
ہم وطنوں کو کچھ سوچنے پر ابھارتا نثر پارہ

عائشہ شاہد

اگر ایک یا دو دن کے لیے
خلافِ توقع نبی کریم ﷺ آپ کے گھر آئیں،
تو آپ کیا کریں گے؟
آپ اپنا بہترین کمرا اتنے معزز مہمان کے
لیے تیار کریں گے
بہترین، عمدہ اور لذیذ پکوان بنائیں گے
اور ان کو یقین دلائیں گے
کہ پیارے نبی ﷺ کی آمد
آپ کے لیے کس قدر
باعث مسرت ہے
حضور اکرم ﷺ کی خدمت ایسی
خوشی ہے
جس کا مقابلہ دنیا کی کوئی اور خوشی نہیں
کر سکتی
لیکن ....
جب نبی محترم ﷺ آپ کے گھر آئیں گے
تو....
آپ جھٹ سے دروازہ کھول کر ان کا والہانہ
استقبال کریں گے
یا....
پہلے اپنا مناسب لباس پہنیں گے
اپنے رسالے، میگزین سنبھالیں گے
قرآن کو طاق میں سجائیں گے
اپنا ٹی وی سیٹ بند کریں گے کہ
کہیں آلات موسیقی کی آواز نبی کریم ﷺ کی سمع
خراشی کا سبب نہ بنے
کیا آپ ان دو دنوں میں اپنی وہی سرگرمیاں جاری
رکھیں گے
جو آپ کا معمول ہیں

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

کیا آپ کی باہمی گفتگو
ان دو دنوں میں وہی رہے گی
جو روزمرہ ایام میں ہوتی ہے
کیا آپ تمام نمازیں وقت پر ادا کریں گے؟
کیا آپ کے زیرِ مطالعہ وہی مواد رہے گا؟
کیا آپ یہ خواہش کریں گے کہ
نبی کریم ﷺ کا قیام دو دنوں سے بڑھ جائے
یا پھر......
آپ انتظار کریں گے
کہ وہ جائیں
اور آپ اپنی سرگرمیاں، مشاغل اور دلچسپیاں دوبارہ جاری رکھیں
ذرا سوچیے......
اگر نبی کریم ﷺ ایک یا دو دنوں کے لیے
آپ کے گھر آئیں تو......

☆☆

ایک نومسلم انگریز شاعرہ کی یہ نظم نظر سے گزری تو دل اضطراب کا شکار ہوگیا۔ یہ سوال بڑا اہم ہے کہ عشق رسول ﷺ کے دعویدار اپنی محبت کا ثبوت کیسے دیں؟ حب رسول ﷺ کا پہلا تقاضا تو یقیناً ذکر رسول ﷺ ہی ہے جیسا کہ سورہ احزاب میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''ترجمہ: بے شک اللہ اور اس کے فرشتے نبی ﷺ پر سلام بھیجتے ہیں۔ اے ایمان والو! تم بھی ان پر کثرت سے درود و سلام بھیجا کرو۔''

ذکر رسول ﷺ عین عبادت اور عظیم سعادت ہے۔ یقیناً محسن انسانیت کی ذات اس اعزاز کی مستحق ہے کہ آپ ﷺ پر کثرت سے درود و سلام بھیجا جائے۔

ذکر رسول ﷺ کے ساتھ ساتھ آج اس امر کی بھی ضرورت ہے کہ فکرِ رسول ﷺ کو عام اور اس پر عمل پیرا ہوا جائے۔ حضرت محمد ﷺ سے محبت مجرد ثواب کے لیے ہونا کامیابی کی دلیل نہیں۔ نبی کریم ﷺ نے رہبانیت اختیار نہیں کی۔ محض چند افراد کو لے کر ایک گوشے میں بیٹھ کر اچھی اچھی باتیں کرتے ہوئے زندگی نہیں گزاری بلکہ زندگی کی تمام کٹھنائیاں، تلخیاں، مشکلات اور آزمائشیں صبر و استقلال کے ساتھ برداشت کر ہر طبقۂ انسانی کے لیے راہنمائی کا فریضہ انجام دیا۔

حضرت محمد ﷺ کی حیاتِ مبارکہ عملِ پیہم کی شرح ہے۔ کوئی انسانی روداد نہیں انسان ساز کی کہانی ہے۔ مگر ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہم ذکر رسول ﷺ تو کسی نہ کسی طرح کر لیتے ہیں، مگر فکرِ رسول ﷺ مکمل طور پر نظرانداز کر چکے۔ محبت رسول ﷺ کا دعویٰ تو کیا، مگر اپنے اعمال کو ان کے اسوۂ حسنہ کے مطابق نہیں ڈھالا۔

آج ہماری کتاب عمل پر سیرت النبی ﷺ کا شائبہ تک نہیں۔ ہم اسوۂ حسنہ کو چھوڑ کر دیگر دنیاوی نظام ہائے حیات کے آگے ہاتھ پھیلا رہے ہیں۔ ہم ذہنی لحاظ سے مفلس اور معاشی طور پر مفلوک الحال ہو چکے۔ علمی و ثقافتی زندگی میں دوسروں کے کاسہ لیس ہیں۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ اگر ہم واقعی محبت رسول ﷺ کے دعویدار ہیں، تو تہذیب حاضر کی مرعوبیت کا چولا اتار پھینکیں اور آپ ﷺ کی سیرت کو اوراق سے نکال کر عملی زندگی میں لے آئیں۔

ورنہ ذرا سوچیے، ہماری خجالت اور شرمندگی کا کیا عالم ہوگا اگر......

محمد ﷺ ہمارے گھر تشریف لائیں تو......

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

ہے کوئی جواب؟

ان مذہبی سوالات کے جوابات آج تک قادیانی فرقے کا کوئی خلیفہ اور اعلیٰ عہدیدار نہیں دے سکا

حبیب اشرف صبوحی

۲ / جون 1924ء کو چکوال کے ایک گاؤں میانی، تحصیل کلر کہار میں ایک ہندو پنڈت کے گھرانے میں ایک بچہ بڑے جتن اور دعاؤں سے پیدا ہوا۔ اس کے پیدا ہونے سے پورے خاندان میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اس سے قبل گھرانے میں کوئی بچہ موجود نہیں تھا۔ ایک پنڈت کی ہدایت پر بچے کا نام کرشن لال رکھا گیا تا کہ وہ ہری کرشن مہاراج (جو اپنے وقت کے اوتار تھے) کی طرح طبعی عمر پائے اور اس کے نقش قدم پر چلے۔

بچہ جب چودہ برس کا تھا، تو حضور اکرم ﷺ نے عالم رؤیا میں اس بچے کو مشرف بہ اسلام فرمایا۔ چناں چہ بچہ غازی احمد کے نام سے مشہور ہوا۔ انھوں نے اسلام قبول کرنے کے بعد بے شمار تکلیفیں اور اذیتیں برداشت کیں۔ وہ ثابت قدمی کا ثبوت دیتے ہوئے دینی اور دنیاوی تعلیمات حاصل کرتے رہے اور گورنمنٹ کالج بوچھال کلاں کے پرنسپل کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔

آپ نے تین ایم اے، اور وہ بھی گولڈ میڈل کے ساتھ کیے۔ اس کے علاوہ درس نظامی، فاضل فارسی، ایم۔او۔ایل، بی ایڈ اور ایل ایل بی کی ڈگریاں

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

اعزازات کے ساتھ حاصل کیں۔ انھوں نے اپنے قبول اسلام کی داستان ایک کتاب ''من الظلمات الی النور'' (کفر کے اندھیروں سے نورِ اسلام تک) کے نام سے تحریر کی جس کے کئی زبانوں میں ترجمے ہو چکے۔ مجھے یہ شرف حاصل ہے کہ میں نے ان سے دو مرتبہ ملاقات کی۔ مندرجہ ذیل اقتباس ان کی درج بالا کتاب کے حوالے سے ضبطِ قلم کر رہا ہوں۔

☆☆

آج سے کئی سال قبل پنجاب یونیورسٹی لاہور نے بی۔ اے کے امتحانات کے سلسلے میں مجھے تعلیم الاسلام کالج، ربوہ میں ناظم امتحانات مقرر کر دیا۔ بیس پچیس دن ربوہ کالج میں میرا قیام رہا۔ ایک اتوار چھٹی کے دن میں نے قادیانی جماعت کے امیر، مرزا ناصر احمد سے ملاقات کا پروگرام بنایا۔ میں دفتر گیا اور ملاقاتیوں کی فہرست میں اپنا نام درج کرایا۔

میرا تیسواں نمبر تھا۔ میں نے ناظم ملاقات سے کہا، اگر ممکن ہو تو جلد ملاقات کرا دیں، مجھے امتحان کے سلسلے میں کام کرنا ہے۔ انھوں نے میرے متعلق مرزا صاحب کو فون پر بتایا۔ ناصر صاحب نے کہا کہ ان کا نام دوسرے نمبر پر درج کر دیں۔ پہلے نمبر پر ڈاکٹر عبدالسلام تھے۔ پہلی ملاقات شروع ہوئی، تو دونوں حضرات نصف گھنٹے تک محوِ گفتگو رہے۔

ڈاکٹر صاحب کے بعد میری باری آئی۔ ناصر صاحب دوسری منزل پر فروکش تھے۔ میں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچا۔ ناصر صاحب نے دروازے میں آ کر استقبال کیا۔ علیک سلیک کے بعد گفتگو کا آغاز ہوا۔

ناصر صاحب نے کہا ''مجھے پتا چلا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے عالم رؤیا میں آپ کو اسلام سے مشرف فرمایا۔''

صاحبِ مضمون

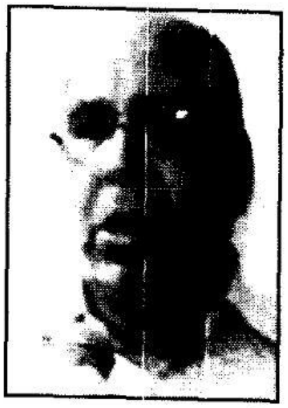

۶۵ سالہ حبیب اشرف صبوحی اردو کے صاحبِ طرز ادیب، اشرف صبوحی کے فرزند ہیں۔ لکھنے پڑھنے سے دلچسپی وراثت میں ملی۔ تاہم نوجوانی میں ملازمت نے قلم اٹھانے کی فرصت نہ دی۔ اب سبکدوشی کے بعد مختلف موضوعات پر خوب لکھ رہے ہیں۔ اخلاقیات، روحانیت اور اسلامیات آپ کے محبوب موضوعات ہیں۔ تحریر میں دلچسپی، روانی اور معلومات بدرجہ اتم موجود ہوتی ہیں۔ اردو ڈائجسٹ کو باقاعدگی سے اپنی تخلیقات نوازتے ہیں۔

''جی ہاں! آپ کی معلومات بالکل درست ہیں۔ میں نے خواب میں نبی کریم ﷺ کے دستِ مبارک پر اسلام قبول کیا۔'' میں نے جواب دیا۔

ناصر صاحب نے مسرت کا اظہار فرمایا اور کہا ''واقعی آپ بڑے خوش قسمت انسان ہیں۔ میں کہوں گا کہ آپ تو اسلام کی صداقت کی دلیل ہیں۔'' وہ پھر میرے قبولِ اسلام کی تفصیلات دریافت کرتے رہے اور میں جواب دیتا رہا۔

تقریباً نصف گھنٹا اسی گفتگو میں گزر گیا۔ میں نے کہا کہ جناب کافی وقت گزر گیا، نیچے بہت سے ملاقاتی آپ کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ میں رخصت چاہتا ہوں۔ البتہ اگر آپ مناسب خیال کریں اور گستاخی نہ سمجھیں تو طالب علم کی حیثیت سے ایک سوال دریافت

http://www.bookstube.net/

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

کرنا چاہتا ہوں۔ ناصر صاحب نے خوش دلی سے اجازت دے دی۔

میں گویا ہوا "جناب کو بھی معلوم ہے، نبی کریم ﷺ نے مجھے مشرف بہ اسلام فرمایا اور بہ مصداق حدیث (جس نے مجھے خواب میں دیکھا اس نے مجھے ہی دیکھا) میرا ایمان ہے، میں نے جناب رسول کریم ﷺ کی ذاتِ گرامی ہی سے دین اخذ کیا۔ میرا یہ بھی ایمان ہے کہ جو عقیدہ اور مسلک میں نے اپنایا وہ آنحضرت ﷺ کی رضائے عالیہ کے مطابق ہے۔

"آپ حضرات بھی سلسلہ نبوت رکھتے ہیں۔ اگر آپ کا سلسلہ اللہ تعالیٰ کے ہاں درست ہوتا تو نبی کریم ﷺ مجھے اسلام سے مشرف فرمانے کے بعد ہدایت فرما دیتے کہ اب تم مسلمان تو ہو چکے، تکمیل دین کے لیے قادیان چلے جاؤ۔

"بحیثیت نبی آپ ﷺ کے لیے ضروری تھا کہ مرزا صاحب کی نبوت کو نظر انداز نہ فرماتے۔ مگر حضور اکرم ﷺ نے مرزا صاحب کی نبوت کو قطعاً نظر انداز فرمایا۔ اس کے معنی ہیں کہ مرزا غلام احمد کا سلسلہ نبوت عنداللہ و عندرسول ﷺ درست نہیں بلکہ یہ، نبوتِ کاذبہ کے زمرے میں آتا ہے۔"

جناب ناصر صاحب نے سوال سن کر فرمایا "یہ سوال میری زندگی میں پہلی بار پیش کیا گیا۔ آپ کے سوال کی معقولیت میں شک نہیں مگر ملاقاتی کافی بیٹھے ہیں۔ پھر کسی ملاقات میں اس کا جواب دوں گا۔"

میں نے عرض کیا کہ مجھے ایک بات اور دریافت کرنا ہے۔ میں نے مرزا صاحب کی ایک تحریر پڑھی ہے، اس میں وہ لکھتے ہیں: "میں اور میری جماعت کے افراد فقہی مسلک میں امام ابوحنیفہؒ کے پیروکار ہیں۔ ناصر صاحب میں بھی حنفی مسلک سے تعلق رکھتا ہوں۔"

یہ سن کر ناصر صاحب نے اظہارِ مسرت فرمایا۔

میں نے مزید عرض "آپ بھی سمجھتے ہیں کہ مرزا غلام احمد منصب نبوت پر فائز تھے۔ لیکن تب کیا یہ امر منصب نبوت کے شایانِ شان ہے، کہ ایک نبی امتی کے فقہی مسلک کا پیروکار اور مقلد ہو جائے؟ کیا یہ مقام نبوت کی توہین نہیں؟"

ناصر صاحب نے فرمایا "اس سوال کا جواب بھی کسی دوسری مجلس میں تفصیل کے ساتھ دوں گا۔ آپ اپنا پتا میری سیکرٹری کو دے دیں۔ آپ کو دونوں سوالات کے جوابات مل جائیں گے۔"

میں نے پھر ناصر صاحب سے اجازت طلب کی۔ انھوں نے خندہ پیشانی سے مجھے رخصت کیا۔ لیکن جب میں سیڑھیاں اتر رہا تھا تو ختم نبوت پر میرے ایمان و ایقان میں اضافہ ہو چکا تھا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ واقعی حضرت محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے آخری نبی ہیں اور آپ ﷺ کا لایا ہوا دین کامل، مکمل اور اکمل ہے۔ اب کسی نئے تکمیل کنندہ کی قطعاً نہ کوئی ضرورت ہے اور نہ گنجائش۔ آپ ﷺ کے بعد جو شخص بھی نبوت کا دعویٰ کرے گا، تو اس کی نبوت کاذبہ ہو گی۔ میرے سوالات کے جوابات آج تک قادیانی فرقے کا کوئی خلیفہ اور عہدیدار نہیں دے سکا۔"

☆☆☆

یہ یاد رہے کہ پروفیسر غازی احمد ۲۵/اگست ۲۰۱۰ء کو اپنے رب کے حضور پہنچ گئے۔ انھوں نے تقریباً چالیس سال قبل مرزا ناصر سے ملاقات کی تھی جو خود بھی عالم بالا پہنچ چکے۔ مگر اس دوران کوئی قادیانی غازی صاحب مرحوم کے سوالوں کا جواب نہیں دے سکا۔ ◆◆◆

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

کون ہے سب سے بدنصیب مسلمان

اُمت کا مفلس

ایک مسلم کو جنت کا حقدار بنا دینے والی روح پرور نصیحتیں

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

عربی زبان میں ''فلس'' نقدی اور روپے پیسے کو کہتے ہیں۔ یہ صیغہ جب افلاس کے معنی میں ہو تو مطلب ہوتا ہے: پیسا وغیرہ چھن جانا، کنگال ہو جانا۔ مفلس وہ ہے جس سے روپیہ پیسا سب ہو جائے، چھن جائے جو دیوالیہ ہو جائے۔

ایک بار حضور ﷺ نے صحابہ کرامؓ سے سوال فرمایا: اتدرون ماالمفلس ؟ (کیا آپ جانتے ہیں کہ مفلس کون ہے؟)

قالوا: المفلس فینا من لادرھم لہ ولامتاع۔ (صحابہ نے عرض کیا: ہم اسے مفلس سمجھتے ہیں جس کے پاس کوئی مال اور دنیاوی چیز نہ رہے)

اس پر رحمت العالمین ﷺ نے فرمایا: ان المفلس من امتی من یاتی یوم القیامۃ بصلاۃ و صیام و زکاۃ۔ (میری امت کا مفلس وہ ہوگا جو ڈھیر ساری نمازیں، روزے اور زکوٰۃ کے اعمال لے کر اللہ کے ہاں پیش ہوگا۔)

ویاتی وقدشتم ھذا، وقذف ھذا، و اکل مال ھذا، وسفک دم ھذا و ضرب ھذا۔ (مگر وہ اس حال میں آئے گا کہ کسی کو اس نے دنیا میں گالی دی ہوگی، کسی پر جھوٹا الزام لگایا ہوگا، کسی کا مال کھایا ہوگا، کسی کا خون بہایا ہوگا، کسی کو مارا پیٹا ہوگا۔)

فیعطی ھذا من حسناتہ و ھذا من حسناتہ۔ (تو پھر کسی کو اس کی نیکیوں میں سے بدلہ دیا جائے گا اور کسی کو اس کی نیکیاں دے دی جائیں گی۔)

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

فان قنيت حسناته قبل ان يقضى ما عليه، اخذ من خطايا هم فطرحت عليه ثم طرح في النار۔

(اگر مظلوم حقداروں کے حق پورے ادا ہونے سے پہلے، ظالم کی نیکیاں ختم ہو جائیں گی، تو مظلوموں کے گناہ، ظالم پر ڈال دیے جائیں گے اور بالآخر ظالم (بظاہر نیکوکار) کو جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔" (روایت مسلم، باب تحریم الظلم، کتاب البر والصلة و الاداب)

اس حدیث رسول ﷺ کو دیکھ کر انتہائی خوف لاحق ہوتا ہے کہ دنیا میں کیے ہوئے بہت سارے نیک اعمال خطرے میں پڑ سکتے ہیں اور آدمی جنت کی امیدوں پر عمل کر کے خدانخواستہ جہنم رسید ہو سکتا ہے۔ لہٰذا حقوق اللہ اور حقوق العباد، دونوں کو ساتھ ساتھ ادا کرنا ضروری ہے۔ صرف حقوق اللہ ادا کرنے والا بھی نجات نہیں پائے گا اور صرف حقوق العباد کا لحاظ کرنے والے کو بھی فلاح آخروی نہیں ملے گا...... دونوں باہم لازم وملزوم ہیں۔

آج مسلم امت کے یہ دو واضح گروہ نظر نہیں آتے ہیں۔ الا ماشاء اللہ ایک اپنی عبادات پر مغرور اور دوسرا ترک عبادات کر کے صرف حقوق انسانی کی بات کرنے والا۔ دین اسلام کا دیگر تمام مذاہب عالم سے یہی طرۂ امتیاز تو ہے کہ یہ دین بندوں کو دنیا اور آخرت یعنی دونوں جہانوں کی بھلائیاں نصیب کرتا ہے۔

آپ ﷺ کے استفسار پر صحابہ کرامؓ نے وہی جواب دیا جو معاشرے میں معروف تھا کہ مفلس وہ ہے جو متاع دنیوی سے محروم ہو۔ مگر آپ ﷺ نے اصلاح فرماتے ہوئے بتایا کہ میری امت کا مفلس وہ ہے جو قیامت کے روز متاعِ عمل اور نیکیوں کا خزانہ لیے ہوئے کنگال ہو گیا اور وہاں لٹ گیا۔ اس کے پلے کچھ نہ رہا، جبکہ لے کے بہت کچھ گیا تھا۔ ایسے دیوالیے ہم دنیا میں بھی دیکھتے ہیں کہ قسمت کا پھیر مالداروں کے پانسے پلٹ دیتا ہے۔

جو دنیاوی معاشرے میں سرمائے کے زور پر محترم ہوا، کبھی سب کچھ گنوا کر بے وقار ہوا۔ کل جس افسر کو لوگ سیلوٹ مارتے تھے، آج پولیس اس کے وارنٹ گرفتاری لیے اسے تلاش کر رہی ہے۔ کل کا سرمایہ دار آج ذلت سے بچنے کے لیے روپوش ہے، کوئی اسے پناہ دینے کو تیار نہیں، اس سے بھی برا حال اس شخص کا ہوگا جو حشر میں دیوالیہ ہو گیا۔

دنیا میں دیوالیہ ہونے والا ممکن ہے، پھر کبھی سنبھل جائے، کیونکہ دولت دنیا ڈھلتی چھاؤں ہے۔ آج کسی کے پاس، کل کسی اور کے پاس۔ لیکن آخرت کا دیوالیہ ممکن نہیں کہ سنبھلنے کا موقع پا سکے۔

حضور ﷺ نے عبادات میں نماز، روزہ اور زکوٰۃ کا ذکر فرمایا جو فرائض شریعت ہیں۔ حشر میں خاص طور پر حقوق انسانی میں گالم گلوچ، بہتان تراشی، ڈاکا، چوری، قتل ناحق اور مار پیٹ جیسے جرائم کا ذکر فرمایا۔ یہ جرائم کیسے، عبادات کو کھا جائیں گے؟ وہ یوں کہ اس نیک نے خدا کا خیال رکھا، مگر خلق خدا کا خیال رکھنا گوارا نہیں کیا۔

نیکیوں کے ساتھ ساتھ ضروری ہے کہ ان کی حفاظت کی جائے۔ کبھی عبادت کو ریاکاری بھسم کرتی کبھی غیبت اسے ملیا میٹ کر دیتی ہے۔ خلق خدا کو ایذا رسانی دینے سے عبادات پر پانی پھر جاتا ہے۔ حشر میں اعمال کے علاوہ مال تو پلے ہوگا نہیں، کہ رشوت دے کر چھوٹ سکیں۔ وہاں عدالت خداوندی میں ذرے ذرے کا حساب عدل کی بنیاد پر چکایا جائے گا۔

نواب صدیق حسنؒ فرماتے ہیں: دنیاوی مفلس کا افلاس مرنے پر ختم ہو جاتا ہے۔ مگر حشر کے میدان میں مفلسی الھلاک التام (پوری بربادی) ہے، وہاں اسے کوئی موقع نہیں ملے گا۔

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

تاریخ اسلام کا چشم کشا واقعہ

حضرت عمر فاروقؓ اور ایک ناراض شوہر

خلیفہ راشد دوم کے صائب مشوروں نے جب ایک بدو کی بگڑی ازدواجی زندگی سنوار دی

مولانا محمد عدیل باسط زید

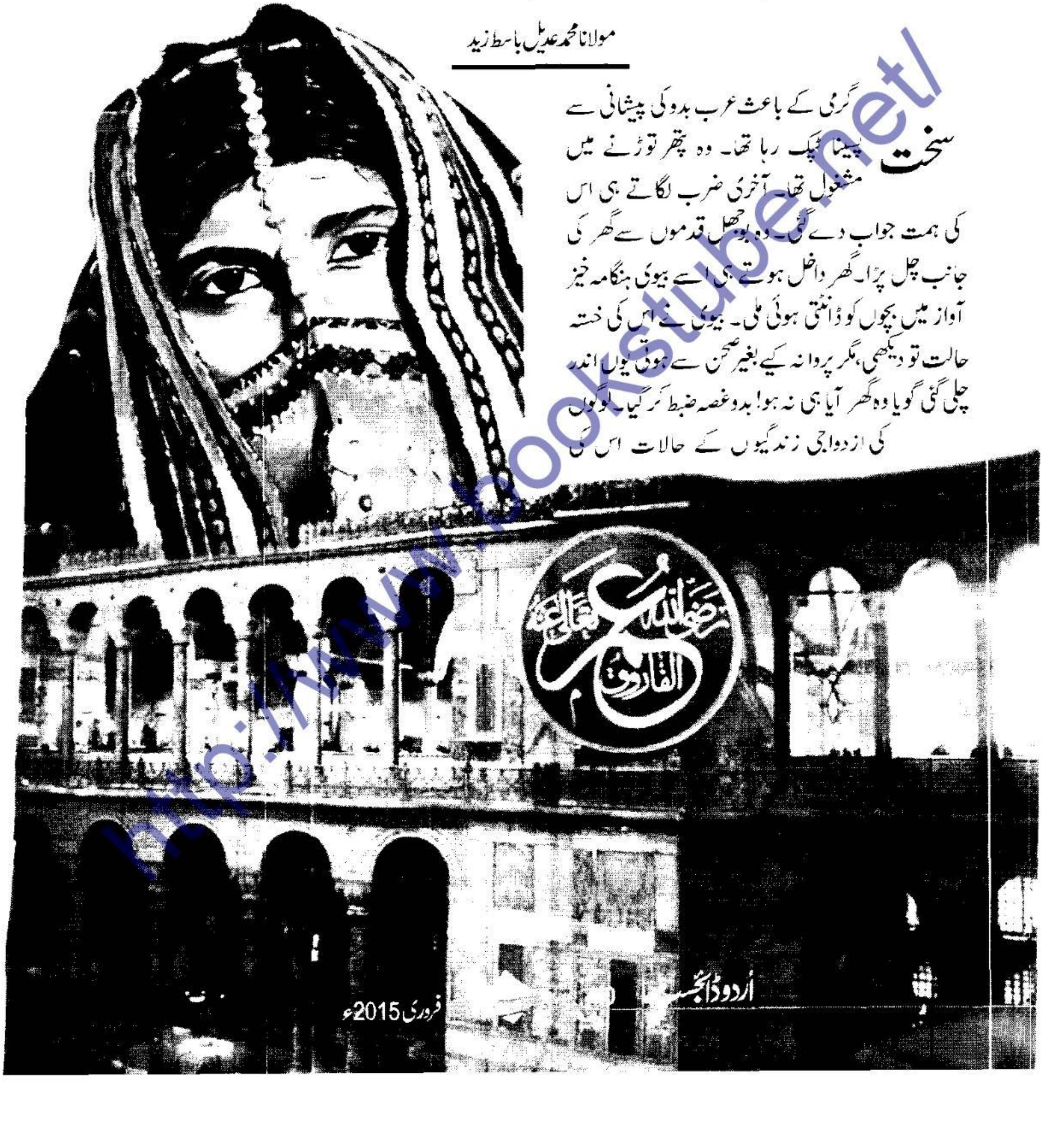

سخت گرمی کے باعث عرب بدو کی پیشانی سے پسینا ٹپک رہا تھا۔ وہ پتھر توڑنے میں مشغول تھا۔ آخری ضرب لگاتے ہی اس کی ہمت جواب دے گئی۔ وہ بوجھل قدموں سے گھر کی جانب چل پڑا۔ گھر داخل ہوتے ہی اسے بیوی ہنگامہ خیز آواز میں بچوں کو ڈانٹتی ہوئی ملی۔ بیوی نے اس کی خستہ حالت تو دیکھی، مگر پروانہ کیے بغیر صحن سے ہوتی ہوئی یوں اندر چلی گئی گویا وہ گھر آیا ہی نہ ہو! بدو غصہ ضبط کر گیا۔ لوگوں کی ازدواجی زندگیوں کے حالات اس کی

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk

نگاہوں کے سامنے گھوم کر رہ گئے۔

ام المومنین حضرت سودہؓ بنت زمعہ کے شوہر، سکران بن عمرو انتقال فرما گئے۔ اس کے بعد وہ اپنے مشرک باپ کی سختیوں کے سامنے بکھر کر رہ گئیں۔ اللہ تعالیٰ کے سوا ان کا کوئی سہارا اور کفالت کرنے والا نہ رہا۔ تب نبی کریم ﷺ نے ان کے حال پر رحم فرمایا۔ بوڑھی ہونے کے باوجود انھیں رشتۂ ازدواج میں منسلک فرمالیا تاکہ ان کی یتیم بیٹیوں کی پرورش فرما سکیں۔ اس بدو کے ذہن میں یہ تمام واقعہ گھوم گیا۔

وہ پھر خود کلامی کرنے لگا: ام المومنینؓ بوڑھی تھیں، مگر آپ ﷺ نے انھیں قبول فرمایا، میں بھی اپنی بیوی کو اس کی سختی کے باوجود برداشت کروں گا، شاید اس کے اخلاق بہتر ہو جائیں۔

وہ پھر کمرے میں جا کر بیوی سے بات چیت کرنے لگا۔ بیوی فوراً اپنے حقوق کا مطالبہ کرنے لگی۔ وہ سمجھ گیا کہ ایسی خاتون سے نباہ کرنا اس کے بس سے باہر ہے۔ پھر بیوی کی آواز بلند ہوتی چلی گئی۔ وہ اور پریشان ہو گیا اور اس کی بداخلاقی پر تلملا کر بولا: ''کیا تو نے حضور ﷺ کا فرمان نہیں سنا؟''

بیوی: ''اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ نے سچ فرمایا ہے مگر......''

شوہر: مگر کیا؟ کیا آپ ﷺ نے نہیں فرمایا، اگر میں کسی کو حکم دیتا کہ وہ کسی انسان کو سجدہ کرے، تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے۔ کیونکہ خاوند کا اس پر بہت بڑا حق ہے۔

بیوی: تمھیں کس حق کا دعویٰ ہے؟ اگر تم محنت کرتے ہو، تو میں بھی محنت کرتی ہوں اور یہ بچے......

شوہر: (بات کاٹتے ہوئے) کیا بگاڑ دیا انھوں نے تمھارا؟

بیوی: ان کے شور و شغب اور مطالبات نے مجھے بے حال کر ڈالا ہے۔

شوہر: تم انھیں آداب سکھاؤ، اور ان کے لیے حسنِ سیرت کا نمونہ بن جاؤ۔

بیوی: تم خود ان کے لیے بھلائی کا نمونہ کیوں نہیں بن جاتے؟

شوہر: تم پر بھلائی کی کوئی بات اثر نہیں کرتی۔

بیوی: تم اپنی نصیحتیں اپنے پاس ہی رکھو۔ میں پہلے ہی تمھاری نصیحتوں سے تنگ آئی بیٹھی ہوں۔

شوہر: اللہ کی قسم، میں امیر المومنین کے پاس تمھاری شکایت کروں گا۔

وہ بدو اپنے حال سے تنگ آ کر گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ جونہی اس نے امیر المومنین حضرت عمرؓ کا دروازہ کھٹکھٹایا، ایک خاتون کو بلند آواز میں کہتے سنا: اللہ تعالیٰ نے تمھیں جو کام سونپے ہیں، انھیں انجام دینے میں اللہ سے ڈرو اے عمر!''

بدو واپس لوٹنے کا ارادہ کرتے ہوئے خود سے بولا، جب امیر المومنین کا یہ حال ہے، تو آج کے بعد میں اس صورتِ حال کی ہرگز پروا نہیں کروں گا۔ اسی وقت حضرت عمرؓ باہر تشریف لے آئے۔ ایک بدو کو اپنے در سے واپس جاتے دیکھا تو پکار اٹھے:

حضرت عمرؓ: اے مسلمان بھائی تمھیں کیا کام ہے؟

بدو: مجھے میرے سوال کا جواب مل گیا ہے۔

حضرت عمرؓ اپنی فراست سے اس کی پریشانی جانچ گئے۔ لمحہ بھر اسے دیکھ کر فرمایا: میں تمھیں قسم دیتا ہوں کہ تم اپنی بات بیان کرو۔''

بدو: اے امیر المومنین! میں آپ کے پاس اپنی بیوی کے برے اخلاق کی شکایت لیے، آیا تھا، جس کا میں مدت

http://www.bookstube.net
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

سے شکار ہوں۔ لیکن آپ کے ساتھ بھی وہی معاملہ دیکھ کر شکایت سے بے نیاز ہو گیا۔ میں نے سوچا کہ آپؓ پر تو یہ معاملہ مجھ سے زیادہ گراں گزرتا ہو گا (کہ آپ امیر المومنین ہیں اور میں ایک عام آدمی)۔ پس یہ سوچ کر واپس لوٹنے کا ارادہ کر لیا کہ جب حاکمِ وقت کا یہ حال ہے، تو میں بھی تقسیمِ الٰہی پر راضی رہوں گا۔

یہ سن کر حضرت عمرؓ مسکرا اٹھے اور فرمایا: ''اے مسلمان بھائی! میں اپنی بیوی کی باتیں اس لیے برداشت کر لیتا ہوں کہ ان کے مجھ پر بہت سے حقوق و احسانات ہیں۔ وہ میرے لیے کھانا بناتی، روٹیاں پکاتی، بچوں کو دودھ پلاتی اور کپڑے دھوتی ہے۔ میں جتنا ان کی باتوں کو برداشت کروں گا، اتنا ہی مجھے ثواب ملے گا۔''

بدو...... اے عمرؓ! اپنے گھر والوں سے میل جول میں آپؓ کتنے نرم دل ہیں اور معاملاتِ حکومت میں کتنے سخت۔

کیا اللہ تعالیٰ نے نہیں فرمایا: اور جس نے صبر کیا اور معاف کر دیا، تو بے شک یہ بڑی باتوں میں سے ہے۔

حضرت عمرؓ: میں تو صرف ان امور میں سختی کرتا ہوں جو عامۃ المسلمین کے حقوق سے متعلق ہیں اور وہ بھی اس وقت جب راہِ حق سے کسی کو دور ہوتا یا ہٹتا ہوا دیکھوں، یا جب کوئی واجبات کی ادائیگی میں تاخیر کرے۔

بدو: اور جو کام آپ کی ذات سے متعلق ہیں، ان میں؟

حضرت عمرؓ: ان امور میں عفو و درگزر کا معاملہ کرتا ہوں۔ کیا اللہ تعالیٰ نے نہیں فرمایا: اور جس نے صبر کیا اور معاف کر دیا، تو بے شک یہ بڑی باتوں میں سے ہے۔ کیا ہمیں اسلام نے یہ نہیں سکھایا کہ ہم پر بیویوں کے بڑے حقوق ہیں اور وہ ہمارے پاس امانت ہیں۔ اور جو شخص امانت کا پاس نہ رکھے، اس کا ایمان ناقص ہے۔ کیا ایمان والے آپس میں محبت اور شفقت کے لحاظ سے ایک وجود کے مانند نہیں کہ جب اس کے ایک عضو کو تکلیف پہنچتی ہے، تو پورا وجود درد محسوس کرتا ہے۔ تو پھر تمھیں کیا ہو گیا ہے اے شخص کہ تم قرآن کریم کے بیان کردہ اخلاق سے خود کو مزین نہیں کرتے؟

بدو: اے امیر المومنین! اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے، لیکن میری بیوی تو بچوں کا بوجھ اٹھانے کو بھی تیار نہیں۔

حضرت عمرؓ: کیا تم اپنے بیوی بچوں کے ساتھ پیار محبت اور خوش طبعی سے کچھ وقت گزارتے ہو؟

بدو: میں دن بھر کا تھکا ہارا شام کو گھر لوٹتا ہوں۔ مجھ میں اتنی ہمت و سکت ہی نہیں ہوتی کہ ان کے ساتھ خوش طبعی کر سکوں۔

حضرت عمرؓ: اور تم بچوں کو اس حال میں چھوڑ کر جاتے ہو کہ تمھاری موجودگی میں (ڈر کی وجہ سے) وہ جو خود کو بڑی مشکل سے دبائے بیٹھے ہوتے ہیں، تمھارے جاتے ہی اپنی ماں پر چڑھ دوڑتے ہیں۔ (اس پر سارا غبار نکالتے اور اسے ستاتے ہیں) کیا ایسا نہیں ہے؟

بدو: خاموش رہتا ہے۔

حضرت عمرؓ: اسی وجہ سے تمھاری بیوی تم سے بیزار رہتی ہے۔

بدو: کیا آپ اپنے بچوں کے ساتھ نرمی و محبت کا معاملہ فرماتے ہیں، اے امیر المومنینؓ!

حضرت عمرؓ: جی ہاں! اور حضور اکرم ﷺ بھی اپنے بچوں، حسنؓ و حسینؓ کے ساتھ کھیلا کرتے تھے۔ وہ حضور ﷺ کی پشت پر سوار ہو جاتے اور آپ ﷺ انھیں

http://www.bookstube.net/

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

اٹھا کر یہ فرماتے ہوئے چلنے لگتے: تمھاری سواری بہترین سواری ہے اور تم بہترین سوار ہو۔

بدو: (حیرت زدہ ہو کر) کیا واقعی ایسا ہے؟

حضرت عمرؓ: میں نے کل کچھ کام ایک آدمی کے سپرد کرنے کے لیے اسے بلایا۔ جب وہ میرے پاس آیا، تو اس نے مجھے بچوں کے ساتھ کھیلتے دیکھا۔ یہ بات اسے پسند نہ آئی۔ تب میں نے وہ کام اس کے ذمے نہیں لگایا کیونکہ وہ سخت طبیعت والا اور خشک مزاج آدمی تھا۔ بچوں کے بارے میں اس کی غلط سوچ تھی، تو وہ قوم پر کتنا ظلم اور سختی کرتا!

بدو: آپؓ نے سچ فرمایا ہے اے امیر المومنین!

حضرت عمرؓ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: تم میں سے بہترین وہ ہے جو اپنے اہل و عیال کے ساتھ (برتاؤ کرنے میں) بہتر ہو اور میں اپنے اہل و عیال کے ساتھ (برتاؤ کرنے میں) تم سب سے بہتر ہوں۔

بدو: آج آپؓ نے مجھے ایسا سبق دیا جسے میں کبھی نہیں بھولوں گا۔ اب میں ان شاء اللہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ پیار و محبت سے رہوں گا۔

حضرت عمرؓ: پھر تمھاری بیوی بھی تمھارے ساتھ (برتاؤ کرنے میں) ویسے ہی ہو جائے گی جیسے ام حبیبہؓ حضور ﷺ کے ساتھ (برتاؤ کرتی) تھیں۔

بدو: وہ کیسا برتاؤ کرتی تھیں؟

حضرت عمرؓ: ایک دن ام المومنین کا باپ ان کے پاس آیا اور حضور اکرم ﷺ کے بستر مبارک پر بیٹھ گیا۔ انھوں نے اپنے باپ کو آپ ﷺ کے بستر مبارک پر بیٹھنے سے منع فرمایا اور بستر لپیٹ دیا۔

بدو: اپنے باپ کے سامنے سے بستر لپیٹ دیا؟

حضرت عمرؓ: ہاں!

بدو: تو ان کے باپ نے کیا کہا؟

حضرت عمرؓ: اس نے کہا: بستر میرے مقام و مرتبے کے لائق نہیں یا میں اس بستر کا اہل نہیں؟

بدو: ام المومنین نے کیا جواب دیا؟

حضرت عمرؓ: انھوں نے فرمایا: شرک نے تمھارے اور میرے شوہر حضور اکرم ﷺ کے مرتبوں کے درمیان (بہت بڑا) فرق ڈال رکھا ہے۔ تم مشرک و نجس ہو اور میرے شوہر پاکیزہ نبی ﷺ ہیں۔

بدو: واقعی؟ پھر ان کے باپ نے کیا کہا؟

حضرت عمرؓ: ان کے باپ نے کہا، اے میری پیاری بیٹی! اللہ کی قسم مجھ سے الگ ہو کر بڑے شر میں مبتلا ہو گئی ہو۔ انھوں نے جواب دیا: نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اسلام کی طرف ہدایت دی ہے۔ پھر وہ فرمانے لگیں: تعجب تو تم پر ہے میرے باپ: تم قریش کے سردار ہو اور ان کے بڑے لیکن تمھاری حالت یہ ہے کہ تم ایسے پتھروں کو پوجتے ہو جو نہ سنتے ہیں نہ دیکھتے۔

بدو: اس نے کیا جواب دیا؟

حضرت عمرؓ: اس نے کہا: میں اپنے آباؤ اجداد کے دین کو ہرگز نہیں چھوڑوں گا۔

بدو: وہ واقعتاً کامل ایمان والی تھیں۔

حضرت عمرؓ: اور رسول اللہ ﷺ کے اخلاق عظیمہ نے ان کے ایمان میں مزید اضافہ فرما دیا۔ کیا رسول اللہ ﷺ نے نہیں فرمایا: شیشے (یعنی عورتوں) کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرو۔ اور کیا انھوں نے ام المومنین حضرت عائشہؓ کی غیرت پر مبنی ناراضی جو انتہائی محبت کی بنا پر تھی اور اپنے والد کی طرف ان کے شکوہ کو برداشت نہیں فرمایا؟ اور جب ان کے والد، ابوبکر صدیقؓ نے انھیں مارا، تو آپ ﷺ نے فرمایا: اے ابوبکرؓ! انھیں کہنے دیجیے۔

بدو: کیا واقعی ایسا ہوا تھا؟

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

حضرت عمرؓ: کیا تم علما کی مجالس میں حاضر نہیں ہوتے کہ دین اور آداب معاشرت سمجھ سکو؟

بدو: نہیں اے امیر المومنینؓ! میں تو صبح شام کام کرنے والا آدمی ہوں۔ میرے پاس ان امور کے لیے وقت ہی نہیں ہوتا۔

حضرت عمرؓ: تم تمام وقت کام پر کیوں صرف کرتے ہو؟

بدو: میرا کنبہ بڑا ہے اے امیر المومنینؓ!

حضرت عمرؓ: اگر تم ہمارے پاس آتے اور اپنی پریشانی بیان کرتے، تو ہم تمھیں بیت المال میں سے (بقدر ضرورت) مال ضرور عطا کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بقدر استطاعت عمل ہی کا مکلف بنایا ہے۔ تم حصول علم اور عبادت کے لیے بھی وقت نکالا کرو اے آدمی!

بدو: اللہ تعالیٰ آپ کو اس اعلیٰ درجے کی امارت کا بدلہ دے۔ آپ دین و دنیا (کے معاملات) میں بہترین راہنمائی کرتے ہیں۔

وہ بدو پھر اس عزم کے ساتھ لوٹ گیا کہ اب نیا انسان بننے کی سعی کرے گا، جو طالب علم بھی ہوگا۔ علما کی مجالس میں بیٹھ کر رفتہ رفتہ وہ عالم و عابد اور اپنے بیوی بچوں کی نرمی سے تربیت کرنے والا بن گیا۔ ان کے گھر محبت اور ایمان کے پاکیزہ جھونکے چلنے لگے۔ وہ گھر سکون کی چھاؤں میں آ گیا۔ اس کی بیوی نوبیاہتا دلھن کی طرح ذوق و شوق سے اس کا روزانہ انتظار کرنے لگی۔ میاں بیوی نے مل کر اس گھر کو علم اور آداب عالیہ کا گہوارہ بنا دیا۔ ان کے اپنے اور اعزا کے بچوں کے ساتھ ساتھ محلہ داروں کے بچے بھی ان کے گھر تعلیم حاصل کرنے آنے لگے۔

ایک دن وہ بدو اپنے بیوی بچوں کے ساتھ امیر المومنین حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انھیں دیکھ کر امیر المومنینؓ بہت خوش ہوئے اور ان کے چہروں پر پائے جانے والے آثار خیر سے نیک فال لی۔

بدو نے کہا: ”یہ آپؓ کے بوئے ہوئے بیج کا پھل ہے اے امیر المومنینؓ! اور آپؓ کی تعلیم اور راہنمائی کا نتیجہ ہے۔ بے شک آپؓ ہی وہ رہبر ہیں جنھوں نے مجھے یہ سبق دیا۔“

امیر المومنینؓ نے فرمایا: ”بلکہ تمھاری بیوی...... اللہ تعالیٰ نے اسے اس (خیر و برکت) کا سبب بنایا جو میں دیکھ رہا ہوں۔ تم اس چیز کو اس کے اسباب میں سے ایک سبب کی طرف منسوب کرتے ہوئے یہ کیوں نہیں کہتے کہ مجھے میری بیوی نے (یہ سب) سکھایا ہے؟“

(بشکریہ ماہنامہ ”دعوۃ الفلاح“ کراچی)

فرمانِ رسولﷺ

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں، رسول اللہﷺ نے ارشاد فرمایا: میرے رب نے مجھے نو باتوں کا حکم دیا ہے:

۱۔ کھلے اور چھپے ہر حال میں اللہ سے ڈرو۔
۲۔ کسی پر مہربان ہوں یا کسی کے خلاف غصے میں ہوں، دونوں حالتوں میں انصاف ہی کی بات کہوں۔
۳۔ راستی اور اعتدال پر قائم رہوں چاہے امیر ہوں یا فقیر۔
۴۔ جو مجھ سے کٹے، میں اس سے جڑوں۔
۵۔ جو مجھے محروم کرے، میں اسے دوں۔
۶۔ جو مجھ سے زیادتی کرے، میں اسے معاف کروں۔
۷۔ میری خاموشی غور و فکر کی خاموشی ہو۔
۸۔ میری نگاہ عبرت کی نگاہ ہو۔
۹۔ میری گفتگو ذکر الٰہی کی گفتگو ہو۔

اس کے بعد آپﷺ نے فرمایا: ”نیکی کا حکم دوں اور بدی سے روکوں۔“ (مشکوٰۃ)

http://www.bookstube.net/

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

مسلم معاشرے میں بھائی چارہ اور

محبت بڑھانے کا مفت طریقہ

ایک سنت نبویؐ اپنا کر نفرت و پھوٹ سے چھٹکارا پایئے اور انسیت کا تحفہ پا لیجیے

مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی

حدیث

نبوی ﷺ ہے: "ولا تؤمنوا حتی تحابوا۔" یعنی "تم کامل مومن نہیں بن سکتے جب تک کہ تم ایک دوسرے سے محبت نہ کرو" مطلب یہ کہ ایک مسلمان کا ایمان اس وقت کامل ہوگا جب وہ دوسرے مسلمانوں سے محبت کرے۔ یہ بڑا اہم ارشاد ہے۔ اس کی اہمیت یوں بھی زیادہ ہے کہ لوگ حدیث کی طرف دھیان نہیں دیتے۔

آپس میں محبت

سوال یہ ہے کہ تمام مسلمانوں سے محبت کرنا، تو انسان کے اختیار میں نہیں! انسان کو کسی سے قلبی محبت ہوتی ہے اور کسی سے نہیں۔ گویا ہمیں بظاہر ایسا حکم دیا گیا جو ہماری طاقت اور قدرت سے باہر ہے۔ اس واسطے آپ ﷺ نے جو امت کے لیے سراپا رحمت ہیں، خود ہی اس مشکل کا حل فرمایا اور فرمایا: "اَوَلا اَدُلُّکُم علٰی شیءٍ اذا فعلتموہ تحاببتم" یعنی کیا میں تمھیں ایسی چیز نہ بتا دوں کہ اگر وہ تم اپناؤ، تو آپس میں محبت کرنے لگو۔" وہ یہ کہ "افشو السلام بینکم" یعنی تم آپس میں سلام کو پھیلاؤ۔ پوری حدیث کا ترجمہ یہ ہے:

"آپ ﷺ نے فرمایا، تم جنت میں داخل نہیں ہو سکتے یہاں تک کہ تم ایمان نہ لے آؤ، اور تم کامل مومن نہیں بن سکتے جب تک کہ تم ایک دوسرے سے محبت نہ کرو۔ کیا میں تمھیں ایسا کام نہ بتاؤں کہ جب تم اسے کرو، تو تم آپس میں محبت کرنے لگو، (اور وہ کام یہ ہے کہ) آپس میں سلام کو پھیلایا کرو۔" (صحیح مسلم)

دنیا میں مختلف مذاہب و اقوام کے لوگ جب ملاقات کریں، تو ایک دوسرے کے لیے نیک تمناؤں کا اظہار کرتے ہیں۔

http://www.pdfbookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

لیکن عموماً ان کے الفاظ محدود معانی رکھتے ہیں۔ جبکہ دین اسلام نے مسلمانوں کو یہ تعلیم دی کہ جب بھی دوسرے مسلمان بھائیوں سے ملاقات ہو تو ''السلام علیکم'' کہو۔ امن و سلامتی کی اس دعا میں سلامتی اور خیر کی ہر قسم شامل ہے۔

سنت مؤکدہ

قرآن پاک میں سلام کی بڑی تاکید آئی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ترجمہ: ''جب تم گھروں میں داخل ہو، تو اپنے لوگوں کو سلام کیا کرو، کہ یہ ملاقات کی وہ بابرکت پاکیزہ دعا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئی ہے۔'' (سورہ النور۔۶۱)

سلام کرنا سنت مؤکدہ ہے اور جواب دینا واجب۔ سلام کے سلسلے میں حضورﷺ کی بہت احادیث ہیں۔ ایک حدیث تو وہی ہے جو اوپر درج کی گئی۔ ایک دوسری حدیث بخاری اور مسلم میں آئی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمروؓ فرماتے ہیں، ایک آدمی نے رسولﷺ سے پوچھا کہ اسلام کا کون سا عمل پسندیدہ ہے؟ آپﷺ نے فرمایا: ''تم کھانا کھلاؤ اور سلام کرو ان کو جن کو تم پہچانتے ہو اور انھیں بھی جن کو نہیں پہچانتے۔''

معلوم ہوا کہ سنت یہ نہیں کہ کوئی جان پہچان کا آدمی مل گیا، تو اسے سلام کر لیا۔ سنت یہ ہے کہ جو بھی ملے، اسے سلام کرو، اور پہل کرنے والے کو ثواب زیادہ ملتا ہے۔ چناں چہ شریعت کا قاعدہ بھی ہے کہ ''السلام قبل الکلام''، یعنی جب بھی کسی سے ملاقات ہو، سب سے پہلے سلام کرو۔

سلام کی بہت تاکید ہے۔ رسولﷺ کی ایک عادت شریفہ بیان کی گئی کہ جب آپﷺ لوگوں کے پاس جاتے، تو تین مرتبہ سلام کرتے۔ اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ مثلاً مجمع زیادہ ہے، تو وہاں داخل ہوتے ہوئے ابتدائی لوگوں کو سلام کیا۔ پھر بڑھے، تو دوبارہ سلام کیا۔ پھر اور آگے بڑھے، تو سہ بارہ کیا تاکہ سب کو سلام پہنچ جائے۔

ایک مطلب یہ بیان ہوا ہے کہ جب رسول اللہﷺ کسی سے ملنے جاتے، تو اس زمانے میں گھر میں آواز دینے کا طریقہ یہ نہیں تھا جس طرح ہمارے یہاں ہے کہ گھنٹی بجاتے یا دستک دیتے ہیں۔ رسول اللہﷺ کا طریقہ اور تعلیم بھی یہی ہے کہ جب کسی کے گھر جاؤ تو اندر جانے کی اجازت السلام علیکم کہہ کر طلب کرو۔ جب اندر داخل ہو جاؤ تو پھر کہو السلام علیکم اور جب واپس آنے لگو، تو پھر کہو السلام علیکم۔ اس طریقے سے جہاں آپ تشریف لے جاتے، تین مرتبہ سلام ہو جاتا۔

ایک مطلب اور بھی ہے اور وہ بھی احادیث سے ثابت ہے۔ حضورﷺ نے ہدایت فرمائی تھی کہ اگر تم نے کسی سے ملاقات کرنی ہے اور اس کے گھر جانا ہے یا جہاں وہ موجود ہو، تو دستک دینے کے بجائے ایک مرتبہ کہو السلام علیکم۔ جواب آ جائے تو ٹھیک، لیکن نہ آئے، تو پھر کہو السلام علیکم۔ پھر بھی جواب نہ آئے، تو تیسری مرتبہ کہو السلام علیکم۔ پھر بھی جواب نہ آئے، تو واپس چلے آؤ اور اصرار نہ کرو کیونکہ یہ علامت اس بات کی ہے کہ گھر والے موجود نہیں یا وہ اس حالت میں نہیں کہ آپ سے ملاقات کر سکیں۔

بڑے خود چھوٹوں کو سلام کریں

آپﷺ کا معمول تھا، جب گھر میں داخل ہوتے، تو السلام علیکم کہتے۔ بچے ملتے تو انھیں السلام علیکم کہتے اور بڑے ملتے تو تب بھی یہ عمل فرماتے۔ آپﷺ کے چہرۂ انور پر مسکراہٹ ہوتی۔ جو بھی صحابیؓ ملتا، آپﷺ ان کو

http://www.bookstube.net/

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

سلام کرتے۔

ہمارے یہاں رواج ہو گیا ہے کہ لوگ انتظار کرتے ہیں، پہلے چھوٹے سلام کریں، وہ خود چھوٹوں کو سلام نہیں کرتے۔ یہ طریقہ حضور ﷺ کا نہیں بلکہ جو بھی پہل کرے، اس کو سلام کا ثواب زیادہ ملے گا۔

حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے ہدایت فرمائی کہ چھوٹا بڑے کو سلام کیا کرے، راستے سے گزرنے اور چلنے والا بیٹھے ہوئے کو سلام کیا کرے اور تھوڑے آدمی زیادہ آدمیوں کی جماعت کو سلام کریں۔ (صحیح بخاری)

آپ اگر افسر ہیں، تو جب دفتر جائیں، جاتے ہی السلام علیکم کہیے، اس انتظار میں نہ رہیے کہ ماتحت سلام کریں۔ اگرچہ ان کے لیے بہتر یہی تھا کہ سلام میں ابتدا کرتے۔ گھر میں جائیں، تو اس انتظار میں نہ رہیے کہ بچے اور گھر والے آپ کو سلام کریں بلکہ آپ السلام علیکم کہیے۔ بچوں کو سلام کرنے میں ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ اس طریقے سے وہ اسلامی آداب سیکھتے ہیں، ان کو بھی سلام کہنے کی عادت پڑتی ہے۔

علما نے یہاں تک لکھا ہے کہ دو آدمی اگر ساتھ ساتھ جا رہے ہیں۔ راستے میں دونوں کے درمیان کوئی آڑ مثلاً درخت یا دیوار وغیرہ آ گئی۔ پہلا ایک طرف سے نکلا اور دوسرا دوسری طرف سے، تو جب دونوں ملیں پھر سلام کریں۔ اسی طرح اگر آپ مہمان خانے میں بیٹھے ہیں۔ مہمان آپ کے پاس براجمان ہیں۔ آپ گھر میں کسی کام سے جاتے اور کچھ دیر بعد واپس آ جاتے ہیں، تو جب بھی آئیے، پھر السلام علیکم کہیے۔ جتنی مرتبہ آپ اندر آئیں، السلام علیکم کہنا چاہیے۔

صاحبِ مضمون

پاک و ہند کے ممتاز عالم دین، مفتی محمد شفیع کے فرزند، مولانا محمد رفیع عثمانی اپنی علمیت اور مرتبے کے باعث مفتی اعظم پاکستان کہلاتے ہیں۔ ۱۹۷۶ء سے جامعہ دارالعلوم کراچی کے رئیس چلے آ رہے ہیں۔ آپ تفسیر، فقہ اور حدیث میں دسترس رکھتے ہیں۔ اردو اور عربی میں کتب تحریر کر چکے۔ زیرِنظر معلومات افروز مضمون آپ کی ایک تقریر سے اخذ شدہ ہے۔

فون پر السّلام علیکم کہیے

فون پر بھی ہیلو کہنے کے بجائے السلام علیکم کہنا چاہیے۔ ضیا الحق مرحوم نے ایک کام یہ کیا تھا کہ تمام سرکاری اداروں میں ہدایات جاری کر دی تھیں، سرکاری افسروں کی طرف سے جو فرمان بھی جائے، اس کاغذ پر بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھا جائے۔ دوسری ہدایت یہ جاری کر دی کہ جتنے بھی سرکاری فون آپریٹر بیٹھتے ہیں، وہ ٹیلی فون اٹھا کر ہیلو نہیں بلکہ السّلام علیکم کہیں، اگر کسی نے پہلے سلام کر دیا، تو وعلیکم السلام سے جواب دیں۔

جواب دینا واجب ہے

سلام کا جواب دینا واجب ہے۔ ایک مرتبہ ایک صحابیؓ نے حضرت عثمان غنیؓ کو سلام کیا۔ آپ کسی کام میں مشغول تھے۔ اس طرف توجہ نہیں فرما سکے، اور جواب نہ دیا۔ صحابیؓ نے امیر المومنین حضرت عمر فاروقؓ کو شکایت کی کہ میں نے عثمانؓ کو سلام کیا تھا، انھوں نے جواب نہیں دیا۔ حضرت عمر فاروقؓ نے حضرت عثمان غنیؓ کو طلب کر لیا کہ تمھیں انھوں

http://www.bookstube.net
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

نے سلام کیا تھا، آپ نے جواب کیوں نہیں دیا؟ حضرت عثمان غنیؓ نے کہا کہ مجھے پتا نہیں چلا کہ انھوں نے سلام کیا تھا، اس واسطے جواب نہیں دے سکا۔

محبّت بڑھانے کا طریقہ

آج ہمارے معاشرے میں سلام کرنے سے غفلت پائی جاتی ہے۔ اس سنت کو اگر زندہ کیا جائے، تو آپس میں محبّت پیدا ہو جائے۔ ہمارے ہاں ایسے اسباب تو چل رہے ہیں کہ جن سے آپس میں پھوٹ پڑ جائے، لیکن محبّت پیدا کرنے والے اسباب اور طریقے رائج نہیں۔

سلام کرنے کا ایک فائدہ یہ ہے، جب آپ کسی کو سلام کر لیں تو فوراً دونوں طرف اپنائیت اور انسیت کی کیفیت پیدا ہو جائے گی۔ اس کا بار بار تجربہ ہوا ہے۔ مثلاً جہاز میں پہنچے اور اپنی نشست پر جا کر بیٹھے۔ برابر والی نشست پر ایک صاحب پہلے سے بیٹھے ہیں۔ سلام کا تبادلہ نہیں ہوا، تو وہ ہم سے بات نہیں کرے گا اور ہم اس سے نہیں کریں گے۔ وہ اخبار اٹھا کر پڑھنا شروع کر دے گا اور ہم بھی۔ سارا سفر اسی خاموشی میں گزر جائے گا۔

اگر ہم نے جاتے ہی سلام کر دیا، تو وہ وعلیکم السلام کہہ کر مانوس ہو جائے گا۔ اگلے ہی لمحے آپ ایک دوسرے سے قرب اور انس محسوس کریں گے۔ وجہ یہ ہے کہ سلام کرنے سے محبتیں پیدا ہوتی ہیں۔ ہم امریکا میں بغرضِ سیاحت ایک جگہ گئے۔ وہاں بہت لوگ موجود تھے۔ ایک سیاہ فام نے مجھے سلام کیا، تو اتنی خوشی ہوئی کہ میں بتا نہیں سکتا۔

ایک دفعہ سفر میں تھا۔ بنگلہ دیش سے دہلی جانا تھا۔ ایک دو دن کے لیے نیپال رک گیا۔ وہاں ہوٹل اور مسجد تلاش کر رہا تھا۔ چلتے چلتے ایک آدمی کو دیکھا کہ اس نے ٹوپی پہن رکھی ہے۔ میں نے اسے السلام علیکم کہا۔ بس سلام کرنا ہی تھا کہ وہ میری طرف لپکا اور بڑی خوشی سے ملا۔ مجھ سے پوچھا کہ آپ کہاں سے آئے ہیں؟ میں نے بتایا کہ پاکستان سے، کہا کہ کوئی خدمت ہو تو بتائیے؟

میں نے کہا کہ بس مسجد اور ہوٹل کا پتا بتا دیں۔ اس نے کہا کہ میں آپ کو چھوڑ آتا ہوں۔ میں نے کہا کہ بس آپ پتا بتا دیجیے، تو کہنے لگا کہ نہیں، میں آپ کو وہاں تک پہنچا آتا ہوں۔ وہ میرے ساتھ چلنے لگا۔ دیکھیے صرف سلام کرنے سے کتنی آسانی ہوگئی۔

دین کا ایک اہم حصہ

اسلام نے مسلمانوں میں اتحاد و اتفاق کی تعلیم دینے کے ساتھ ساتھ اسے پیدا کرنے کے طریقے بھی بتائے ہیں اور نااتفاقی کو حرام قرار دیا۔ آپس میں محبت کرنا دین کا اہم حصہ ہے۔ شریعت کا مزاج ہے کہ جب کوئی کام گناہ کبیرہ ہو، تو دور ہی سے اس کی روک تھام شروع ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر زنا گناہ کبیرہ ہے۔ اس سلسلے میں حکم دیا گیا کہ نامحرم عورتوں کو نہ دیکھیں، تنہائی میں ان سے ملاقات نہ کریں۔ خواتین اپنے آپ کو حجاب میں رکھیں۔ نکاح کا حکم دے کر طریقہ ایسا آسان کر دیا گیا کہ کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔

مشکلات تو ہم نے رسموں کے ذریعے پیدا کر لی ہیں۔ اسلام نے تو نکاح کو اتنا آسان بنا دیا کہ چند منٹ میں آسانی سے ہو جاتا ہے۔ مقصد یہ تھا کہ تسکین کا صحیح راستہ دستیاب ہو۔ بعض خاص حالات اور کڑی شرائط کے ساتھ مردوں کو چار نکاح تک کرنے کی اجازت دی۔ یہ انتظامات اس لیے کیے گئے کہ آدمی حرام کاری کے قریب بھی نہ جائے۔

مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنا اور قتل و غارت گری بھی کبیرہ گناہ ہے۔ کفر اور شرک کے بعد کسی انسان کو ناحق قتل کرنا سب سے بڑا گناہ ہے۔ پھوٹ کی روک

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

تھام اور آپس میں بھائی چارہ پیدا کرنے کے لیے ہدایت دی گئی کہ ''اِنَّمَا المُؤمِنُونَ اِخوَۃ'' یعنی دنیا کے مسلمان تو سب بھائی بھائی ہیں۔'' چاہے ان کی زبانیں اور نسلیں الگ الگ ہوں، مقامات اور رنگ جدا ہوں، سب بھائی بھائی ہیں۔

اسلام نے یہ قانون تو بنا دیا لیکن اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ قانون پر عمل کرنے کا ماحول بنانا اور دیگر ابتدائی انتظامات کرنے پڑتے ہیں۔ چناں چہ فرمایا گیا آپس میں محبت نہ ہوں گی، تو ایمان ہی پورا نہیں ہوگا۔ پھر محبت پیدا کرنے کے راستے دکھلائے۔ ایک راستہ یہ بتایا کہ ایک دوسرے کو کھانا کھلاؤ، سلام کرو اور محبتوں میں خلل ڈالنے والے کام کرنے سے منع کیا۔ چناں چہ فرمایا کہ ایمان کے ستر سے زیادہ شعبے ہیں۔ شعبے سے مراد ایمان کے خاص خاص اعمال، ان میں سب سے افضل تو شہادت ہے اور ادنیٰ درجے کا عمل یہ ہے کہ ''اِمَاطَۃُ الاذیٰ عَنِ الطَّرِیق'' یعنی راستے سے تکلیف دہ چیز کو ہٹا دینا۔

آج ہمارے معاشرے میں لوگ دینی احکامات کی طرف توجہ نہیں دیتے۔ اگر آپ نے پھل کھایا اور چھلکا راستے میں پھینک دیا، تو لوگ گندگی محسوس کریں گے۔ اپنے گھر کو صاف کیا اور آڑ کباڑ باہر پھیلا دیا، تو آنے جانے والوں کو تکلیف ہوگی۔ فرمایا گیا کہ اپنے گھروں کے اردگرد صاف رکھو اور یہودیوں کی مشابہت اختیار نہ کرو۔ حضور ﷺ کے زمانے میں یہودی اپنے گھر صاف کر کے کوڑا باہر پھیلا دیتے تھے۔ اسلام نے حکم دیا کہ صرف اپنے گھر کو صاف رکھنا کافی نہیں، بلکہ اردگرد بھی صاف رکھو اور آڑ کباڑ باہر مت پھیلاؤ کہ اس سے دوسروں کو تکلیف ہوگی۔ گویا ہم ''اِمَاطَۃُ الاذیٰ عَنِ الطَّرِیق'' پر عمل کریں، تو اس سے محبتیں بڑھیں گی۔

نفرتیں اور جھگڑے اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب آپ کی طرف سے دوسروں کو تکلیف پہنچے۔ اسلام نے محبت پیدا کرنے والے طریقے، بتائے ہیں اور ساتھ ساتھ یہ بھی بتایا کہ محبتوں میں رخنہ ڈالنے والی چیزوں سے اجتناب کرو۔ سلام کرنا بھی محبت بڑھانے کا ذریعہ ہے۔

ایک احتیاط

اس بات کا خیال رکھا جائے کہ ایسے وقت سلام نہ کیجیے جب دوسروں کو تکلیف پہنچے۔ بعض مواقع میں سلام کرنا مکروہ ہے۔ مثلاً:

نماز پڑھنے، تلاوت قرآن کرنے، وعظ اور ذکر میں مشغول ہونے اور حدیث اور خطبہ پڑھنے والے کو۔ قاضی کو قضا کے وقت یعنی جب قاضی دینے کے لیے مسند قضا پر بیٹھا ہو، تو مدعی اور مدعا علیہ کو سلام نہ کریں۔ مؤذن کو اذان کے وقت، تکبیر کہنے اور علم شرعی سکھانے والے کو تعلیم دیتے ہوئے سلام نہ کریں۔ غیر محرم مرد کے لیے کسی جوان عورت کو سلام کرنا ممنوع ہے، جو شخص اپنی بیوی کے ساتھ ہو اس کو، کافر کو سلام کرنا ممنوع ہے۔ برہنہ شخص، پیشاب پاخانہ کرنے اور کھانا کھانے والے کو بھی سلام کرنا مکروہ ہے۔

یہ پابندی ہے کہ ایسے وقت سلام نہ کریں جب دوسرے کو تکلیف ہو، تو مصافحہ میں تو اور زیادہ پابندی ہے۔ مصافحہ کرنا صرف مستحب ہے۔ لہٰذا اس وقت مصافحہ نہ کریں جب دوسرا جلدی میں جا رہا ہو، یا اس کا ہاتھ خالی نہ ہو، یا وہ لکھنے میں مشغول ہو۔ اگر کسی مجلس میں کوئی بزرگ بیٹھے ہوں، بعض لوگ ان سے مصافحہ کرنے کے لیے دوسروں کو کہنیاں مارتے بڑھتے ہیں۔ اس طرح محبت کے بجائے نفرت پیدا ہوتی ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں آپس میں محبت پیدا کرنے والے اعمال کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

http://www.bookstube.net/

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

فرانس کے بدنام زمانہ رسالے

چارلی ابدو کی ریاکاری

یہ فرانسیسی رسالہ خلاف اسلام مواد بہ کثرت شائع کرتا مگر یہود کے سامنے بھیگی بلی بن جاتا ہے

سید عاصم محمود

چالیس سالہ جم ہائنز (Jim C. Hines) امریکا کا ممتاز ادیب ہے۔ یہ عموماً ماورائے عقل یا "فینٹسی" موضوعات پر ناول لکھتا ہے۔ اس نے ۱۲/مارچ ۲۰۱۲ء کو اپنے بلاگ پر "فریڈم آف اسپیچ ۱۰۱" نامی مضمون لکھا۔ یہ امریکی مصنف لکھتا ہے:

"میں آزادی اظہار رائے کا بہت بڑا حامی ہوں۔ لیکن جو لوگ لغو باتیں اور بیہودہ عمل کرتے ہیں، آزادی رائے انھیں (بھیانک) نتائج سے محفوظ نہیں رکھ سکتی۔ آزادی رائے کا یہ مطلب نہیں کہ انسان غیر ذمے دار ہو جائے اور کچھ بھی کرتا پھرے۔"

یوں جم ہائنز نے مختصر الفاظ میں آزادی اظہار رائے کی تشریح بیان کردی۔ یعنی یہ حق کسی انسان کو یہ اجازت نہیں دیتا کہ وہ فضول اور مہمل کام انجام دیتا پھرے اور اسے کوئی سزا نہ ملے۔ اسے اپنے غلط عمل کی سزا خود ہی بھگتنا پڑے گی۔ چناں چہ فرانسیسی رسالے، شارلی یا چارلی ابدو کے ناعاقبت اندیش کارٹونسٹوں اور مدیروں نے مسلمانوں کی دل آزاری کی، تو انھیں جذباتی اسلامیوں کے انتقام کا نشانہ بننا پڑا۔

لیکن دنیائے مغرب میں اکثریت کو یہ بات سمجھ نہیں آرہی کہ آزادی اظہار رائے اور ذمے داری ہم مترادف ہیں اور اس کی وجہ ان کی منافقت ہے۔ مغربی معاشروں

برازیلی کارٹونسٹ، کارلوس لطوف کا بنایا خاکہ

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

میں جب کوئی شخص نسل، مذہب، جنس وغیرہ کے خلاف قابلِ نفرت باتیں (Hate Speech) کرے، تو وہ گرفتار ہو جاتا ہے۔

اسی طرح فرانس سمیت کئی ممالک میں کوئی شخص یہود کے خلاف بات کرے، تو اس پر مقدمہ چلایا جاتا ہے۔ امریکا یا برطانیہ میں کوئی عیسائی ہم جنسیت کے قبیح فعل کی مخالفت کرے، تو وہ ''انتہا پسند'' کہلاتا ہے۔

لیکن جب کوئی مغربی اخبار، رسالہ، صحافی یا مصنف اسلام کو بدنام کرے، نبی کریم ﷺ کی ذات مبارکہ پر حملہ کرے، تو اسے ''آزادی اظہار رائے'' کا نام دیا کہا جاتا ہے۔ یہ منافقت کی انتہا ہے۔

فرانس میں ہولوکاسٹ (Holocaust) کی مخالفت کرنا جرم ہے۔ مغربی مورخین کا دعویٰ ہے کہ نازی جرمنوں نے مختلف یورپی ممالک میں آباد یہود پہ بے انتہا مظالم ڈھائے۔ یہی عمل ہولوکاسٹ کہلاتا ہے۔ اس کو تسلیم نہ کرنے والے پہ فرانس میں ''گائے سوٹ نامی قانون'' (Gayssot Act) کے تحت مقدمہ چلتا ہے۔

دلچسپ بات یہ کہ گائے سوٹ قانون کی پہلی شق میں درج ہے: ''ہر وہ عمل ممنوع ہے جو کسی نسلی گروہ، قوم، نسل یا مذہب کے خلاف انجام پائے۔'' اس شق کی رو سے چارلی ابدو پر مقدمہ چلنا چاہیے کیونکہ وہ پچھلے کئی برس سے انتہائی گھٹیا خاکے چھاپ کر سوا ارب مسلمانوں کے جذبات و احساسات کو شدید تکلیف پہنچاتا چلا آ رہا ہے۔ لیکن اسے ''آزادی اظہار رائے'' کی آڑ لے کر کھلی چھٹی دے دی گئی کہ وہ مسلمانوں کے جذبات سے کھیلے اور ان کا مذاق اڑائے۔ یہ کس قسم کی جمہوریت پسندی، عدل و انصاف اور انسانی حقوق کی ترویج ہے؟

اب فرانسیسیوں کی منافقت کا ایک اور روپ دیکھیے۔ ۸۶ سالہ موریس سینہ (Mauice Sinet) فرانس کا مشہور کارٹون نگار ہے۔ جب الجزائری فرانسیسی حکومت سے نبرد آزما تھے، تو سینہ نے ان کی حمایت کی تھی۔ اسی لیے وہ فرانسیسی حکومت کی نظر میں معتوب رہا اور اس پر مقدمے چلتے رہے۔

جب چارلی ابدو شائع ہونا شروع ہوا، تو موریس سینہ اس سے وابستہ ہو گیا۔ یہ عام طور پر سیاسی کارٹون بناتا ہے۔ جولائی ۲۰۰۹ء میں تب کے فرانسیسی صدر، نکولاس سارکوزی کے بیٹے، جین سارکوزی اور جیسکا سیوئن کی منگنی ہوئی۔ جیسکا ایک بڑی الیکٹرونکس فرانسیسی کمپنی کے یہودی مالک کی بیٹی ہے۔

اس منگنی کے بعد موریس سینہ نے چارلی ابدو میں ایک کالم لکھا اور جین سارکوزی ور جیسکا کے کارٹون بھی بنائے۔ کالم میں موریس نے لکھا ''یہ لڑکا اب ترقی کی منازل بہت تیزی سے طے کرے گا۔'' اشارہ امیر کبیر یہودی سسر کی طرف تھا کہ وہ ہر شعبہ زندگی میں اپنے داماد کی جا بے جا حمایت کرنے لگے گا۔

جلد ہی موریس پر یہود دشمن ہونے کا الزام لگ گیا۔ تب فلپی وال چارلی ابدو کا ایڈیٹر تھا۔ اس نے ۲۰۰۶ء میں ''آزادی اظہار رائے'' کے نام پر ڈینش اخبار، جیلینڈز پوسٹن کے شائع کردہ توہین آمیز کارٹون دوبارہ چھاپے تھے۔

لیکن اس بار فلپی وال نے منافقت کا ثبوت دیا۔ دراصل اس پر بااثر فرانسیسی یہود کا دباؤ تھا کہ وہ کالم لکھنے پر موریس سینہ سے معذرت طلب کرے۔ چناں چہ

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

کارٹون نگار سے کہا گیا کہ وہ معافی مانگے۔ موریس سینہ نے انکار کرڈالا۔ نتیجتاً اسے چارلی ابدو سے نکال دیا گیا۔

فرانسیسی صحافی، اولیور سائران (Olivier Cyran) طویل عرصہ چارلی ابدو سے منسلک رہا ہے۔ وہ کہتا ہے: ''واقعہ ۹/۱۱ کے بعد چارلی ابدو پہ اسلاموفوبیا سوار ہو گیا۔ وہ اکثر اسلام اور مسلمانوں پر حملے کرنے لگا جو فرانسیسی حکومت کے ایوانوں میں کوئی اثر و رسوخ نہیں رکھتے۔''

اب ڈنمارک کے بدنام زمانہ اخبار، جیلنڈز پوسٹن کی منافقت دیکھیے۔ اس نے حضرت عیسیٰؑ کے استہزائیہ کارٹون شائع کرنے سے انکار کر دیا تھا کیونکہ اخبار کو عوامی احتجاج کا خطرہ تھا۔ اسی طرح ایک بار سوال اٹھا کہ کیا جیلنڈز پوسٹن میں ہولوکاسٹ کا مذاق اڑاتے خاکے چھپ سکتے ہیں؟ اخبار والوں نے جواب دیا ''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ ہولوکاسٹ پر کارٹون شائع کیے جائیں۔''

کارلوس لطوف برازیل کا عالمی شہرت یافتہ کارٹونسٹ ہے۔ وہ فلسطینیوں پر اسرائیلی حکومت کے ظلم و ستم کو اپنے چشم کشا کارٹونوں سے آشکار کرتا ہے۔ اس نے چارلی ابدو کے خاکوں پر گفتگو کرتے ہوئے ملائیشیا کے مشہور اخبار، ڈیلی صباح کو بتایا:

''آزادی اظہار رائے اور نفرت انگیز بات (Hate Speech) کے مابین کیا فرق ہے؟ اس پر دانش وروں کے مابین نہ ختم ہونے والی بحث جاری ہے۔ ایک اہم سوال یہ ہے کہ بعض موضوعات پر بات کیوں نہیں ہو سکتی جبکہ دوسروں پر کرنے کی اجازت ہے؟ ہم بعض چیزوں کا مذاق اڑا سکتے ہیں، بقیہ کا نہیں۔

''مثال کے طور پر یورپ میں ہولوکاسٹ کا استہزا کرنا منع ہے۔ اسی طرح نسل پرستی پر بولنا یا لکھنا بھی ممنوع ہے۔ مگر مغربی اخبار و رسائل اسلام و محمد عربی ﷺ کی (نعوذ باللہ) کھلے عام توہین کرتے ہیں۔''

سوال یہ ہے کہ مغربی میڈیا نے اسلام کو طنز و تشنیع کا نشانہ کیوں بنا رکھا ہے؟ جواب میں کارلوس لطوف کہتا ہے: ''میں اس بابت کچھ نہیں کہہ سکتا۔ شاید مسلمانوں کے خلاف نفرت، آزادی اظہار رائے کی حدود جانچنے کی سعی یا محض تلذذ کی خاطر مسلمانوں کا مذاق اڑانا! لیکن یہ حقیقت ہے، وہ (چارلی ابدو کا مقتول عملہ) کوئی شریفانہ مقصد انجام دیتے ہوئے ہلاک نہیں ہوا۔ ان کی یہی کوشش رہی کہ مسلمانوں کو اشتعال میں لایا اور اسلام کے خلاف زیادہ سے زیادہ نفرت بڑھائی جائے۔''

چارلس کلیلب (۱۷۸۰ء۔۱۸۳۲ء) برطانیہ کا ممتاز پادری اور ادیب گزرا ہے۔ اس انگریز مدبر کا ایک خوبصورت قول ہے:

''ہم بعض انسانوں سے اس لیے نفرت کرتے ہیں کہ ان کے متعلق کچھ نہیں جانتے اور اسی نفرت کی وجہ سے کبھی ان کے بارے میں نہیں جان پاتے۔''

یہ قول اسلام اور ہمارے پیارے نبی ﷺ کے متعلق کچھ نہ جاننے والے اہل مغرب پر پورا اترتا ہے۔ وہ غلط فہمیوں کے باعث ساری عمر اسلام اور مسلمانوں سے نفرت کرتے رہتے ہیں۔ حالانکہ ایک مشہور امریکی ماہر بشریات، ٹیری گوئیمنس کا قول ہے:

''نفرت کا جذبہ انسان کی ساری خوبیاں چوس کر اسے ناکارہ بنا ڈالتا ہے۔'' نجانے اسلام مخالف مغربی اس قول کی صداقت کب جانیں گے!

◆◆◆

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

تحریکِ کشمیر کا روشن باب

جب کشمیریوں نے نعرۂ آزادی بلند کیا

بھارت ۴۴ برس جھوٹ بولتا رہا کہ پٹھان لشکر کے حملہ آور ہونے سے مسئلہ کشمیر کا آغاز ہوا
مگر اب ایک آسٹریلوی مورخ نے بھارتی حکمرانوں کی دروغ گوئی کا پردہ چاک کر دیا

کرسٹوفر نیڈن

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

اُردو مثل ہے: ''ایک جھوٹ چھپانے کے لیے ہزار جھوٹ بولنے پڑتے ہیں۔'' یہ مسئلہ کشمیر کے ضمن میں بھارتی حکمرانوں پر پوری اترتی ہے۔ ۱۹۶۴ء میں پنڈت نہرو کے آنجہانی ہوتے ہی ڈھیٹ بھارتی حکمران سرعام دو جھوٹ بولنے لگے، اوّل یہ کہ ریاست جموں و کشمیر میں رائے شماری کرانے کا وعدہ نہیں کیا گیا۔ دوم یہ کہ ریاست میں جنگ کا آغاز پاکستان نے کیا جب ۲۲؍اکتوبر ۱۹۴۷ء کو پختون لشکر حملہ آور ہوا۔ حالانکہ یہ دونوں باتیں صریح جھوٹ ہیں۔

بھارتی حکمران طبقے کے درج بالا دعوؤں کو حال ہی میں ایک ممتاز و نیک نام دانشور، پروفیسر کرسٹوفر نیڈن نے بھی اپنی کتاب ''کشمیر: تاریخ جو لکھی نہیں گئی'' (Kashmir: The unwritten history) میں جھٹلایا ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر نیڈن آسٹریلیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ نوجوانی میں کینبرا یونیورسٹی میں زیرتعلیم تھے، تو عالمی سیاسیات کی تعلیم پاتے ہوئے مسئلہ کشمیر میں دلچسپی لینے لگے۔ یہ دلچسپی اتنی بڑھی کہ ۱۹۸۱ء میں بھارت آئے اور پھر پاکستان کی بھی جی بھر کے سیاحت کی۔ دونوں ممالک کے باشندوں کی مہمان نوازی نے ان کا دل موہ لیا۔ تاہم نوجوان آسٹریلین نے سچ کا دامن نہیں چھوڑا۔

۲۰۰۱ء میں انھوں نے لاٹروب یونیورسٹی، میلبورن سے پی ایچ ڈی کی ڈگری لی۔ ان کے پی ایچ ڈی مقالے کا موضوع ''وادی پونچھ کی جنگ آزادی'' تھا۔ اس مقالے میں انھوں نے ثابت کیا کہ ریاست جموں و کشمیر میں تحریک آزادی کا آغاز وہیں آباد مسلمانوں نے کیا..... اسے پاکستان سے درآمد نہیں کیا گیا جیسا کہ بھارتی حکمران طبقہ الزام لگاتا ہے۔ اسی مقالے کی بنیاد پر انھوں نے درج بالا کتاب بھی تصنیف کر ڈالی۔

پی ایچ ڈی کرنے کے بعد ڈاکٹر نیڈن مختلف آسٹریلوی یونیورسٹیوں سے بہ حیثیت ماہر امور جنوبی ایشیا وابستہ رہے۔ جون ۲۰۱۴ء سے آپ امریکا کے مشہور تحقیقی ادارے، ایشیا۔ پیسفک سینٹر فار سیکیورٹی اسٹڈیز سے بطور پروفیسر جنوبی ایشیا وابستہ ہیں۔ آپ کی آنے والی کتاب ''Understanding Kashmir and Kashmiries'' بھی مسئلہ کشمیر سے متعلق ہے۔ یہ اپریل ۲۰۱۵ء میں طبع ہوگی۔

ذیل میں پروفیسر صاحب کی کتاب ''کشمیر: تاریخ جو لکھی نہیں گئی'' کا ایک باب پیش ہے۔ یہ باب وادی پونچھ میں خصوصاً اور ریاست جموں و کشمیر میں برپا ہونے والی تحریک آزادی سے متعلق ہے۔ اسے انھوں نے سیکڑوں دستاویزات کنگھال کر شبانہ روز محنت کے بعد تیار کیا۔

تین اہم عمل

۱۹۴۷ء میں جموں و کشمیر میں تین ایسے عمل انجام پائے جن کی بنا پر یہ پوری ریاست پاکستان یا بھارت میں شامل نہیں ہوسکی۔ سب سے پہلے وادی پونچھ کے مسلمانوں نے مہاراجا ہری سنگھ کے خلاف بغاوت کر دی۔ وہ پونچھی ریاست کو پاکستان میں شامل کرنا چاہتے تھے۔

دوسرے جموں میں وسیع پیمانے پر ہندو مسلم فساد ہو گیا اور اس زمانے کے اخبارات انکشاف کرتے ہیں کہ ڈوگرا فوج اور ہندوؤں کے ہاتھوں مسلمانان جموں کا قتل عام ہوا۔ یہ ایک طرح سے مسلمانوں کی نسل کشی تھی جس میں لاکھوں اسلامیان شہید ہوئے۔

تیسرے پونچھ میں تحریک آزادی جنم لینے کے بعد

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

مجاہدین جو علاقے فتح کرنے میں کامیاب رہے، وہاں انھوں نے اپنی حکومت قائم کر لی۔ بعدازاں یہ علاقے ''آزاد کشمیر'' کے نام سے معروف ہوئے۔

درج بالا تینوں عمل ایسے ہنگامہ خیز دور میں انجام پائے جو محض ۱۰ ہفتوں تک محیط تھا۔ یعنی ۱۴ راگست (قیام پاکستان) سے لے کر ۲۶ راکتوبر ۱۹۴۷ء کے دن تک جب جموں و کشمیر کے والی، ہری سنگھ نے ریاست کا الحاق بھارت کے ساتھ کر دیا۔

یہ تمام عمل جموں و کشمیر کے باسیوں نے انجام دیے جو ریاست میں رہنے کا قانونی حق رکھتے ہیں۔ استثنیٰ صرف یہ ہے کہ جموں کے ہندو مسلم فساد میں ہندو مہاجرین نے بھی حصہ لیا جو سیالکوٹ کے راستے پاکستان سے جموں پہنچے تھے۔

یکے بعد دیگرے جنم لینے والے یہ تینوں عمل بڑے اہم تھے۔ ان کی وجہ سے لاکھوں افراد جاں بحق ہوئے اور ہزارہا خاندان بے گھر ہو گئے۔ انھوں نے سیاسی و عسکری طور پر خصوصاً علاقہ جموں کو پاکستان حمایتی اور بھارت حمایتی میں تقسیم کر دیا۔ انہی کی وجہ سے مسئلہ کشمیر پیدا ہوا جو عالمی سطح پر سنگین ہیئت اختیار کر چکا۔

حقائق سے عیاں ہے، جیسے ہی ۱۴ر اور ۱۵ راگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان و بھارت معرضِ وجود میں آئے، اس قضیے نے جنم لیا کہ ریاست جموں و کشمیر کس ملک کا حصہ بنے؟ ۲۶ راکتوبر تک مہاراجا ہری سنگھ کی یہی کوشش رہی کہ وہ اپنی ریاست کو خودمختار بنا لے اور یوں اپنا اقتدار بحال رکھے۔ مگر اسے اور اس کی ڈوگرا فوج کو ناکامی ہوئی۔

۱۹۴۷ء میں علاقہ جموں میں جنم لینے والے واقعات یعنی ہندو مسلم فساد اور ڈوگرا فوج کا مسلمانوں پر حملہ بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ مگر تب بھارت اور پاکستان کے انگریزی و اردو اخبارات میں فسادات سے متعلق بہت کم خبریں شائع ہوئیں۔ اس صورت حال سے بھارتی حکومت نے خوب فائدہ اٹھایا۔

وہ یوں کہ بھارتی حکومت دعویٰ کرتی ہے کہ جب ۲۲ راکتوبر کو پاکستان سے پٹھان لشکر نے جموں و کشمیر پر حملہ کیا، تو ریاست میں جنگ کا آغاز ہوا۔ پاکستانی حکومت اپنے مخالف کی چال کو سمجھ نہ سکی اور اس نے بھارتی حکومت کے دعوے کو جھٹلانے کی کوششیں نہیں کیں۔

حالانکہ پاکستانی حکومت کو چاہیے تھا، وہ یہ سچائی نمایاں کرتی کہ ریاست کے باشندے ہی ڈوگرا راج کے خلاف بغاوت کر چکے۔ نیز ڈوگرا فوج جموں کے مسلمانوں پر مظالم ڈھا رہی ہے۔ لیکن پراسرار طور پر پاکستانی حکومت نے یہ حقائق مشتہر نہیں کیے۔ اس بنا پر یہ جاننا ضروری ہے کہ ۱۹۴۷ء میں وادی پونچھ اور علاقہ جموں میں کس قسم کے واقعات رونما ہوئے۔

ان واقعات کی بابت جاننے کے لیے میں نے اس زمانے کے سیکڑوں اخبارات دیکھے۔ ریاست کے

http://www.bookstube.net/

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

بوڑھے لوگوں سے بھی ملا۔ فریقین ایک دوسرے پر فساد کا الزام لگاتے ہیں۔ بہرحال میری تحقیق سے ایک اہم نتیجہ ضرور نکلا...... وہ یہ کہ بیرونی حملہ آوروں نے نہیں بلکہ خود کشمیریوں نے مسئلہ کشمیر کو جنم دیا۔

کشمیری مسلمانوں کی تمنا

اگست ۱۹۴۷ء میں انگریز حکومت کے خاتمے سے ریاست جموں و کشمیر پر دو بڑے اثرات مرتب ہوئے۔ اوّل مہاراجا ہری سنگھ اپنی ضمانتی و پشت پناہ، برطانوی حکومت سے محروم ہو گیا۔ اب وہ کشمیری عوام پر اپنی مرضی نہیں ٹھونس سکتا تھا۔ ورنہ پہلے ریاست میں عوام بغاوت کرتے، تو انگریز مہاراجا کی مدد کرتے یا اسے کشمیریوں پر ظلم ڈھانے کی کھلی چھٹی دے دیتے تھے۔

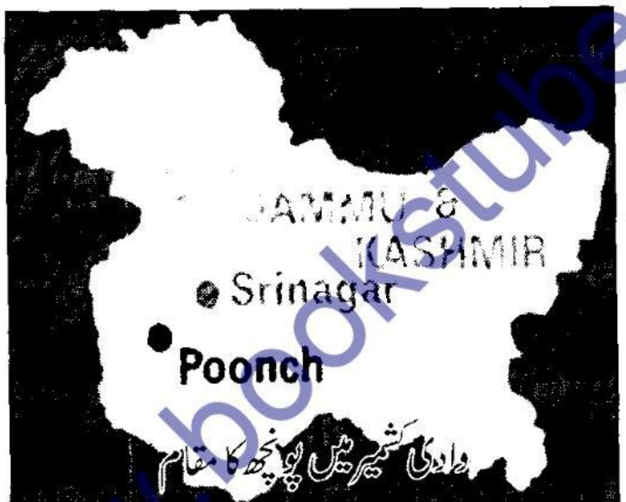

وادی کشمیر میں پونچھ کا مقام

دوسرے پاکستان اور بھارت کی حکومتوں نے مہاراجا ہری سنگھ پہ دباؤ ڈالا کہ وہ کسی ایک ملک کے ساتھ ریاست کا الحاق کر دے۔ مہاراجا سے یہ مطالبہ بھی کیا گیا کہ وہ ریاستی جیلوں میں قید تمام سیاسی کارکنوں اور لیڈروں کو رہا کر ڈالے۔

انگریزوں نے برصغیر سے جاتے ہوئے یہ قانون بنایا کہ ہر ہندوستانی ریاست کا حکمران یہ طے کرے گا، اس نے پاکستان میں شامل ہونا ہے یا بھارت! اب مہاراجا ہری سنگھ کو بھی یہی فیصلہ کرنا تھا۔ دوسری طرف ریاست کے باشندے شدت سے انتظار کرنے لگے کہ دیکھیے جموں و کشمیر کا مستقبل کس نوزائیدہ مملکت سے وابستہ ہے۔

جب پاکستان و بھارت کا قیام قریب آیا، تو ریاست کے علاقہ جموں میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے مابین بہت تناؤ والی کیفیت تھی۔ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد پاکستانی پنجاب سے ہندو مہاجر جموں پہنچنے لگے۔ انھوں نے فسادات کی داستانیں نمک مرچ لگا کر سنائیں، تو علاقے میں دونوں قومیتوں کے مابین تصادم کا خطرہ مزید بڑھ گیا۔

یہ حقیقت ہے کہ ۱۹۴۷ء میں جموں و کشمیر کے مسلمانوں کی خواہش تھی کہ ریاست پاکستان کا حصہ بن جائے۔ جبکہ ہندو اور سکھ ریاست کی بھارت میں شمولیت چاہتے تھے۔ چناں چہ ماہ اگست ہی میں جموں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین جھڑپیں ہونے لگیں۔ فساد پھر بڑھتا چلا گیا۔ حتیٰ کہ ہندو اکثریت اور ڈوگرا فوج نے مل کر مسلمانانِ جموں کا قتل عام کیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ تقسیم ہند کے وقت جموں میں متحدہ پنجاب سے زیادہ مسلمان ہلاک ہوئے۔ افسوس کہ اخبارات نے اس امر کا زیادہ چرچا نہیں کیا۔

وجہ یہ ہے کہ تمام بڑے اخبارات کی توجہ متحدہ پنجاب اور بنگال میں ہونے والے فسادات پر مرکوز تھی۔ مزید برآں جموں کے قتل عام کی تشہیر کی جاتی، تو خدشہ تھا کہ فرقہ وارانہ فسادات کا الاؤ مزید بھڑک اٹھے گا۔ اس

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

لیے خصوصاً انگریزی اخبارات نے جموں میں مسلمانوں کی نسل کشی سے متعلق زیادہ خبریں شائع نہیں کیں۔

مزید برآں مہاراجا ہری سنگھ کی حکومت نے ریاست میں کڑی سینسرشپ نافذ کر دی۔ جو اخبارات اور صحافی پاکستان سے الحاق کے حامی تھے، انھیں بے طرح تنگ کیا جانے لگا۔ پاکستانی پنجاب سے مسلم اخبارات کی آمد پر پابندی لگا دی گئی۔ اس آمریت کے خلاف اخبارات نے احتجاج کیا۔ ۲۱/اکتوبر ۱۹۴۷ء کو لاہور کے مشہور انگریزی اخبار، سول اینڈ ملٹری گزٹ نے میڈیا کا گلا گھونٹنے پر ہری سنگھ حکومت کو اپنے اداریے میں تنقید کا نشانہ بنایا۔

۱۹۴۷ء میں جموں میں جو واقعات پیش آئے، افسوس کہ بھارتی اور پاکستانی حکومتوں کی عدم توجہ کے باعث ان پر بہت کم لکھا گیا۔ دونوں حکومتیں اپنے مسائل میں پھنسی ہوئی تھیں۔ یہی وجہ ہے، وادی پونچھ میں جنم لینے والا اعلان آزادی بھی مشتہر نہ ہو سکا۔

وادی پونچھ میں مختلف وجوہ کی بنا پر تحریک آزادی کا آغاز ہوا۔ اول علاقے کے مسلمان ڈوگرا حکومت سے نفرت کرتے تھے۔ دوم تقسیم ہند کے فوراً بعد ڈوگرا فوج نے وادی میں ظلم وستم کا بازار گرم کر دیا۔ سوم پونچھی مسلمان اپنے علاقے کو مملکت پاکستان میں شامل کرنا چاہتے تھے۔ چہارم وجہ سکھوں کا جموں پر حملہ بنی۔ پونچھیوں کو ڈوگرا شاہی کی آمرانہ معاشی پالیسیوں پر بھی سخت اعتراض تھا۔

ایک اور بڑی وجہ یہ تھی کہ پونچھ اور میرپور کے علاقوں میں پہاڑوں اور جنگلوں کی کثرت ہے۔ چناں چہ وادی کشمیر کے برعکس وہاں کھیتی باڑی کی خاطر بہت کم زمین میسر تھی۔ لہٰذا کئی پونچھی اور میرپوری سپاہ گری سے منسلک تھے۔ انھوں نے ہندوستانی شاہی فوج میں شامل ہو کر دوسری جنگ عظیم میں خدمات انجام دی تھیں۔ لہٰذا وہ لڑائی بھڑائی کے ماہر تھے۔

ہری سنگھ کا دورہ

۲۱/اپریل ۱۹۴۷ء کو مہاراجا ہری سنگھ نے اپنی ریاست کے ''سرحدی علاقوں''، یعنی وادی پونچھ کی باغ اور سدھنتی تحصیلوں کا دورہ کیا۔ راولاکوٹ میں پچاس ہزار سے زائد پونچھیوں اور میرپوریوں نے مہاراجا کا استقبال کیا۔ ان میں سے ۹۰ فیصد عسکری تجربہ رکھتے اور اکثر مسلح تھے۔ انھیں دیکھ کر مہاراجا دل ہی دل میں بڑا خوفزدہ ہوا۔ وہ ان مسلمانوں کو اپنے اقتدار کے لیے خطرہ محسوس کرنے لگا۔

سردار ابراہیم خان

چناں چہ جولائی ۱۹۴۷ء میں حیلے بہانوں سے ریاستی پولیس نے پونچھی و میرپوری مسلمانوں سے ہتھیار لیے اور انھیں سرکاری مال خانے میں جمع کرا دیا۔ لیکن یہ جان کر وادی پونچھ کے مسلمان ہکا بکا رہ گئے کہ ان کا سارا اسلحہ مقامی ہندوؤں اور سکھوں میں تقسیم کر دیا گیا۔

حالات پونچھیوں ڈوگرا شاہی کے مابین ٹکراؤ کی سمت بڑھ رہے تھے۔ اسی دوران ۱۴/اگست کو نئی اسلامی مملکت، پاکستان وجود میں آئی۔ اس دن وادی پونچھ کے سبھی مسلمانوں نے گھروں میں سبز ہلالی پرچم لہرائے۔

http://www.bookstube.net/

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

ان کی دلی تمنا تھی کہ ریاست پاکستان کا حصہ بن جائے۔

وادی پونچھ کے باشندوں کو پاکستان کا حمایتی پا کر ڈوگرا حکومت چوکنا ہو گئی۔ اُدھر مسلمانوں کو بھی ہری سنگھ کے لیت و لعل سے اندازہ ہوا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ ریاست میں ۷۷ فیصد آبادی مسلم تھی مگر یہ ہندو راجا اپنا اقتدار برقرار رکھنے پر تلا بیٹھا تھا۔ چناں چہ پونچھیوں نے حرکت میں آنے کا فیصلہ کیا تاکہ ڈوگرا شاہی کو نابود کر سکیں۔

اگست ۱۹۴۷ء سے وادی پونچھ میں حکومت مخالف تحریک کا آغاز ہوا جب لوگوں نے ہر قسم کا سرکاری ٹیکس دینے سے انکار کر دیا۔ مہاراجا ہری سنگھ کی نگاہ میں یہ بغاوت تھی۔ چناں چہ ۱۵/اگست کو ڈوگرا فوج وادی پونچھ میں آ پہنچی جس کے پچانوے فیصد فوجی غیر مسلم تھے۔

اب وادی میں مختلف مقامات پر ریاستی فوج اور پونچھی و میرپوری مجاہدین کے مابین لڑائی ہونے لگی۔ اس دوران ڈوگرے نہتے مسلمانوں کا قتل عام کرنے لگے۔ طاقت کے نشے میں سرشار ہو کر انھوں نے وادی کی مقامی آبادی پر بے محابا ستم کیے۔

اس زمانے میں سردار محمد ابراہیم خان راولاکوٹ میں مقیم تھے۔ آپ پاکستان کی حمایتی کشمیری جماعت، مسلم کانفرنس کے راہنما تھے۔ انھوں نے ۱۹۴۹ء کے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ صرف ۲۷/اگست ۱۹۴۷ء کے دن ڈوگرا فوج نے وادی میں پانچ سو سے زیادہ مسلمان شہید کر دیے۔ سردار ابراہیم بعدازاں آزاد کشمیر کے پہلے صدر منتخب ہوئے۔

اخباری خبروں و تحقیقی مضامین سے بھی عیاں ہے کہ ڈوگرا فوج نے وادی میں دیہات جلا ڈالے، مسلمانوں کے جلسوں پر بے دریغ فائرنگ کی اور کئی علاقوں میں مارشل لا لگا دیا۔ اس ظلم و ستم نے تمام وادی میں تحریک آزادی کی لہر دوڑا دی۔ اب پونچھیوں نے ڈوگرا راج کا طوق گلے سے اتارنے کا تہیہ کر لیا۔

چناں چہ نوجوان پونچھی منظم ہونے لگے اور ماہ اگست کے آخر تک ان کی مسلح جدوجہد شروع ہو گئی۔ ۲۴ سالہ نوجوان، سردار عبدالقیوم خان اس تحریک آزادی کے سرکردہ راہنما تھے۔ ان مجاہدین نے ڈوگرا شاہی پہ ایسے زبردست انداز میں ہلّہ بولا کہ وہ دم دبا کر بھاگ اٹھی۔ چناں چہ اگلے چھے ہفتوں میں پونچھ شہر کے علاوہ پوری وادی مجاہدین نے فتح کر لی۔

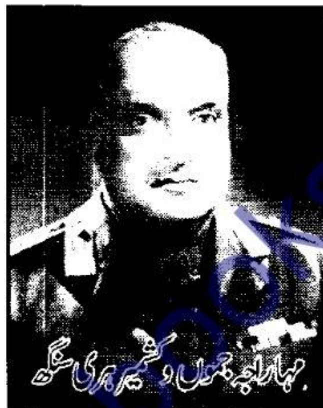
مہاراجہ جموں و کشمیر ہری سنگھ

مجاہدین کی فتح سے مہاراجا بہت تلملایا، اس نے ڈوگرا فوج کو حکم دیا کہ وہ پوری قوت سے وادی پونچھ سے ''باغیوں'' پر حملہ کر دے۔ ساتھ ہی جموں کے مسلمانوں پر بھی ہلہ بول دیا گیا۔

۴/ستمبر ۱۹۴۷ء کو پہلی بار مہاراجا ہری سنگھ نے پاکستان پر الزام لگایا کہ وہ مجاہدین کی امداد کے لیے مسلح افراد بھیج رہا ہے۔ پھر اوائل اکتوبر میں پاکستانی حکومت پر الزام لگا کہ اس نے پاکستان سے آنے والا مال تجارت روک کر ریاست کا معاشرتی مقاطعہ کر ڈالا ہے۔ پاکستان نے دونوں الزامات تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

بھارتی حکومت نے ۱۹۴۸ء میں ریاست جموں و کشمیر پر ایک وائٹ پیپر جاری کیا تھا۔ اس میں صرف

http://www.booksstube.net/

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

ایک جگہ درج ہے کہ پاکستان سے "درانداز" ریاست میں داخل ہوئے۔ یہ خبر میجر جنرل سکاٹ نے دی جو طویل عرصے ریاستی شاہی فوج کا سربراہ (چیف آف اسٹاف) چلا آرہا تھا۔

میجر جنرل سکاٹ کا دعویٰ تھا کہ تحصیل کہوٹہ سے ستی قبیلے سے تعلق رکھنے والے چار سو جنگجو ریاست میں داخل ہوتے دیکھے گئے۔ لیکن ممکن ہے کہ برطانوی جنرل کو مغالطہ ہوا ہو، کیونکہ ہزارہا پونچھی اور میرپوری پنجاب آتے جاتے رہتے تھے۔ وہاں ان کے کاروباری تعلقات ہی نہ تھے، بلکہ رشتے داریاں بھی تھیں۔

دراصل میرپور کے اردگرد ریاست جموں و کشمیر اور پاکستان کی سرحد خاصی بھربھری تھی، لہٰذا لوگ بے دھڑک آتے جاتے۔ پھر سری نگر اور جموں شہروں کے بجائے جہلم، سیالکوٹ اور گجرات، میرپور اور پونچھ سے زیادہ نزدیک تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ پاکستانیوں نے وادی پونچھ کی بغاوت میں کوئی خاص کردار ادا نہیں کیا...... بلکہ یہ تحریک آزادی وہیں کے باسیوں کی برپا کردہ تھی۔ وجہ یہ کہ اس زمانے میں حکومت پاکستان کا بال بال انتظامی اور سیاسی مسائل میں پھنسا ہوا تھا۔ لاکھوں مہاجرین کی آمد نے اس کے سامنے مسائل کا پہاڑ کھڑا کر ڈالا۔ لہٰذا پاکستانی حکومت اس قابل نہیں تھی کہ سرکاری طور پر وادی پونچھ کے مجاہدین کی مدد کر پاتی۔ لیکن وادی کے مسلمان پنجابی اور پختون مسلمانوں سے نسلی، خاندانی، ثقافتی، معاشی اور مذہبی رشتہ رکھتے تھے۔ اسی رشتے کے باعث سرحد اور پنجاب میں مقیم مسلمانوں کو یہ تحریک ملی کہ وہ بھی جہادِ کشمیر میں شریک ہو جائیں۔

مثال کے طور پر وادی پونچھ کے سدھن قبائل اپنے آپ کو سدوزئی پٹھان بتاتے ہیں۔ اس حقیقت سے عیاں ہے کہ صوبہ سرحد سے پٹھان مصیبت میں گھرے بھائیوں کی مدد کے لیے فوراً کیوں آ پہنچے۔ اور جیسا کہ پہلے بتایا گیا، بہت سے پونچھی اور میرپوری عسکری تجربہ رکھتے تھے۔ لہٰذا ڈوگرا فوج سے مقابلہ کرنا ان کے لیے مشکل نہ تھا۔ انھی وجوہ کی بنا پر وادی کے مجاہدین کو پاکستانی امداد کی ضرورت بھی نہیں تھی۔

وادی پونچھ کے مجاہدین نے البتہ صوبہ سرحد جا کر ہی ہتھیار خریدے۔ یہ اسلحہ پا کر ہی وہ بہ شکل فوج منظم ہوئے اور ڈوگرا شاہی کا مقابلہ کرنے لگے۔ شروع میں مزاحمت دیہات سے شروع ہوئی۔ تب ہر علاقے میں مجاہدین اپنے طور پر ڈوگرا فوجیوں سے لڑ رہے تھے۔ اوائل ستمبر میں سردار محمد ابراہیم اور تحریک کے دیگر راہنماؤں نے مری میں کمانڈ اینڈ کنٹرول سینٹر قائم کر لیا۔

اب اس کمانڈ سینٹر سے پونچھی اور میرپوری مجاہدین کو ہدایات دی جانے لگیں۔ سردار ابراہیم اور ان کے ساتھیوں کو پاک فوج، پاکستانی بیوروکریسی اور پاکستانی رضاکاروں کی حمایت حاصل تھی۔ لیکن یہ جاننا مشکل ہے کہ کیا پاکستانی قیادت بھی پونچھیوں کے اس کمانڈ سینٹر سے واقف تھی؟ بہرحال اس کی بدولت وادی پونچھ میں ڈوگرا فوج سے نبردآزما مجاہدین بہت جلد منظم ہو گئے۔

سردار محمد ابراہیم خان کے مطابق یہ مجاہد فوج پچاس ہزار فوجیوں پر مشتمل تھی۔ ان میں سے ۹۰ فیصد سابقہ یا حاضر فوجی تھے۔ کچھ پاکستانی رضاکار بھی اس میں شامل ہوئے اور بارہ خواتین بھی! وادی پونچھ اور پاکستان میں چندہ جمع کر کے یہ فوج تیار کی گئی۔

http://www.bookstube.net/

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

اس فوج کے پاس اسلحے کی کمی تھی۔ ذرائع مواصلات بھی محدود تھے، مگر اس نے بہت جلد اپنی سرگرمیوں کا دائرہ وادی کشمیر اور جموں تک پھیلا دیا۔ اسی دوران گلگت آزاد ہو گیا۔ چناں چہ تحریک آزادی جموں و وادی کشمیر تک محدود ہو گئی۔

تین ماہ بعد اس مجاہد فوج کی قیادت ''جنرل طارق'' نے سنبھال لی۔ یہ دراصل پاک فوج کے کرنل اکبر خان تھے۔ ان کی تعیناتی سے عیاں ہے، تب تک پاک فوج بھی میدان جنگ میں کود پڑی تھی۔ یہی اکبر خان جب ۱۹۵۱ء میں میجر جنرل بنے، تو انھوں نے پاکستانی حکومت کا تختہ الٹنا چاہا۔ وہ سمجھتے تھے کہ حکومت آزادی کشمیر کے لیے موزوں اقدامات نہیں کر رہی۔ یہ بغاوت ناکام رہی اور اکبر خان کورٹ مارشل کا نشانہ بن گئے۔

پہاڑوں کی کثرت، مقامی راستوں سے آگاہی اور مختصر سپلائی لائنوں سے فائدہ اٹھا کر پونچھیوں اور میرپوریوں پر مشتمل فوج تیزی سے ریاست کے علاقے فتح کرنے لگی۔ حتیٰ کہ ۲۲ر ستمبر ۱۹۴۷ء کو میجر جنرل سکاٹ نے ہری سنگھ کو خبر دی کہ مجاہدین ریاست کے وسیع رقبے پر قابض ہو چکے۔

۴ر ستمبر ۱۹۴۷ء کے بعد وادی پونچھ میں بغاوت کی خبریں مختلف اخبارات خصوصاً سول اینڈ ملٹری گزٹ، دی ٹائمز (لندن) اور ٹائمز آف انڈیا میں شائع ہونے لگیں۔ یہ سبھی خبریں عیاں کرتی ہیں کہ کشمیری مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد ڈوگرا حکومت کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئی۔

چناں چہ ۲۲ر اکتوبر ۱۹۴۷ء کو جب صوبہ سرحد کے پختونوں کا لشکر جموں و کشمیر میں داخل ہوا، تو کشمیری مجاہدین ریاست کے وسیع رقبے پر اپنی حکومت قائم کر چکے تھے۔

درج بالا حقائق سے عیاں ہے کہ ریاست میں بغاوت کا آغاز پاکستان نے نہیں کیا، بلکہ اس کی بنیاد خود کشمیریوں نے رکھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ تحریک آزادی کو جموں اور سری نگر تک نہیں پہنچا پائے۔ چناں چہ بھارتی افواج کو ریاست کے بڑے رقبے پر قبضہ کرنے کا موقع مل گیا۔

◆◆◆

جلال الدین رومیؒ نے کہا

☆محسن دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں مگر ان کے احسانات باقی رہ جاتے ہیں، خوش نصیب ہے وہ جس نے احسان کی روش اختیار کی۔

☆انسان پر اگر عقل غالب ہو تو وہ فرشتوں سے بڑھ اور اگر شہوت غالب ہو تو چوپایوں سے بھی نیچے گر جاتا ہے۔

☆ ظالم مظلوم کی دنیا بگاڑتا ہے اور اپنی عاقبت۔

☆ایمان کو دلوں کے صدق سے تازہ کرو نہ کہ زبانی اقرار سے۔

☆ جب تک ہوائے نفس تازہ ہے، ایمان تازہ نہیں ہو سکتا۔

☆ جب کوئی سننے والا نہ ہو تو خاموش رہنا اور حرفِ لطیف کو نااہل سے پوشیدہ رکھنا ہی بہتر ہے۔

☆معدے (شکم) کو چھوڑ کر دل کی طرف آ تا کہ تجھ پر خدا کی طرف سے سلامتی نازل ہو۔

(انتخاب: فاطمہ سعد، واہ کینٹ)

http://www.bookstube.net
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

شاہانی صاحب وفورِ جذبات میں بولتے چلے گئے۔ ''صفیہ، ابھی مجھے آئے ایک ماہ بھی نہیں ہوا، سامان کی پیکنگ بھی نہیں کھلی اور میرا عملہ ابھی ہی سے مجھے کہتا ہے ''سر! آپ جیسا افسر ہم نے پہلے نہیں دیکھا۔ صرف میرا عملہ ہی نہیں بلکہ شہر سے جو بھی ملنے آئے، اسی طرح تعریف میں لتھڑا ہوتا ہے۔''

صفیہ بیگم شاہانی صاحب کی نکٹائی کی گرہ کھولتے کھولتے ہنس پڑیں۔ بولیں ''جانے بھی دیں۔ یہ سب چاپلوسیاں چڑھتے سورج کو سلام ہیں۔ اس سے پہلے جب آپ کھڈے لائن لگے ہوئے تھے، تو کتنے لوگ آپ کو ملنے آتے تھے؟''

شاہانی صاحب جھنجھلا سے گئے۔ بولے ''تم سب بیویاں ایک سی ہوتی ہو۔ شوہر کی تعریف تو برداشت ہی نہیں ہوتی۔ جذبی میاں نے تو اس روز کیا خوب کہا کہ حضور جان کی امان پاؤں تو ایک گستاخی سرزد کرنے کی اجازت چاہوں گا۔'' شاہانی صاحب نے آواز بدلتے ہوئے اپنے سیکرٹری کے انداز کی نقل اتاری۔ پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولے۔ ''اس پر میں شرمندہ ہو گیا۔ ایک تو جذبی میاں اتنے وفادار اور تابعدار ہیں کہ انسان اپنے آپ کو خود ہی میں بہت بڑا محسوس کرنے لگتا ہے۔''

''کیا بکا جذبی نے؟'' صفیہ بیگم پھنکاریں۔

''بے چارے نے کہنا کیا تھا۔ بس اتنا کہا عالیجاہ! میرا تمام عمر کا تجربہ ایک بات کی گواہی دیتا ہے اور وہ یہ کہ تمام بیویاں اپنے شوہروں کو کہتی ہیں، یہ میں ہی تھی جو اب تک آپ کے ساتھ گزارا کر گئی۔ کسی اور عورت میں نہ تو اتنی ہمت ہے اور نہ ہی اتنی برداشت کہ آپ کے ساتھ گزارا کرتی۔ پھر بات کر کے شوہر کے سر پر آن بیٹھتی ہیں۔'' شاہانی صاحب ہنس پڑے۔

صفیہ بیگم تیوری

سدا نہ باغیں بلبل بولے، سدا نہ موج بہاراں

افسرِ اعلیٰ

ایک خوش فہم کا ماجرائے غم، اُسے پل کی خبر نہ تھی مگر سامان سو برس والا بنانے چل پڑا

عرفان جاوید

http://www.booksstube.net
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

چڑھاتے ہوئے بولیں ''جذبی نے یہ تو بکنا ہی تھا۔ بے چارے کی پہلی بیوی ایک نمبردار کے ساتھ جو بھاگ گئی۔ دوسری نے ویسے ہی خلع لے لیا اور تیسری دو سال سے ایسی اپنے میکے گئی ہے کہ آج تک واپس نہیں لوٹی۔''

شاہانی صاحب لباس بدلتے بدلتے رک گئے۔ پوچھا ''تمھیں ان سب تفصیلات کا کیسے علم ہوا؟''

''مجھے اس مردود کے اور بھی کارنامے معلوم ہیں۔ بھنگن نے نہ صرف جذبی کے کارنامے سنائے بلکہ اس میسنے مالی کے کرتوت بھی بتائے، شکل سے مسکین لگتا ہے اور ہر وقت سر جھکا باڑ تراشنے میں لگا رہتا ہے۔ ہائے اللہ یہ مرد اندر سے کتنے پکے ہوتے ہیں۔'' صفیہ بیگم بناوٹی غصے سے بولیں۔ پھر میاں کے تیور بدلتے دیکھ کر کہنے لگیں۔ ''سوائے آپ کے۔''

شاہانی صاحب اس پر مصنوعی خفگی سے بولے ''اب بناؤ مت اور جا کر کھانا لگواؤ۔ آج کا سارا دن تو اپنی تعریفیں سننے میں کٹ گیا۔''

☆☆

باہر بھنگن اور مالی کانا پھوسی میں مصروف تھے۔

''بشیراں! صاحب کا اتنا سامان آیا ہے کہ لگتا ہے، پچھلی بدلیوں میں اچھا مال پانی بنا چکے۔'' یک چشم مالی گویا دانائی کی کوئی بات کہتے ہوئے سر ہلا رہا تھا۔

''ارے نہیں، بیگم صاحبہ نے مجھے خود بتایا ہے کہ پیچھے صاحب کے مربعے ہیں۔ تو فٹ ہر بات میں کوئی نہ کوئی غلط چیز نکال لیتا ہے۔'' بشیراں نے صفائی پیش کی۔

''تو کتنی بھولی ہے بشیراں۔ یہ مربے شربے سب جھوٹ ہیں۔ بھلا رب کو سب مربعے صاحب لوگوں ہی کو دینے تھے اور ہمیں ؟ موکھوتی ملنا تھی۔''

''او جیرے، یہ کھوتی سے تیرا مطبل کیا ہے'' بشیراں غصے سے بولی۔

''ایک تو تو ہر بات اپنی طرف لے جاتی ہے۔ تم ان پڑھ لوگوں میں عقل بہت کم ہوتی ہے۔ اور پھر تو میری ہوئی ہی کب ہے؟'' دو جماعت پاس جیرا بشیراں کو چھیڑتے ہوئے بولا۔

بشیراں شرما گئی۔ ''اب کے مجھے کچھ کہا نا تو تیرے باپے کو بتا دوں گی۔'' یہ کہہ کر بشیراں پیر پٹختی چلی گئی۔

جیرا واہیات انداز میں زیر لب مسکراتا رہا۔

☆☆

ڈرائنگ روم میں کھانا لگ چکا تھا۔ شاہانی صاحب تازہ دم ہو کر میز پر آ بیٹھے اور صفیہ بیگم سے محو گفتگو تھے۔

''صفیہ، ضلع پہلی مرتبہ ملا ہے۔ اس سے پہلے ساری زندگی بس دفتروں ہی میں گزار دی۔ انسان کے لیے تو یہ افسری بھی ایک امتحان ہے۔ اگر سر کو چڑھ جائے، تو نشے کی لت ہے اور اگر نہ چڑھے...... پر کیسے نہ چڑھے؟ جب سارا شہر افسر کے اشاروں کا منتظر ہو، ہر دوسرا صاحب حیثیت آدمی آپ کو اپنے گھر کھانے پر بلانے میں عزت محسوس کرے، تمام سرکاری محکموں کے سربراہ ضلع افسر کے پاس آئیں، تو اپنی اہمیت کا احساس نہ چاہتے ہوئے بھی ہو ہی جاتا ہے۔''

''مگر وہ پہلے والی بات تو نہیں۔'' صفیہ بیگم نے اعتراض کیا۔

''ہاں وہ پہلے والی بات، تو نہیں جب تمام اختیارات افسر اعلیٰ کے پاس ہوتے تھے۔ بلکہ پولیس والے بھی اسی کو جوابدہ ہوتے۔ وہ کروفر نہ سہی پھر بھی دوسری ملازمتوں سے بہت بہتر ہے۔'' شاہانی صاحب نے توجیہہ پیش کی۔

اس پر صفیہ بیگم بولیں۔ ''مگر یہ سیاستدان مجھے زہر لگتے ہیں۔''

http://www.bookstube.net
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

"دیکھو صفیہ، نشیب و فراز تو ملازمت کا حصہ ہیں۔ یہ لوگ کون سے مستقل ہیں، یہ آج ہیں کل نہ ہوں گے۔ پھر حکومتیں تو بدلتی رہتی ہیں اور ان کی پالیسیاں بھی۔ آخر حکومت کا حکم سرکاری افسر کے سہارے کے بغیر اس پسماندہ معاشرے میں کیسے کارگر ہو سکتا ہے؟" شاہانی صاحب بات کی گہرائی میں گم ہو گئے۔

"چیف صاحب کی بیوی اس روز شام کی چائے پر کہہ تو رہی تھیں کہ پرانے نظام کو اس حد تک بگاڑ دیا گیا کہ یہ ناقابل اصلاح ہو چکا۔ اس کی مستقبل میں جتنی بھی پلاسٹک سرجری کر لی جائے، یہ واپس اپنی تازگی دوبارہ حاصل نہیں کر سکتا۔" صفیہ بیگم افسردگی سے بولیں۔

"کہتی تو وہ سچ ہیں مگر جو ہاتھ میں ہے، کم از کم اس کی تو قدر کرنا چاہیے۔ بے وجہ کی پریشانیاں تو ویسے بھی صحت کے لیے ٹھیک نہیں۔" شاہانی صاحب نے گویا بات ہی ختم کر دی۔

ضلع کے مالک کی ترکیب کا استعمال اس کثرت سے ہوتا کہ شاہانی صاحب کبھی کبھار اپنے آپ کو واقعی بادشاہ سمجھ بیٹھتے اور خلقت کو رعایا۔

☆☆

جذبی میاں کہنے کو تو شاہانی صاحب کے سیکرٹری تھے، مگر تھے گرگِ باراں دیدہ۔ اگر اکبر کے دور میں پیدا ہوتے تو یقیناً نورتنوں میں جگہ پاتے۔ اپنے افسر کے سامنے بچھ بچھ جاتے۔ اتنے فرشی سلام کرتے کہ بعض اوقات ان کی حرکات و سکنات مضحکہ خیز ہو جاتیں۔ شاعری کا شوق رکھتے اور بے وزن اشعار بھی کہتے تھے۔ مگر ثقیل تراکیب و الفاظ کا زیادہ تر استعمال افسرانِ بالا کو رجھانے میں ہوتا۔

"حضور کی شان کے کیا کہنے۔" وہ دہرے ہوئے جاتے۔

"حاکم ضلع کے حکم سے انکار کس کافر کو ہے۔ آپ جناب تو ٹھہرے ضلع کے مالک۔" وہ کورنش بجالاتے۔

ضلع کے مالک کی ترکیب کا استعمال اس کثرت سے ہوتا کہ شاہانی صاحب کبھی کبھار اپنے آپ کو واقعی بادشاہ سمجھ بیٹھتے اور خلقت کو رعایا۔ اس تمام تخیلاتی نظام میں جذبی میاں بھی خلعت پہنے منصب دار نظر آتے۔

مگر چونکہ شاہانی صاحب طبعاً عاجز واقع ہوئے تھے، اس لیے بہت جلد تکبر کے احساس سے چھٹکارا پا لیتے۔ بس کبھی کبھار صفیہ بیگم کو چھیڑ دیتے "ارے بھئی ہم تو ٹھہرے ضلع کے مالک، تو کیوں نہ اپنی رعایا میں سے کوئی حسین نازنین حرم میں داخل کر لیں۔ تمھاری خوب خدمت کرے گی۔" پھر دیر تک ہنستے رہتے۔

ایسے میں صفیہ بیگم جل بھن کر کباب ہو جاتیں۔

شاہانی صاحب کی شخصیت کا ایک پہلو قابل ستائش تھا۔ وہ واقعی دل سے ضلع کی ترقی کے خواہاں تھے۔ گرانٹ تو مقرر کر دی گئی تھی۔ ترقیاتی منصوبے ایک حد سے بڑھ نہیں سکتے تھے، مگر انتظامی امور میں اصلاح کی بہت گنجائش تھی۔ اس کے علاوہ بہت سے کام عدم توجہی کے باعث تعطل میں پڑے تھے۔ بہت سی چھوٹی چھوٹی چیزیں متنازع امور کے باعث پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ پائی تھیں۔ شاہانی صاحب نے رات گئے تک میٹنگیں بلانی شروع کر دیں۔ اداروں کے باہمی تعاون کو مضبوط بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے کام کا آغاز کیا۔ مختلف گروہوں میں رنجشیں ختم کرا کے زیرِ التوا امور نمٹائے۔ ٹھیکیداروں کے مسائل کی جانب توجہ کی تاکہ ترقیاتی منصوبوں پر عملدرآمد زیادہ تندہی سے ہو سکے۔ ان اقدامات سے جہاں ان کی وقعت میں اضافہ ہوا وہیں جذبی میاں دہرے ہو ہو کر گویا کمر درد کے مستقل مریض بن گئے۔

http://www.bookstube.net/

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

اسی دوران شاہانی صاحب کو ایک ذاتی صدمے سے دوچار ہونا پڑا۔ ان کی والدہ فوت ہوگئیں۔ بچے دادی کے پاس ہی صوبائی دارالحکومت میں بغرض تعلیم مقیم تھے۔ ان دنوں وہ بیٹے کے پاس آئی ہوئی تھیں کہ دورہ دل برداشت نہ کر پائیں۔ والدہ کی وفات پر پورا شہر تعزیت کے لیے امڈ آیا۔ چھوٹا شہر تھا، خبر جلد پھیل گئی۔ جذبی میاں کا رو رو کر برا حال تھا۔ ہچکیاں لے لے کر ان کا گلا بیٹھ چکا تھا۔

جنازے میں سیکڑوں افراد شریک ہوئے۔ شدت غم سے نڈھال شاہانی صاحب کے دل میں ایک چھوٹا سا شگوفہ مسرت بھی کھل اٹھا۔ کئی لوگ ان کے غم میں شریک ہونے صوبائی دارالحکومت سے بھی آئے تھے۔

دفناتے وقت جذبی میاں خود قبر میں اترے۔ قبر میں لیٹ کر اس کی لمبائی چوڑائی کا حساب لگایا۔ پھر روتے ہوئے اس احتیاط سے جسد خاکی کو قبر میں اتارا کہ شاہانی صاحب کے دل میں ان کا مقام کئی درجے بڑھ گیا۔ وقت سب سے بڑا مرہم ہے، بہت سے زخم کو بھر دیتا ہے اور پھر دنیا کے لیے جینا بھی تو پڑتا ہے۔ یہ سوچ کر شاہانی صاحب بجھے دل کے ساتھ ضلع میں لوٹ آئے اور مصروفیات میں اپنے آپ کو مگن کر لیا۔

لمحے دنوں میں اور دن ہفتوں میں بدلنے لگے۔ ضلع کا کام معمول کے مطابق چلتا رہا۔ شاہانی صاحب نے ضلعی عملے کے لیے چند منصوبوں پر عملی کام شروع کرایا۔ ان میں سرفہرست رہائشی کالونی کا منصوبہ تھا جو مدتوں سے کھٹائی میں پڑا ہوا تھا۔ منصوبے کے اجرا کی دیر تھی کہ شاہانی صاحب کو گویا پھولوں میں تول دیا گیا۔ عملے کا ہر رکن ان کے گن گانے لگا۔ ان تک ستائش کی خبریں نمک مرچ لگا کر پیش کی جاتیں۔ خوشی سے ان کا دل پھول کر کپا ہو جاتا۔

"دیکھو بیگم! میں تاریخ رقم کر رہا ہوں۔ ہاؤسنگ پروگرام کی افتتاحی تختی پر میرا نام لکھا گیا اور رسم آغاز بھی مجھ سے کرائی گئی۔ چلو کل کو کہیں اور تبادلہ ہو جاتا ہے، تو بھی ایک نشانی رہے گی۔ اور پھر نشانی سنگ مرمر کا پتھر نہیں بلکہ وہ محبت ہے جو عملے کے ہر فرد بلکہ ضلع بھر کے لوگوں کے دلوں پر نقش ہو چکی۔" شاہانی صاحب اپنی عظمت کے احساس سے معمور جذبے میں بولتے۔

وہ سمجھاتیں "میں آپ کی دل شکنی نہیں کرنا چاہتی۔ لیکن ایسی کتنی ہی تختیاں پہلے بھی لگیں اور ٹوٹ پھوٹ گئیں۔ آپ نے کوئی انوکھا کام تو نہیں کیا۔ سرکاری ملازم ہیں، ذمے داری دی گئی تھی، احسن طریقے سے کر رہے ہیں۔ اور بس۔"

وہ جل جاتے۔ "ایک تو تم سے میری تعریف برداشت نہیں ہوتی۔ ارے بھئی یہ خوشامد نہیں۔ ایک شخص کی بات بھی نہیں، ہر زبان کہتی ہے۔ اب سب مل کر جھوٹ بولنے سے تو رہے۔ اور تم اپنی مایوسی کی باتیں دل ہی میں رکھا کرو۔"

ایک مرتبہ وہ بہت مسرور تھے۔ رات کو مطالعے کے بعد لیمپ کی روشنی گل کرتے ہوئے بیگم سے کہنے لگے۔

"آج ایم این اے آیا تھا۔ بہت مضبوط آدمی ہے۔ ہر کابینہ میں اس کے گروہ کا کوئی ایک وزیر ضرور ہوتا ہے۔ کہہ رہا تھا، کسی طرح اپنا ڈومیسائل اور ووٹ یہیں کا بنوا لیں۔ کل کو الیکشن لڑنے کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ آخر علاقے کے لوگ مجھے یہاں سے جانے نہیں دیں گے۔ پھر سرکاری نوکری بھی کوئی نوکری ہے، وہی لگی بندھی زندگی۔ سوچتا ہوں، وقت سے پہلے ریٹائرمنٹ لے کر یہیں سے الیکشن لڑوں۔ آخر مقبولیت اور عوامی پسندیدگی کو درست وقت پر کیش کرانا ہی تو اچھے سیاستدان کی خوبی ہے۔"

http://www.bookstube.net/

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

صفیہ بیگم کے مدھم خراٹوں کی آواز میں ان کی بات بیچ ہی میں رہ گئی۔

☆☆

وہ ایک گرم رات تھی۔ شناور خان نے جسے اس کے یار دوست ذومعنی انداز میں دل پشوری خان بھی کہتے تھے، ٹرک ہوٹل پر کھڑا کیا اور تھکاوٹ دور کرنے کے ارادے سے اتر آیا۔ وہ صبح پہاڑی علاقے سے پتھر لے کر چلا تھا۔ پتھر بھاری تھا، اس لیے ٹرک پر بوجھ بھی زیادہ ہو گیا۔ رستے کی سڑک بھی ہموار نہ تھی۔ اس پر مستزاد یہ کہ سڑک پر موڑ بھی بہت تھے۔ وہ ٹرک کو چیونٹی کی رفتار سے چلاتا لایا تھا۔ اس اعصاب شکن سفر سے اس کا دماغ چٹخ گیا۔ اب اسے آرام کی ضرورت تھی اور آرام کا انتظام اس دلبر ہزارہ ہوٹل سے زیادہ بہتر کہیں اور نہ تھا۔

چائے کی گرم گرم کڑک دار پیالی پینے کے بعد پشاور خان نے اپنے جانے پہچانے لڑکے کو اشارہ کیا۔ لڑکا اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد واپس آیا، تو آرام کا مکمل ”انتظام“ اس کی جیب میں تھا۔ انتظام کو جلا اور ریزہ ریزہ کر کے تمباکو کے ساتھ پشاور خان نے خالی کی ہوئی سگریٹ میں بھر لیا۔ ایک گہرا کش لے کر اس نے نعرۂ کوچ بلند کیا اور چھلانگ لگا کر ٹرک پر سوار ہو گیا۔ گڑگڑاہٹ کی آواز کے ساتھ ٹرک اسٹارٹ ہوا اور رینگنے لگا۔

☆☆

شاہانی صاحب کی صبح ضروری میٹنگ تھی۔ انھیں ہر حال میں ضلع واپس پہنچنا تھا۔ لیکن گاڑی کا ٹائر بھی رات کے اسی لمحے پنکچر ہونا تھا۔ ڈرائیور ٹائر بدل رہا تھا اور وہ بے چینی میں سڑک پر ٹہل رہے تھے۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ گاڑی سے کافی دور نکل گئے۔ انھیں کسی ان دیکھے خطرے کا سا احساس ہوا، تو وہ تیزی سے واپس مڑے۔ اسی دوران ہلکی گڑگڑاہٹ سے ڈھلوان پر پھسلتا ٹرک ان کے اوپر سے گزر گیا۔ ٹرک کے اندر گانے لگے ہوئے تھے۔ ڈرائیور لہر میں تھا۔ یکدم اس نے گھبرا کر پہلو کی طرف دیکھا، کلینر گہری نیند میں تھا۔ ڈرائیور نے خوف کے زیر اثر ایکسیلیٹر پر دباؤ اور بھی بڑھا دیا۔

جب تک شاہانی صاحب کی لاش علاقائی اسپتال پہنچی سب ڈاکٹر چھٹی کر چکے تھے۔ ویسے بھی جب وہاں زندوں کو پوچھنے والا کوئی نہ تھا تو لاش کا کوئی کیا کرتا؟

اگلی صبح ضلع بھر میں یہ اطلاع بہت دکھ سے سنی گئی۔ اخبار میں حادثے کی خبر نمایاں طور پر شائع ہوئی۔ صفیہ بیگم کو پچھاڑیں کھاتے کھاتے صبر آ ہی گیا۔ قریبی احباب سے مشورے کے بعد فیصلہ کیا گیا کہ انھیں ایک روز کے وقفے سے صوبائی دارالحکومت میں والدہ کے پہلو میں دفنایا جائے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کی شرکت یقینی ہو سکے۔ اسی دوران نہ صرف نئے ضلع افسر کی تعیناتی کا نوٹیفکیشن جاری ہوا بلکہ اس نے فوری آنے کا عندیہ بھی عملے کو دے دیا۔

جب مٹھی بھر افراد شاہانی صاحب کی میت جنازہ گاہ پہنچے، تو وہاں محض درجن لوگ موجود تھے۔ تھوڑی دیر انتظار کیا گیا۔ پھر صفیں باندھ لی گئیں۔

ادھر میاں جنڈی عملے کو ہدایات دے رہے تھے۔ ”دیکھنا بھائی، وہ تختی تو فوراً اتروا دو۔ ابھی تو بنیادوں کی کھدائی بھی شروع نہیں ہوئی۔ پھر سنا ہے، نئے صاحب طبیعت کے بہت تیز ہیں، کہیں برا نہ مان جائیں۔ مرحوم بہت خوبیوں کے مالک تھے، مگر تھے بہت خوشامد پسند! اور ہاں دفتر کے باہر وہ استقبالی بینر لگوانا نہ بھولنا۔“

عمائدین شہر بھی نئے افسر کے استقبال کی تیاریوں میں مصروف تھے، اس لیے شاہانی صاحب کے جنازے میں شریک نہ ہو سکے۔

◆●●

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

مغربی استعمار کی انوکھی ایجاد

پانی سے تشدد

ٹارچر کے جس خوفناک و غیر انسانی طریق کار کو ہسپانیوں نے اپنایا' امریکی جدتیں کر کے اُسے بامِ عروج پہ لے گئے

ابوصارم

ہماری روزمرہ زندگی میں پانی اتنی بے وقعت شے ہے کہ جب ہمیں پیاس لگے، تبھی وہ یاد آتا ہے۔ لیکن یہی معمولی شے جب ظالموں کے ہاتھ لگ جائے، تو وہ اسے ظلم کا انوکھا ہتھیار بنا لیتے ہیں۔ یہی سچائی پچھلے دنوں سامنے آئی۔

واقعہ ۹/۱۱ کے بعد امریکی خفیہ ایجنسی سی آئی اے نے افغانستان، پاکستان، یمن اور دیگر اسلامی ممالک سے سیکڑوں مسلمان ''دہشت گرد'' قرار دے کر پکڑ لیے تھے۔ ان سے پھر مختلف تفتیشی مراکز میں تفتیش کی گئی۔ مدعا القاعدہ کی سرگرمیوں کے بارے میں جاننا تھا۔ دورانِ تفتیش افسران سی آئی اے نے تشدد کے مختلف طریقے بھی آزمائے۔ ان میں سب سے مقبول ''پانی کا تشدد'' (Water Torture) اور ''پانی تختہ'' (Water boarding) رہے۔

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

۹ر دسمبر ۲۰۱۴ء کو امریکی سینٹ کی انٹیلی جنس کمیٹی نے سی آئی اے کے تشدد سے متعلق اپنی تحقیقاتی رپورٹ جاری کی۔ اس میں افشا کیا گیا کہ کئی نظر بند مسلمان تفتیشی مراحل میں پانی کے تشدد کا نشانہ بنے۔ گویا بظاہر انسانی حقوق کے نام لیوا امریکیوں نے ان کے ساتھ اذیت ناک سلوک روا رکھا۔

تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ باقاعدہ طور پر ''ہسپانوی احتساب عدالتوں'' (Spanish Inquisition) میں پانی کو بطور تشدد کے ہتھیار اپنایا گیا۔ یاد رہے، یہ عدالتیں یکم نومبر ۱۴۷۸ء میں قائم کی گئیں۔ ان کا مقصد اندلس میں مقیم مسلمانوں پر مقدمے چلانا اور انھیں تشدد کا نشانہ بنانا تھا۔ ان عدالتوں کی کارروائی کے دوران سیکڑوں مسلمان شہید کر دیے گئے۔

ہسپانوی جلادوں نے بھی پانی کو بطور ہتھیار اپنا لیا۔ وہ ایک تختے پر ''ملزم'' کو رسیوں سے باندھتے۔ پھر اس کے منہ میں پانی ڈالتے چلے جاتے۔ پانی پی پی کر بچارا انسان ہلکان ہو جاتا۔ کئی مرد و زن اس خوفناک ٹارچر کی تاب نہ لا پاتے اور چل بستے۔ یاد رہے، جسم میں پانی کی زیادتی زہریلے اثرات پیدا کر دیتی ہے۔

ہسپانیوں نے رفتہ رفتہ پانی کے تشدد کو موثر بنانے کے لیے آلات بھی ایجاد کر لیے۔ یہ آلات انسان کا منہ کھلا رکھنے میں کام آتے۔ بعدازاں دیگر مغربی اقوام نے بھی پانی کو بطور تشدد استعمال کیا جن میں فرانسیسی قابل ذکر ہیں۔ انسانوں کو اذیت دینے کا یہ خوفناک طریقہ اوائل بیسویں صدی میں نام نہاد مہذب امریکیوں نے بھی اپنا لیا۔

ایک مورو مجاہد جس نے تلوار سے امریکی بندوقوں کا مقابلہ کیا

کیوبا سے فلپائن تک

ہوا یہ کہ انیسویں صدی کے اواخر میں اسپین کی نوآبادی، کیوبا میں ہسپانوی آقاؤں کے خلاف تحریک آزادی چل پڑی۔ اس زمانے (۱۸۹۴ء) میں کیوبا کی ۹۰ فیصد مصنوعات کے خریدار امریکی تھے، نیز ملک اپنی ۴۰ فیصد درآمدات امریکا سے منگواتا تھا۔ اس لیے ۱۸۹۵ء میں کیوبن تحریک آزادی شروع ہوئی، تو امریکی حکومت نے کیوبنوں کا ساتھ دیا۔ مقصد یہی تھا کہ کیوبا سے منسلک اپنے معاشی مفادات کا تحفظ کیا جا سکے۔

۱۵ر فروری ۱۸۹۸ء کو کیوبا کی ہوانا بندرگاہ پر لنگرانداز امریکی بحری جہاز میں پراسرار دھماکا ہوا اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے ڈوب گیا۔ اندرونی ذرائع کا کہنا ہے کہ یہ دھماکا امریکی حکومت نے خود کرایا تاکہ اسپین پر حملے کا جواز مہیا ہو سکے۔ چناں چہ اس واقعے کو بنیاد بنا کر امریکا نے ۲۵ر اپریل کو اسپین پر دھاوا بول دیا۔ یہ جنگ ۱۲ر اگست ۱۸۹۸ء تک لڑی گئی۔

اس دوران امریکیوں نے اسپین کی نوآبادیوں..... فلپائن، کیوبا، پورٹوریکو، فلپائن اور گوام (Guam) پر قبضہ کر لیا۔ ہسپانوی شکست کھا کر اپنی مملکت تک محدود ہو گئے۔

امریکا نے کیوبا کو تو آزادی دے دی..... کیونکہ وہ پوری طرح اس کی مٹھی میں تھا۔ مگر حریت پسندی کے دعویداروں نے فلپائن، پورٹوریکو اور گوام کو اپنی نوآبادی بنا لیا۔ یوں امریکا کا سفید فام حکمران طبقہ اب نوآبادیاتی

http://www.bookstube.net/

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

طاقت بن بیٹھا اور دوسری اقوام کا استحصال کرنے لگا۔

اُدھر فلپائن میں ۱۸۹۶ء سے ہسپانوی آقاؤں کے خلاف تحریک آزادی جاری تھی۔ اس میں مورو مسلمان بھی شریک تھے۔ وہ اپنے علاقوں میں خودمختار اسلامی مملکت قائم کرنا چاہتے تھے۔ اب فلپائنی اپنے نئے مالکوں...... امریکیوں سے نبردآزما ہو گئے۔

طاقت کے نشے میں سرشار امریکی فوج نے فلپائن کے عوام پر جو مظالم ڈھائے، وہ انسانی تاریخ کا انتہائی سیاہ باب ہیں۔ امریکی حکمران طبقے نے ۱۸۹۹ء تا ۱۹۰۶ء کے دوران فلپائنیوں کو شکست دی اور پھر جنگ عظیم دوم تک فلپائن کو نوآبادی بنائے رکھا۔ اس دوران امریکی حکومت فلپائن کے وسائل سے جی بھر کر استفادہ کرتی رہی۔

اسپین اور فلپائن کے خلاف جنگوں سے امریکا میں جنگی صنعت خوب پھلی پھولی اور اس سے وابستہ سیکڑوں کارخانوں نے خوب منافع کمایا۔ نیز نئی ملازمتوں نے جنم لیا۔ یوں امریکی حکومت کو احساس ہوا کہ جنگ معاشی سرگرمیوں کو فروغ دیتی ہے۔ اسی امر نے امریکی حکمران طبقے کو اکسایا کہ وہ نت نئی جنگیں چھیڑ کر خوب دولت کمائے...... اور یہ چلن اب تک چلا آ رہا ہے۔

فلپائنیوں سے لڑتے ہوئے ہی امریکی فوجیوں نے پانی کو بطور تشدد کا ہتھیار برتا۔ وہ انھیں پانی پلا پلا کر مار ڈالتے یا پھر پانی تختے پر تختہ مشق بناتے۔ اس طریق کار

امریکا کا سفید فام طبقہ

ہمارے ہاں مشہور ہے کہ آزادی، جمہوریت اور انسانی حقوق کے نظریات نے امریکا میں جنم لیا۔ مگر تاریخی حقائق پر نگاہ دوڑائی جائے، تو انکشاف ہوتا ہے کہ یہ وہ دروغ گوئی ہے جو خصوصاً امریکی حکمران طبقے کے جرائم پوشیدہ رکھنے کی خاطر بولی گئی۔

امریکا کے اصل حکمران ریڈانڈین تھے۔ جب سولھویں صدی میں برطانوی آبادکار امریکا پہنچے، تو انھوں نے اسلحے کے زور پر ریڈانڈینوں کی زمینوں پر قبضہ کر لیا۔ ریڈانڈینوں نے زبردست تحریک آزادی چلائی، مگر جدید اسلحے کے سامنے بے بس رہے۔ امریکیوں نے وسیع پیمانے میں ان کا قتل عام کیا اور انھیں دوردراز علاقوں میں سمٹنے پر مجبور کر دیا۔

نئی سرزمین پر کھیتی باڑی اور دیگر کام کرنے کے لیے امریکیوں نے افریقہ سے ہزارہا غلام درآمد کیے۔ ان غلاموں کے ساتھ بھی حیوانوں جیسا سلوک کیا جاتا۔ ان پر تشدد کرنا عام تھا اور غیر انسانی ماحول میں افریقی غلاموں کی زندگیاں گزرتیں۔

امریکا رفتہ رفتہ برطانوی نوآبادی بن گیا۔ اس نئے ملک میں آباد ہونے والے برطانوی آبادکار اپنی مصنوعات برطانیہ بھجواتے تھے۔ جب برطانوی حکمران نے ان آبادکاروں پر نئے ٹیکس لگانے چاہے، تو انھوں نے بغاوت کر دی۔ یوں برطانوی حکومت اور امریکی آبادکاروں کے مابین اس لڑائی کا آغاز ہوا جسے ''جنگ آزادی'' کہا جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ جنگ امیر امریکی آبادکاروں کے معاشی و تجارتی مفادات کو تحفظ دینے کی خاطر لڑی گئی۔ اس کا آزادی و جمہوریت سے براہ راست کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ نظریات تو اس لیے گھڑے گئے تاکہ عام آبادکاروں کو اپنے ساتھ ملانے میں کامیابی مل جائے۔ چناں چہ متوسط و غریب طبقات نے انگریز فوج سے لڑ کر قربانیاں دیں اور امیر و بارسوخ امریکی طبقے کو نئی مملکت طشتری میں رکھ کر پیش کر دی۔

امریکی حکمران طبقہ پھر طمطراق سے حکمرانی کرنے لگا۔ اس نے پڑوسی ممالک سے جنگیں لڑیں، ان کے علاقوں پر قبضہ

http://www.bookstube.net/

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

میں قیدی کو تختے سے رسیوں سے باندھ کر اس کے منہ پر سوتی کپڑا رکھا جاتا ہے۔ جب گلاس سے کپڑے پر مسلسل پانی گرایا جائے، تو چند ہی لمحوں میں قیدی کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ ڈوب رہا ہے۔ چناں چہ وہ خوف و تکلیف سے چلانے لگتا ہے۔

مورو مسلمانوں کی تحریک آزادی

امریکیوں کی عسکری طاقت کے سامنے فلپائنی عیسائیوں نے تو ۱۹۰۲ء میں ہتھیار ڈال دیے۔ مگر جنوبی فلپائن میں مورو مسلمانوں نے حملہ آوروں کے خلاف ۱۹۱۳ء تک جہاد جاری رکھا۔ فلپائن میں امریکی سپاہ نے پورے پورے گاؤں جلا ڈالے اور خواتین و بچوں کو بھی نہیں بخشا۔

حریت پسندوں کی کمر توڑنے کے لیے امریکی فوج نے خاص جنگی حکمت عملی اپنائی جو ''زمین سوختہ'' (Scorched Earth) کہلاتی ہے۔ اس حکمت عملی کے تحت جنگ زدہ علاقے میں واقع ہر وہ شے..... گھر، درخت، جھاڑیاں، تالاب، کھیت وغیرہ جلا یا تباہ کر دیا جاتا ہے جو بقائے زندگی میں کام آسکے۔

جنگ کی کوریج کے لیے امریکی صحافی فلپائن پہنچ تو گئے، مگر ان کی رپورٹیں امریکا بھجوانے سے پہلے امریکی

کیا اور اپنی دولت و امارت بڑھانے لگا۔ امریکی سفید فام حکمران طبقے کو پہلی ضرب مارچ ۱۸۶۱ء میں لگی جب غریب طبقے سے تعلق رکھنے والے ابراہام لنکن عوامی حمایت کے بل بوتے پر صدر بن گئے۔ ابراہام لنکن خود پرورده وکیل تھے۔ انھوں نے ہمہ اقسام کی کتب کے علاوہ قرآن پاک کا بھی مطالعہ کیا تھا۔ یہ کتب ان یورپی فلسفیوں و دانش وروں نے لکھی تھیں جنھوں نے آزادی، جمہوریت اور انسانی حقوق کے نظریات قرآن پاک و احادیث نبوی ﷺ..... خصوصاً خطبہ حجتہ الوداع سے اخذ کیے تھے۔ ان نظریات کا جوہر یہ تھا: تمام انسان برابر ہیں اور ان میں برتری صرف باتقویٰ اور نیک لوگوں کو حاصل ہے۔

چناں چہ کئی انسان دوست عظیم الشان اسلامی نظریات یورپی مصنفین کے ذریعے ابراہام لنکن تک پہنچے۔ انھوں نے لنکن کو ایک بلند کردار کے مالک لیڈر میں ڈھال دیا۔ چناں چہ وہ اپنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر امریکی صدر بننے میں کامیاب رہے۔ صدر بنتے ہی انھوں نے امریکا سے غلامی ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔

یہ اعلان آمرانہ سفید فام حکمران طبقے پر بم بن کر پھٹا۔ چناں چہ اگلے ہی مہینے ان ریاستوں نے بغاوت کا اعلان کر دیا جہاں سیاہ فام غلاموں کی کثرت تھی۔ یوں امریکی خانہ جنگی کا آغاز ہوا جس میں چھے لاکھ سے زائد امریکی فوجی مارے گئے۔ اس جنگ کا موجب وہ سفید فام حکمران طبقہ بنا جو غلامی کا خاتمہ نہیں چاہتا تھا۔ ابراہام لنکن کامیاب رہے، مگر انھیں اپنی زندگی سے ہاتھ دھونے پڑے۔ اس سے پہلے کہ وہ مزید حکومتی اصلاحات سامنے لاتے، امریکی سفید فام حکمران طبقے نے انھیں قتل کرا دیا۔ یاد رہے، اس طبقے میں جرنیل، سرکاری افسر، سیاست دان، پادری، صنعت کار اور تاجر شامل ہیں۔

اس کے بعد امریکی حکومت دوبارہ درج بالا مفاداتی گروہ نے سنبھال لی اور وہ خود کو زیادہ طاقتور و بارسوخ بنانے لگا۔

دلچسپ بات یہ کہ ابراہام لنکن کے صدر بننے کے ٹھیک ایک سو سال بعد ۱۹۶۱ء میں ایک اور ایسا عوامی راہنما آیا جو حکمران طبقے کی آمریت ختم کرنا چاہتا تھا۔ لیکن محض تین سال بعد جان ایف کینیڈی کو بھی قتل کر دیا گیا۔ کینیڈی کا اصل جرم یہی تھا کہ اس نے اسٹیبلشمنٹ کے اشاروں پر چلنے سے انکار کر دیا۔

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

فوج کو بھجوائی جاتیں۔ وہاں رپورٹیں سنسر کے مراحل سے گزرتیں اور امریکی فوجیوں کے مظالم کی خوفناک داستانیں حذف کردی جاتیں۔

یہ تو خدا بھلا کرے ابراہام لنکن کے بچے کھچے ساتھیوں کا کہ انھوں نے امریکی استعمار کے خلاف امریکا میں ایک تنظیم، امریکن اینٹی امپیریلسٹ لیگ بنا لی۔ اس تنظیم سے مشہور ادیب، مارک ٹوین، سابق امریکی صدر، گروور کلیولینڈ اور سابق سینٹر کارل شرز بھی وابستہ تھے۔

اس امریکی تنظیم کے قائدین چاہتے تھے کہ امریکی حکومت استعمار کا روپ نہ دھارے اور فلپائن کو آزادی دے ڈالے۔ انھوں نے فلپائن پر قبضے کو آزادی کے امریکی اصولوں کی خلاف ورزی قرار دیا۔ لیکن افسوس کہ یہ تنظیم امریکی عوام میں مقبول نہیں ہوسکی۔ وجہ یہی ہے کہ جنگوں کی وجہ سے امریکی معاشرے میں خوشحالی آئی، تو رائے عامہ بھی ان کے حق میں ہوگئی۔

تاہم اینٹی امپیریلسٹ لیگ سے وابستہ اخبارات کے صحافی فلپائن میں امریکی فوجیوں کے مظالم کو نمایاں کرنے میں کامیاب رہے۔ مثال کے طور پر امریکی شہر فلاڈلفیا سے نکلنے والے اخبار، پبلک لیجر (Public Ledger) کے نامہ نگار نے منیلا سے لکھا:

''ہمارے فوجی بہت متحرک ہیں۔ وہ مردوں، عورتوں، بچوں اور قیدیوں کو بے دریغ قتل کررہے ہیں۔ امریکی فوج میں یہ خیال پھیل چکا کہ ایک فلپائنی اور کتے میں کوئی فرق نہیں۔''

امریکی فوج کے مظالم کی مزید خبریں فوجیوں کے خطوط سے ملتی ہیں۔ اکثر خطوط میں امریکی فوجیوں نے بڑے تلذذ سے فلپائنیوں کے قتل عام کا ذکر کیا۔ نیویارک کے ایک فوجی نے اپنے اہل خانہ کو لکھا:

''چند دن قبل ہم نے تتیاتیا گاؤں کا محاصرہ کر لیا۔ پچھلی رات فلپائنیوں نے شب خون مار کر ہمارا ایک ساتھی مار دیا۔ اگلی صبح جنرل لائڈ وہیٹن (سربراہ امریکی فوج) کی طرف سے حکم موصول ہوا کہ گاؤں جلا دیا جائے اور وہاں جو بھی ذی حس نظر آئے، اسے مار ڈالو۔ چناں چہ ہم نے صبح گاؤں کے اردگرد آگ لگا دی۔ جب گاؤں کے مکینوں نے فرار ہونا چاہا، تو ہم نے انھیں گولیوں سے بھون ڈالا۔ تقریباً ایک ہزار مرد، عورتیں اور بچے مارے گئے۔ لگتا ہے کہ میں سخت دل ہوگیا ہوں، کیونکہ جب بھی گندمی چمڑی والے کو دیکھ کر ٹریگر دباؤں، تو خوشی محسوس کرتا ہوں۔ (حوالہ انگریزی کتاب: ''The Benevolent Assimilation American Conquest of the Philipines'' (از سٹوارٹ کریٹسٹن ملر، شائع شدہ ۱۹۸۲ء)

مورو مسلمانوں کی تحریک آزادی میں بیس ہزار سے زائد مجاہدین نے جام شہادت نوش کیا۔ آخرکار اسلحہ ختم ہو جانے کے بعد مجبوراً انھیں تحریک ختم کرنا پڑی۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد امریکا نے فلپائن کو آزاد کر دیا۔ اب فلپائنی حکومت مورو مسلمانوں پر ظلم وستم کرنے لگی۔ ان مجبور و مقہور اسلامیوں کا دور ابتلا اب تک ختم نہیں ہوا۔

فلپائن میں امریکی فوجیوں نے جس وحشت و درندگی کا مظاہرہ کیا، وہی واقعہ ۱۱/۹ کے بعد سی آئی اے کے تفتیش کاروں نے دکھائی۔ انھوں نے مسلمانوں کو انسان نہیں سمجھا اور ان سے جانوروں سلوک کیا۔ اب بھی امریکی حکمران طبقہ انسانی حقوق، آزادی اور انصاف کا راگ الاپتا رہے، تو اسے پتھر دل اور بے حس ہی سمجھا جائے گا۔

http://www.bookstube.net/

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

جانے یہ کس کی جنگ ہے؟

بدلہ

ان بدقسمت والدین کا المناک ماجرا جن کی ساری خوشیوں کو انتقام کی آگ نے بھسم کر ڈالا

صالحہ محبوب

کبھی زندگی کا کوئی لمحہ ٹھہر جاتا ہے۔ دن بدلتے ہیں۔ تاریخ بھی بدلتی ہے۔ لوگ اور ان کے کام تبدیل ہوتے ہیں، مگر لمحے ساکت ہو جاتے ہیں۔ بڑی تکلیف دہ حالت ہوتی ہے ایسے لوگوں کی...... اچھے بھلے زندہ انسان جیتی جاگتی لاشوں میں بدل جاتے ہیں۔ سانس لیتے، عام کپڑے پہنے، بظاہر کھاتے پیتے، سوچتے سمجھتے، سنتے بولتے ہوئے زندہ لاشے۔ قبروں کے بجائے مکانوں میں بستے ہوئے۔ بے گوروکفن پڑے زندہ انسان...... ان کے لیے وقت ٹھہر جاتا ہے!

غلام محمد اور اس کا ہنستا بستا خوشحال گھرانا معمول کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ غلام محمد اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز پولیس افسر تھے۔ ان کی بیگم سادہ، پڑھی لکھی اور سمجھ دار خاتون خانہ تھیں۔ دورِ حاضر میں ایمانداری اور حلال کمائی میں گزارہ کرنے والا یہ یقیناً بے حد سچا اور پکا مسلمان گھرانا تھا۔

ماں باپ کی مکمل توجہ کا مرکز ان کے تینوں بیٹے ابوبکر، عمر اور عثمان تھے۔ اچھے اسکول، توجہ اور ماحول نے تینوں

http://www.bookstube.net
www.pdfbooksfree.pk

بچوں کو عمدہ طالب علم بنا دیا تھا۔ ماں باپ کی توجہ انھیں زندگی کے ہر میدان میں آگے بڑھنے میں مدد دیتی۔ غلام محمد کی اپنی زندگی مسلسل جہاد کا نام تھی۔ کرپشن اور محکمے کی غلط روایات کے خلاف اپنی ایمانداری اور سچائی برقرار رکھنے کی جہد مسلسل......!

میٹرک میں اعلیٰ نمبروں کے حصول اور اچھی جسمانی وضع کے لیے انھوں نے دونوں بڑے بیٹوں، ابوبکر اور عمر کو اعلیٰ کیڈٹ کالج میں داخل کرا دیا۔ دونوں بھائی اب نویں اور دسویں جماعت میں پڑھتے تھے۔ بیٹوں کی اعلیٰ کارکردگی غلام محمد کا سینہ فخر سے چوڑا کر دیتی۔ ذہین اور صالح بیٹے ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک تھے۔ ماں باپ اپنے بیٹوں کو حوصلہ افزائی کرتے اور گھرانا عام اور خوشگوار زندگی گزارتا۔

ملکی حالات، امن وامان کی خراب صورت حال پر شور مچاتے چینل، چیختے دہاڑتے اخبارات اور غلام محمد کی لمبی ڈیوٹیاں انھیں پریشان ضرور کرتیں، مگر وہ سب اپنی جنت میں خوش تھے۔ ہر ماہ پانچ دنوں کے لیے دونوں بیٹے آ کر ان کی خوشیوں میں اضافہ کر دیتے۔

غلام محمد کی بیگم سلیقہ مند ماں تھیں۔ وہ ابوبکر کی پسند کے سیخ کباب اور شامی کباب بناتیں، تو عمر کی پسندیدہ بریانی کیسے بھول جاتیں؟ عمر اور ابوبکر کی چھٹیوں سے پہلے ہی ان کا مصروف ہفتہ شروع ہو جاتا۔

اس ہفتے ابوبکر اپنے میٹرک امتحانات دے تین ماہ کے لیے فارغ ہو کر آ رہا تھا۔ عمر بھی نویں جماعت کے امتحان کی تیاری مکمل کر چکا تھا۔ وہ بھی چھٹیوں کے دو ہفتے اہل خانہ کے ساتھ گزارنا چاہتا تھا۔ ان کے کالج میں تو گرمیاں خاصی خوشگوار ہوتیں کہ وہ بلند مقام پر واقع تھا۔ ہوسٹل سے گھر جاتے ہوئے موسم کا فرق محسوس تو ہوتا

ہماری قلم کار

صائمہ محبوب اعلیٰ سرکاری افسر کی بیگم اور عمدہ کہانی کار ہیں۔ معاشرتی مسائل اور حالات حاضرہ کو بڑی عمدگی سے اپنی کہانیوں میں اجاگر کرتی ہیں۔ یہی نہیں، ہر اچھے لکھاری کی طرح باتوں باتوں میں مسائل کے حل بھی بیان کر دیتی ہیں۔ قارئین اردو ڈائجسٹ آپ کی تازہ تخلیقات پڑھتے اور انھیں سراہتے ہیں۔

تھا، مگر امی ابو اور چھوٹو عثمان کی منتظر نگاہیں اور خوشی سے بیقرار چہرے ہر احساس پر غالب آ جاتے۔

غلام محمد دو مرتبہ فون کر کے وین کی آمد کا وقت نوٹ کر چکے تھے۔ صبح سویرے فجر کے بعد سب کیڈٹس کو اپنے اپنے گھر روانہ ہونا تھا۔ تین گھنٹے سفر کے بعد دونوں بچے والدین کی ٹھنڈی چھاؤں کے زیر سایہ ہوتے۔ آج انھوں نے دفتر سے بھی چھٹی لے رکھی تھی۔ سارا دن بیٹوں کے ساتھ گپ شپ لگانے کا پروگرام تھا۔ بیگم ناشتے میں چنے اور پوریاں بنانے کی تیاریوں میں محو تھیں۔

چھوٹا عثمان یہ شکایت کر رہا تھا کہ بس دونوں بھائیوں ہی کے طفیل اسے بھی اچھا کھانا نصیب ہوتا ہے۔ تین گھنٹے بعد سب کا ارادہ مل کر ناشتا کرنے کا تھا۔ لیکن ایک فون نے سب کو چونکا دیا۔ فون کسی انجان نمبر سے تھا۔ شاید ابوبکر اور عمر کے کسی ہم جماعت کے والد کا...... ''ٹی وی کھولیں، کیڈٹس کی وینوں پر خودکش حملہ ہوا ہے۔''

وہ تینوں جلدی سے ٹی وی کے سامنے بیٹھ گئے۔ سارے چینلوں پر چیختی دہاڑتی ایمبولینسیں نظر آ رہی تھیں۔ راستے اور علاقے سب شناسا تھے۔ ''۱۰ سے

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

۱۴ کلوگرام بارودی مواد اس حملے میں استعمال ہوا ہے۔ ۷۰ سے زیادہ کیڈٹس موقع پر جاں بحق ہو گئے۔" بریکنگ نیوز چل رہی تھی۔

چاروں وینیں جو ایک دوسرے کے پیچھے تھیں، مکمل تباہ ہو گئیں۔ کیڈٹس کا سامان ہر طرف پھیلا تھا۔ میلے کپڑے، ادھ جلی جرابیں، بنیانیں، جوتے اور سوختہ کتابیں اور رجسٹر...... کسی کیمرا مین نے وہاں بکھری چیزوں میں ایک نظر کی عینک کو فوکس کیا۔ سب کے لیے وہ ایک عام سی جلی ہوئی عینک تھی مگر یہ ایک منظر غلام محمد کے لیے پوری کائنات بن گیا...... ان کی پوری زندگی، خوشیاں، امیدیں، خواہشیں نجانے کیا کیا! وہ بھلا عینک کیسے نہ پہچانتے...... جس کا انتخاب کرتے ہوئے وہ لوگ پورا دن بازار کی ہر دکان میں گئے تھے۔

ابوبکر کی ماں پھٹی پھٹی آنکھوں سے ٹی وی دیکھ رہی تھیں۔ آج تو اُن کا فون بھی مسلسل بج رہا تھا۔ آہستہ آہستہ محلے والے، دفتر کے لوگ، جان پہچان والے اور پھر رشتہ دار آنا شروع ہو گئے۔ غلام محمد اپنی گاڑی پر جائے حادثہ کی طرف روانہ ہو چکے تھے۔

آج وہ خبر نہ تھی، قیامت تھی پورے خاندان کے لیے! ایک صحافی کہہ رہا تھا کہ یہ ردعمل ہے۔ یہ وہ دہشت گردی ہے جس کا پاکستان کی عوام کو سامنا ہے۔ جانے یہ کس کی جنگ تھی جس میں ان کے دو معصوم بیٹے قربان ہو گئے۔

جانے کس نے کس کا بدلہ لیا جس میں ابوبکر اور عمر، دونوں شہید ہوئے۔ جانے دہشت گردوں کی بدلے کی آگ معصوم بچوں کو مارنے سے کیسے ٹھنڈی پڑ سکتی تھی؟ وہ سب تو چھٹیاں گزارنے اپنے گھر روانہ ہوئے تھے...... ساری رات اپنے گھروں کے سپنے دیکھتے، سامان باندھتے، دوستوں سے ہنسی مذاق کرتے، اپنے اچھے نتیجے کی امید اپنی آنکھوں میں لیے! وہ اس ملک کے ذہین، لائق اور ذہنی و جسمانی لحاظ سے بہترین بچے تھے۔

غلام محمد پر یہ سانحہ بیتے دن، ہفتے، مہینے اور سال بیت گئے۔ صبر کی کوششیں کرتے یہ ماں باپ زندہ لوگوں سے جیتی جاگتی لاشیں بن چکے۔ دونوں بیٹوں کی قربانی کے انجام سے بے خبر یہ سسکتے بلکتے اور خود پر ضبط کرتے والدین! کبھی کبھی ان کے زخموں کے کھرنڈ بھی بڑی بُری طرح نوچ دیے جاتے ہیں۔ جب ابوبکر کے میٹرک میں پوزیشن لینے کا اعلان ہوا، تو زخم ہرے ہو گئے۔

اور اب سقوطِ ڈھاکہ کے دن دہشت گردوں کا ایک اور بدلہ...... پھر بے شمار بچوں کی شہادت...... غلام محمد کیا کریں، انھیں تو اب پھر ٹی وی اسکرین پر دکھائی جانے والی ہر شکل، ہر لاش میں کہیں ابوبکر نظر آتا ہے، تو کہیں عمر اور ہر نم آنکھوں اور بلکتے چہرے والے باپ میں اپنا عکس...... بس ان کی بیگم اور سلیقہ مند ماں ہر احساس سے بے گانہ ہو کر سکون میں ہیں، اپنے ہوش و حواس کھوئے انھیں عرصہ بیت گیا۔ وہ بے خبر ہیں کہ اب یہ حادثہ ضربِ عضب کا بدلہ ہے۔

ماں کی نصیحت

استاد بچوں سے: "کون کون جنت میں جائے گا؟"

سب بچوں نے ہاتھ اٹھائے مگر ایک بچے نے ہاتھ نہیں اٹھایا۔

استاد: "(اس بچے سے) کیا تم جنت میں نہیں جاؤ گے؟"

بچہ: "نہیں سر! میری امی کہتی ہیں، چھٹی کے بعد سیدھا گھر آنا، اور کہیں نہ جانا۔"

(مرسلہ: از ظفر وقاص، ضلع راولپنڈی)

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

اندلسی فن تعمیر کا شاہکار

مسجد قرطبہ

اس مشہور عالم عبادت گاہ کا تذکرہ جو آدھا گرجا گھر خرید کر معرض وجود میں لائی گئی

محمد احمد ترازی

یہ ۷۱۱ء کا واقعہ ہے جب مسلمانوں نے اندلس کا شہر قرطبہ فتح کیا۔ قرطبہ اندلس میں بہتے سب سے بڑے دریا، وادی الکبیر کے کنارے واقع ہے۔ شہر کے قریب دریا کے کنارے ویسگوتھ عیسائیوں نے ایک گرجا تعمیر کر رکھا تھا۔ ان کی آمد سے قبل وہاں قدیم رومیوں کا ایک معبد ہوا کرتا تھا۔

فاتح مسلمانوں کو نماز پڑھنے کے لیے ایک موزوں مقام کی تلاش تھی۔ انھوں نے مقامی عیسائی معززین کی اجازت سے گرجا میں ایک جگہ نماز پڑھنے کی خاطر مخصوص کر لی۔ ۷۵۴ء میں قرطبہ، اندلس کے پہلے اموی خلیفہ، عبدالرحمن الداخل کی عملداری میں آ گیا۔ انھوں نے پھر فیصلہ کیا کہ گرجا کی جگہ ایک شاندار مسجد تعمیر کی جائے۔

عبدالرحمن الداخل کے وزیر، امیہ بن یزید نے عیسائی معززین سے طویل مذاکرات کیے۔ آخر طے پایا کہ شاہ وقت آدھا گرجا خریدنے کے بدلے انھیں بھاری بھرکم رقم ادا کرے گا۔ یہی نہیں، عیسائیوں کو شہر میں تین

http://www.booksbube.net
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

گرجا گھر تعمیر کرنے کی اجازت بھی مل گئی۔ اس فیصلے سے عیاں ہے کہ عادل مسلم بادشاہ غیر مسلم رعایا سے پورا انصاف کرتے تھے۔

گرجے کی آدھی جگہ خریدنے کے بعد تعمیر شدہ عمارت منہدم کر دی گئی۔ ۷۸۴ء سے اس جگہ پھر مسجد قرطبہ کی تعمیر شروع ہوئی۔ آنے والے اموی خلیفہ وقفے وقفے سے مسجد قرطبہ کی تعمیر، تزئین و آرائش کرتے رہے۔ یہ تقریباً ۹۸۷ء میں مکمل ہوئی۔

یوں عبدالرحمٰن اول الداخل نے اندلس میں اسلامی فن تعمیر کے نادر شاہکار، جامع مسجد قرطبہ کی بنیاد رکھی جس کی چوڑائی ایک سو پچاس اور لمبائی دو سو بیس میٹر کے قریب تھی۔ اس مسجد میں چودہ سو سے زائد ستون تھے۔ مسجد اتنی بڑی تھی کہ اگر کوئی دور سے دیکھتا، تو اس کی آخری حد نظر نہ آتی۔ مسجد کی صفائی ستھرائی کے لیے تین سو خادم مامور تھے۔

اس زمانے کے تعمیراتی ماہرین نے مٹی کے بنے پائپوں سے مسجد تک پانی پہنچانے کے لیے باقاعدہ پائپ لائن بچھائی۔ یہ پانی مسجد کے اطراف میں واقع پہاڑی چشموں سے آتا تھا۔ مسجد کے صحن میں بہت ہی خوبصورت فوارے نصب کیے گئے۔ جامع مسجد قرطبہ کی دیواریں اس قدر بلند تھیں کہ دور سے شہر کی فصیل کا گماں ہوتا۔ مسجد کی چھت تیس فٹ کی بلندی پر تعمیر کی گئی جس سے ہوا اور روشنی کا بہتر نکاس ممکن ہو سکا۔

چھت کو سہارا دینے کے لیے کئی ستون تعمیر کیے گئے، ان ستونوں کی کثرت سے مسجد میں خود بخود کئی راستے بن گئے۔ ہر ستون پر دہری نعلی محرابیں نصب کی گئیں جو بعد میں اندلس کے فن تعمیر کا حصہ قرار پائی۔ ہر دوسری محراب کو پہلی کے اوپر ایسے نصب کیا گیا کہ وہ

مسجد قرطبہ

سلسلۂ روز و شب، نقش گر حادثات
سلسلۂ روز و شب، اصل حیات و ممات
سلسلہ روز و شب، تارِ حریرِ دو رنگ
جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات
سلسلۂ روز و شب، سازِ ازل کی فغاں
جس سے دکھاتی ہے ذات زیر و بم ممکنات
تُو ہو اگر کم عیار، میں ہوں اگر کم عیار
موت ہے تیری برات، موت ہے میری برات
تیرے شب و روز کی اور حقیقت کیا ہے
ایک زمانے کی رَو جس میں نہ دن ہے نہ رات
اوّل و آخر فنا، باطن و ظاہر فنا
نقشِ کہن ہو کہ نو، منزلِ آخر فنا
ہے مگر اس نقش میں رنگِ ثباتِ دوام
جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام
مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحبِ فروغ
عشق ہے اصلِ حیات، موت ہے اس پر حرام
عشق کی تقویم میں عصرِ رواں کے سوا
اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام
عشق دمِ جبرئیل، عشق دلِ مصطفیٰ
عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام
عشق کی مستی سے ہے پیکرِ گِل تابناک
عشق ہے صہبائے خام، عشق ہے کاس الکرام
عشق فقیہِ حرم، عشق امیرِ جنود
عشق ہے ابن السبیل، اس کے ہزاروں مقام
عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات
عشق سے نُورِ حیات، عشق سے نارِ حیات
(علامہ اقبالؒ)

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

چھت سے جا ملی۔ چھت میں دو سو اسی ستارے نصب کیے گئے۔ سو ستارے جو اندرونی دلان میں نصب تھے، خالص چاندی سے بنائے گئے۔

مسجد کے مرکزی ہال میں ایک بہت بڑا فانوس نصب کیا گیا جس میں بیک وقت ایک ہزار چراغ روشن ہوتے، روشنی کے لیے استعمال ہونے والے چراغوں کی درست تعداد تو نہیں ملتی، مگر ایک روایت کے مطابق، ان کی تعداد ساڑھے سات ہزار سے زائد تھی۔ مسجد میں روشنی کا انتظام اس قدر بہتر تھا کہ رات کے وقت بھی دن کا گماں ہوتا۔

مسجد ایک خوبصورت تعمیری شاہکار تھی۔ جامع قرطبہ کی خوبصورتی کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ بعدازاں وہاں عیسائیوں کی اکثریت ہو جانے کے باوجود کبھی کلیسا بنانے کی حمایت نہیں کی گئی۔ عیسائی خود کہتے تھے کہ اگر یہاں کلیسا بنا، تو مسجد کا حسن خراب ہو جائے گا۔ لیکن بعد میں آرچ بشپ نے اس فیصلے کی مخالفت کرتے ہوئے مسجد کے وسط میں کلیسا کی تعمیر کا حکم دیا۔ تعمیر مکمل ہونے کے بعد اس نے جب مسجد کو دیکھا، تو تاسف کا اظہار کرتے ہوئے کہا ''اگر مجھے معلوم ہوتا کہ مسجد اتنی حسین ہے، تو میں کبھی کلیسا کی تعمیر کی اجازت نہ دیتا۔''

اس پرشکوہ مسجد کے نقوش آج بھی مسلم فن تعمیر کے اعلیٰ ذوق کی علامت اور اسپین میں مسلمانوں کی شاندار حکمرانی کا زندۂ و جاوید حوالہ ہے۔ آٹھویں صدی عیسوی میں تعمیر ہونے والی قرطبہ کی جامع مسجد اسلامی فن تعمیر کا نادر نمونہ ہے۔ یہ دنیا کی قدیم ترین مساجد میں سے ایک ہے، جسے اقوام متحدہ کے ادارے یونیسکو نے عالمی ثقافتی ورثہ قرار دیا۔ یہ مسجد دیکھنے کے لیے دنیا بھر سے ہر سال ۱۴ لاکھ سے زائد سیاح اسپین آتے ہیں۔

بدقسمتی یہ ہے کہ صدیوں سے یہ مسجد اپنے امام اور مقتدیوں کی منتظر ہے۔ اندلس میں مسلمانوں کو زوال آیا، تو دوسری مساجد کی طرح مسجد قرطبہ بھی عیسائی راہبوں کے تسلط میں آ گئی۔ پندرھویں صدی میں مسجد کے وسط میں ایک کیتھولک گرجا قائم کر دیا گیا جہاں عیسائیوں کو عبادت کی اجازت ہے۔ لیکن مسلمانوں کے لیے مسجد میں اذان دینے اور نماز کی ادائیگی پر آج بھی پابندی عائد ہے۔

۱۹۳۱ء میں شاعر مشرق علامہ اقبالؒ وہ پہلے مسلمان تھے جنھوں نے آٹھ سو سال بعد قرطبہ کی جامع مسجد میں پابندی کے باوجود اذان دی، نماز ادا کی اور مسجد قرطبہ کے عنوان سے ایک خوبصورت نظم بھی لکھی۔ مگر ان کے بعد مسجد پر پھر اُسی خاموشی کا راج ہے۔ دسمبر ۲۰۰۶ء میں اسپین کے مسلمانوں نے پوپ بینڈ کٹ سے اپیل کی تھی کہ انھیں جامع مسجد قرطبہ میں عبادت کی اجازت دی جائے۔ مگر ان کی درخواست مسترد کر دی گئی۔ ◆◆◆

☆ جس راز کا چھپانا ضروری ہو اسے سچے دوست کے سامنے بھی نہ کہو کیونکہ اس کے بھی دوست ہوں گے اور وہ تیرا راز انھیں بتا دے گا۔

☆ سچا خیر خواہ وہی ہے جو آئینے کی طرح تیرے عیب تجھے بتا دے نہ کہ وہ پیٹھ پیچھے تجھے برا بھلا کہے اور منہ پر تعریف کرے۔

☆ مسندِ علم اور دستارِ فضیلت اسی شخص کا حق ہے جو واقعی علم و فضل کی دولت سے مالا مال ہو۔

☆ دشمن کے مرنے پر خوشی نہ مناؤ کیونکہ تمھاری زندگی بھی ہمیشہ کے لیے نہیں۔

☆ جو دوسروں کے عیب تیرے سامنے لاتا ہے، وہ تیرے عیب بھی دوسروں کے سامنے لے جائے گا۔

http://www.bookstube.net/

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

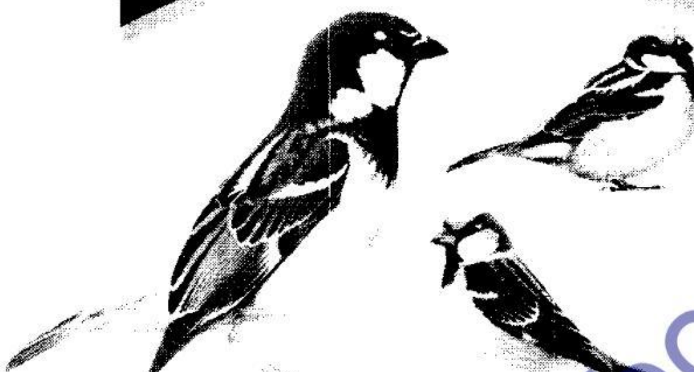

روس سے آنے والے پرندے جو بنے

گوجرانوالہ کے چڑے

اس شہر پہلواناں کا دلچسپ قصہ
جس کے باشندوں نے خوش خوراکی
میں امریکیوں کو بھی مات دے ڈالی

صدیق باشمی

لاہور سے بذریعہ جی ٹی روڈ یا ریل راولپنڈی جانے کا اتفاق ہو تو پہلا شہر گوجرانوالہ آتا ہے۔ یہ شہر ماضی میں ''سانسی والا'' کہلاتا رہا ہے۔ دراصل آج سے پانچ سو سال پہلے یہاں راجستھان کے جاٹ سانسی قبیلہ کی حکمرانی تھی۔ ان کی مرغوب غذا ''بلی'' تھی۔

اس زمانے میں آج کا رچنا دوآب علاقہ جنگل تھا۔ اسی میں دلے کی بار بھی شامل تھی۔ رچنا دوآب اور دلے کی بار میں جنگلی بلیاں بکثرت تھیں۔ یہ بلی کتے کے برابر ہوتی۔ سانسی غیر مسلم قبیلہ تھا۔ پرتھوی رائے کے زمانے میں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی تعلیمات و تبلیغی سرگرمیوں کے زور کے آگے وہ نہ ٹھہر سکا۔ یہ لوگ اسلام قبول کرنے کے بجائے موجودہ گوجرانوالہ آ کر بس گئے۔ مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ مزید چار سو سال

http://www.bookstube.net
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

تک مسلمان ہونے سے انکار کرنے کے بعد بیسویں صدی کے اوائل تک بھی سانسی حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔

سانسی قبیلہ کی حکومت کو پہلا دھچکا روسی یلغار سے لگا تھا۔ روسی چڑیاں اور ممولے تو گرم سمندر کی طرف زمانہ قبل از تاریخ سے آ جا رہے ہیں مگر کوہ قاف، قفقاز اور گروزنی کے رہنے والے مسلمانوں نے جب مغلوں، مرزاؤں اور چوغتوں کی پیروی کرتے ہوئے کوہ ہندوکش پار کیا تو راستے میں آنے والا ہر شہر فتح کرتے چلے گئے۔ مگر چنا اور باری دو آبہ کے علاقوں میں لہلہاتی فصلیں دیکھ کر انھوں نے اپنے ہتھیار کھولے اور انہی علاقوں میں بس گئے۔ وہ وہاں دودھ کا کاروبار کرنے لگے۔ یہی جنگجو پھر گجر کہلائے۔

رفتہ رفتہ گوجروں کی وجہ سے یہ شہر گوجرانوالہ کہلانے لگا۔ وہ جاٹوں کا علاقہ مکمل طور پر فتح نہ کر سکے تو انھوں نے ان کے ساتھ شراکت کر لی۔ یوں گجرات کے شہر کی نیو پڑی۔ گوجرانوالہ شہر کے نواح میں سانسی قبیلہ کے دو مشہور علاقے، تھیڑی سانسی اور میاں سانسی آج بھی آباد ہیں۔

کشمیر کے ہندو راجا اپنی مسلمان رعایا پر ظلم و تشدد کا بازار گرم کیے رکھتے تھے۔ وہ ناروا ٹیکس لگاتے جیسے موجودہ دور میں بھی مروج ہیں۔ مثلاً چیکوں پر ودہولڈنگ ٹیکس، موبائل میں کارڈ لوڈ کرنے پر ۲۵ روپے کا جھٹکا۔ ہندو راجا غریبوں کا لہو پیتے نہ تھکتے۔ ایسے میں بعض کشمیری گھرانے سوپور، اننت ناگ (اسلام آباد) اور بڈگام کے شہروں سے ہجرت کر کے پنجاب چلے آئے۔ اور بہت سے گوجرانوالہ میں مقیم ہوئے۔

کشمیری خوش خوراک قوم ہے۔ پہلے بلیاں کھانے والے آئے، پھر چڑے اور ممولے کھانے والے کوہ قاف کے گوجروں کی صورت پریوں سمیت آ گئے۔ باقی کسر سری پائے کھانے والے کشمیریوں نے پوری کر دی۔

خوش خوراکی انسان کو خود بخود پہلوانی کی طرف مائل کرتی ہے۔ لہٰذا گوجرانوالہ فنِ پہلوانی میں بہت پھلا پھولا۔ گوجر اور کشمیری کوئلوں پر بھنا گوشت کھانے کے بھی دلدادہ تھے لہٰذا شہر میں تکے کباب کا کاروبار شروع ہو گیا۔ سانسی اور مقامی پنجابی اقوام پکا ہوا گوشت، قورمہ وغیرہ کھانے کے عادی تھے۔ اس لیے یہاں توے (تابہ) پر کٹاکٹ کا کاروبار شروع ہوا۔

گوجرانوالہ ایسے طول بلد اور عرض بلد پر واقع ہے جہاں موسم اپنی انتہاؤں کے قریب تک اپنی شان دکھاتے ہیں۔ لہٰذا گرمیوں میں وہاں پہلوانی مشروبات فروخت ہونے لگے۔ ان میں املی، آلو بخارے، لیموں کی اسکنجبین، باداموں کی سردائی (گھوٹا) تخم بالنگو اور گوند کتیرا والا شربت مشہور تھے۔ جدید اور غیر مفید یورپی کولڈ ڈرنکس کا نام گوجرانوالہ کے لوگوں نے بہت بعد میں سنا۔ تب ان میں ٹنکچر کیپسی کم (سرخ مرچ کا ٹنکچر)، ٹنکچر جنجر (ادرک، سونٹھ، زنجبیل کا ٹنکچر) استعمال ہوا کرتا۔ یہ مشروبات غیر مشروب ہونے کے باوجود لوگ تکالیف پیٹ سے نجات کی خاطر پی لیا کرتے۔

سربنگا (Mistlethrush) نامی روسی چڑے گوجرانوالہ کے ہوٹلوں کی مشہور غذا ہے۔ سربنگا کی گوجرانوالہ میں اتنی کھپت ہے کہ جب موسم سرما میں یہ معصوم چڑے اپنے انجام سے بے خبر دور دراز کا سفر طے کر کے سوات پہنچیں تو وہیں شکاری انھیں پکڑ لیتے ہیں۔

http://www.bookstube.net/

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

شکاریوں کا یہ نیٹ ورک پنڈی بھٹیاں، چنیوٹ، فیصل آباد، جھنگ سے آگے بڑھتے ہوئے ساہیوال اور پاکپتن جیسے نیلی بار کے علاقوں تک پھیلا ہوا ہے۔ لیکن سرہنگوں کی کھپت اور فروخت کی سب سے بڑی منڈی گوجرانوالہ ہی میں واقع ہے۔

دور دراز سے لوگ چڑے (سرہنگے) کھانے گوجرانوالہ پہنچتے ہیں۔ انھیں کھانے کے لیے ضروری نہیں کہ آپ مرکز شہر، سیالکوٹی پھاٹک یا سیالکوٹی دروازے ہی کا رخ کریں۔ شہر کے شمالی اور جنوبی داخلی راستوں، قلعہ چن دا اور لوہیانوالہ بائی پاس پر جدید ریستورانوں میں بھی یہ چڑے آپ کا ذوقِ خوش خوراکی پورا کرنے کے لیے موجود ہیں۔

چڑے کڑاہی میں تلے جاتے ہیں۔ سیالکوٹی پھاٹک کے باہر ٹھیلے پر بیسن لگے چڑے بھی ملتے ہیں۔ گرمیوں میں یہ کاروبار مندا رہتا ہے، مگر سردی شروع ہوتے ہی اپنے عروج پر پہنچ جاتا ہے۔ ان ایام میں چڑا ۲۵ تا ۴۰ روپے میں ملتا ہے۔ عموماً ایک نوجوان درجن بھر چڑے کھا جاتا ہے۔ چڑا بغیر روٹی یا نان ہی تناول ہوتا ہے۔ تاہم رائتہ یا چٹنی کے ساتھ زیادہ لطف دیتا ہے۔

گوجرانوالہ کے شوقین مزاج منچلے اور نوجوان تو جب تک پیٹ نہ بھر جائے، چڑے کھاتے رہتے ہیں۔ یہاں کے مقامی لوگ اپنی خوش خوراکی میں امریکیوں کو بھی مات دیتے ہیں۔ لیکن امریکیوں کی طرح بے ڈول نہیں ہوتے کیونکہ اُن کی مرغوب غذا خنزیر کا گوشت، اسی کی چربی میں تلی اور پکی اشیا اور شراب ہے۔

اگر آپ نے کبھی چڑے نہیں کھائے تو اس کا تجربہ کرنے کے لیے گھریلو چڑا پکڑ کر اسے ذبح کریں۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ چڑے پر زیادہ گوشت نہیں ہوتا۔ بس پوست کے نیچے ہڈیوں کے ساتھ منڈھا ہوا تھوڑا سا گوشت ملتا ہے۔ بہرحال اللہ تعالیٰ نے قرآن میں پرندوں کے گوشت کو جنتیوں کی خوراک بیان فرمایا ہے۔ اس کے ساتھ شراب طہور بھی ہوگی یعنی زنجبیل (سونٹھ) کا مشروب تاکہ غذا ہضم ہو کر جزو بدن ہو جائے۔ گوجرانوالہ کے لوگ جنت میں جانے سے قبل ہی دنیا میں یہ مزے لے رہے ہیں۔ اگر آپ کو بھی جنت کی زندگی کا لطف لینا ہو تو گوجرانوالہ پہنچ کر چڑے ضرور کھائیے۔ مگر آپ کو جیب سے کافی روپے ادا کرنے ہوں گے، لہٰذا معقول رقم ساتھ لے جانا نہ بھولیے گا۔

چڑوں کے علاوہ گوجرانوالہ کے ہوٹلوں میں فارمی بٹیر بھی فروخت ہوتے ہیں۔ مگر ان کے گوشت کا مزہ فارمی مرغی جیسا ہی ہے۔ جنگلی بٹیر کا ذائقہ حاصل کرنا ہو تو کراچی میں ایمپریس مارکیٹ، لاہور میں ٹولنٹن مارکیٹ یا بھاٹی گیٹ اور گوجرانوالہ میں شیرانوالہ باغ تا گوندلانوالہ اڈے تک پھیلے پنجروں والوں سے خریدیے اور گھر میں پکا کر کھائیے۔ مگر میانوالی عیسیٰ خیل مت پہنچ جائیے گا کیونکہ وہاں کا بٹیر پالتو اور لڑاکا ہوتا ہے۔ لہٰذا ان کی قیمت سیکڑوں نہیں ہزاروں روپے تک جاتی ہے۔ عطا اللہ عیسیٰ خیلوی اور مرحوم غلام رسول شادی خیل آف کمر مشانی بھی بٹیر پالنے کے شوقین تھے۔ البتہ مولانا عبدالستار خاں نیازی کو ہم بغیر بٹیر کے صرف اونچے شملے کی پگڑی اور ہاتھ میں پکڑی چھڑی کے ساتھ دیکھتے رہے۔

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

یاد رہے بٹیر یا چڑے کھانے کا مزہ ائیر کنڈیشنڈ کمروں میں نہیں آتا۔ اس کے لیے کھلی فضا اور تازہ ہوا کا ہونا ضروری ہے تاکہ چڑے یا بٹیر کھانے سے جنم لینے والی گرمی دماغ کو متاثر نہ کر سکے۔ اسی طرح سری پائے کھانے کا جو لطف سیالکوٹی دروازے اور ریل بازار کے ٹھیلوں پر آتا ہے وہ قدرتی ماحول سے دور ائیر کنڈیشنڈ کمروں میں نہیں ملتا۔ پسینا چوٹی سے ایڑی تک بہ رہا ہو۔ سورج کی شعاعیں چہرے پر پڑ رہی ہوں۔ احباب کا ساتھ ہو جن میں بابے بھی شامل ہوں تو تجربات کا پٹارا کھلتا ہے اور محفل کشت زعفران بن جاتی ہے۔ ایسے ماحول میں کھائی جانے والی غذا کی گرمی دماغ کو نہیں چڑھتی۔

کچھ عرصہ قبل بچوں کے ساتھ مینگورہ سوات جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں رات کو بازاروں میں بجلی کے تاروں پر سرجنگلے اسی طرح بیٹھے دیکھے جیسے لاہور کے ولی بازار، کشمیری بازار، شاہ عالمی بازار اور داتا دربار میں جنگلی کبوتر بیٹھے نظر آتے ہیں۔ اب تو ویسے بھی ان تاروں میں برقی رو کم ہی دوڑتی ہے۔ لہٰذا یہ پرندوں کے بیٹھنے کا کام دیتی ہے۔ واپڈا یا لیسکو والے اپنے کھمبے اور تاریں اُتار کر لے جائیں تو اللہ پالن ہار پرندے بیٹھنے کا کوئی اور انتظام کر دے گا۔

لذت کام و دہن کے علاوہ چڑوں نے بہ زمانہ گورنر جنرل غلام محمد مرحوم ہمارے ملک کی خدمت کی تھی۔ وہ یوں کہ جب ملک غلام محمد پر فالج کا حملہ ہوا تو کسی حکیم نے انھیں دیسی چڑوں کے مغز کا حلوہ کھانے کا مشورہ دیا۔ پھر کیا تھا، کیا آدمی کیا جنگلی گھوڑے سب چڑوں کے شکار میں مصروف ہو گئے۔ ان دنوں کسی نے بتایا کہ حیدر آباد کے چڑے اس مقصد کے لیے بہترین ہیں۔ چناں چہ ہر کسی نے حیدر آبادی چڑوں پر یلغار کر دی۔ روزانہ ہزاروں چڑیاں بیوہ ہونے لگیں مگر گورنر جنرل پاکستان پھر بھی صحت یاب نہ ہو سکے۔

آج کل کے حکمران نجانے کس چیز کا شکار کر رہے ہیں! آپ کو معلوم ہو تو ہمیں بھی بتائیے۔ بہرحال اس مضمون کا پیغام یہ ہے کہ خوش خوراکی جرم نہیں۔ اگر ساتھ میں ذائقہ بھی ہو تو جذباتی تسکین ملتی اور پیٹ بھی بھر جاتا ہے۔ تو چلیے پھر گوجرانوالہ چلتے ہیں......

قائد اعظم کا استقبال

۳ رجون ۱۹۴۷ء کو آل انڈیا ریڈیو دہلی سے متحدہ برعظیم کے آخری وائسرائے، پنڈت نہرو قائد اعظم اور بلدیو سنگھ کو تقسیم کے پلان کا اعلان کرنا تھا اور بابائے قوم کے لیے آل انڈیا ریڈیو سے تقریر نشر کرنے کا یہ پہلا موقع تھا۔

سب سے پہلے پنڈت نہرو آل انڈیا ریڈیو کے اسٹوڈیو پہنچے۔ ظاہر ہے کہ ان کا زبردست استقبال ہوا ہو گا۔ اُن کے ہمراہ بلدیو سنگھ بھی تھے۔ اب قائد اعظم کی آمد کا انتظار تھا۔ مگر وقت گزرتا چلا جا رہا تھا اور لوگ بے تاب ہو رہے تھے۔ یہاں تک کہ ماؤنٹ بیٹن کی آمد کا بھی اعلان کر دیا گیا۔ ریڈیو اسٹیشن کا عملہ پریشان تھا کہ قائد اعظم کیوں لیٹ ہو گئے ہیں۔ وائسرائے کا استقبال اُن کے شان شایان کیا گیا اور جب وہ بھی انتظار گاہ میں بیٹھ گئے تو نشریات شروع ہونے سے صرف چند لمحات پہلے قائد اعظم کی موٹر کار اسٹوڈیو کے کمپاؤنڈ میں داخل ہوئی اور استقبالیہ نعرے بلند ہوئے چناں چہ ماؤنٹ بیٹن، پنڈت نہرو اور بلدیو سنگھ تینوں کو قائد اعظم کا استقبال کرنا پڑا۔

(کیپٹن ممتاز ملک)

http://www.bookstube.net
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

معاشرتی افسانہ

امن، سکون اور شانتی دینے والا

محبت کا سفر

بدی کا سیاہ اندھیرا اس کی نیکی کے
روشن اجالے نے دور کر ڈالا......
دل میں نئی اُمنگیں جگانے والا قلمی تحفہ

نورین قادر قریشی

"ماں پھر کیا ہوا؟" خاموشی پر میں نے فوراً سوال کیا۔

"ہونا کیا تھا، میں تمھیں شہر لے آئی اور پھر ان کی کبھی شکل نہ دیکھی۔" ماں نے نفرت انگیز لہجے میں جواب دیا۔

"لیکن اماں ہم نے بھی تو ان سے رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ہو سکتا ہے تایا جان ایسے نہ ہو، جیسے ہم انھیں سمجھ رہے ہیں۔"

"ارے پگلے، تو ابھی چھوٹا ہے، تجھے کیا معلوم امیری غریبی کا فرق انسانی رشتوں کو کیسے کمزور کر دیتا ہے۔ تیری تائی بھلا کہاں برداشت کرتی......"

"نہ اماں ایسا نہیں سوچتے، ہمیں کیا معلوم تائی کیا چاہتی ہیں؟ اماں جس طرح امیری غریبی کا فرق رشتوں کو کمزور کرتا ہے، اسی طرح بدگمانی بھی رشتوں کو کمزور تر کر دیتی ہے۔"

خدیجہ بیگم نے پلٹ کے بیٹے کو یوں دیکھا جیسے یقین کر رہی ہوں کہ اتنی گہری بات میں نے ہی کہی ہے۔

"اماں! اگر وہ ہم سے دور رہے، تو ہم نے بھی ان کے قریب جانے کی کوشش نہیں کی۔"

http://www.bookstube.net
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

''اچھا عادل، اب زیادہ عالم بننے کی کوشش نہ کرو۔ خبردار جو آج کے بعد ان کی وکالت کرنے کی کوشش کی، تجھے کیا پتا وہ کیسے ہیں؟ میں نے تو تجھے ان کی ہوا بھی نہیں لگنے دی۔ اتنے اچھے ہوتے، تو کسی سے پوچھ تاچھ کرتے ہم تک پہنچ ہی جاتے۔ بھرے شہر میں رہ رہے ہیں، کوئی ویرانے میں ڈیرہ نہیں ڈال رکھا۔ بڑا آیا تایا کی حمایت کرنے والا!''

''اچھا اماں، آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ ناراض نہ ہوں مجھ سے۔'' مجھے سب کچھ گوارا تھا، لیکن ماں کی ناراضی کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا تھا۔ سو مزید بحث کرنا مناسب نہ سمجھا۔

مجھ کو معلوم تھا، بابا کی وفات کے بعد ماں نے مجھے بڑی مشقت سے پالا تھا۔ پرورش کے ساتھ ساتھ میرے اچھے مستقبل کی خاطر کیا کچھ نہیں کیا تھا۔ ایسے میں اپنوں کی بے رخی اور بھی دل دکھاتی ہے۔ اس سوچ نے مجھے کچھ افسردہ سا کر دیا۔ میں فوراً ماں کے کمرے کی جانب بڑھا۔ وہ پرانی البم سے کچھ تلاش کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ آہٹ سن کر فوراً البم بند کیا اور مصنوعی غصے کا اظہار کرنے کی ناکام کوشش کرنے لگیں۔

''میں کون سا کل ہی تایا سے ملنے جا رہا ہوں جو آپ اتنی برہم ہو رہی ہیں۔''

انھوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے خاموشی سے سر ان کی گود میں رکھ دیا۔ انھوں نے پھر بھی کسی ردعمل کا اظہار نہ کیا۔

''اماں! اس گھر میں آپ کے سوا کون ہے جس سے میں بات کروں؟ اگر آپ بھی مجھ سے ناراض ہو گئیں، تو......''

میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی وہ دھیرے دھیرے میرا سر سہلانے لگیں جو ایک طرح سے غصہ ختم ہونے کا اشارہ تھا۔ میں پرسکون ہو گیا۔ میں نجانے کن سوچوں میں گم تھا جب گرم پانی کا ایک قطرہ میرے ماتھے پر ٹپکا۔ میں نے چونک کر ماں کی طرف دیکھا۔

''آپ رو رہی ہیں؟''

''ارے نہیں تو۔'' انھوں نے آنسوؤں سے تر چہرہ دونوں ہاتھوں سے رگڑ کر صاف کیا اور مسکرانے کی ناکام کوشش کرنے لگیں۔ میں خاموشی سے ان کے چہرے پہ اترے تاثرات کا جائزہ لینے لگا۔

''ویسے ہی آج کچھ گزری باتیں یاد آ گئی تھیں، تم پریشان نہ ہو۔'' انھوں نے شاید میرے چہرے پر اترتے پریشانی کے تاثر کو محسوس کر لیا تھا۔

''اماں، کیا اپنے تلخ ماضی کو یاد کرنا کوئی معنی رکھتا ہے؟''

''ارے نہیں بیٹا، ایسی کوئی بات نہیں۔''

''نہیں اماں ایسی ہی بات ہے، آپ کیوں خود کو اور مجھے اذیت دیتی ہیں۔''

''چلو وعدہ، اب کبھی ان دکھ دینے والی باتوں کا ذکر نہیں ہوگا۔''

''وعدہ۔''

''ہاں پکا وعدہ۔''

انھوں نے ایک بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ اماں نے پھر میرے ساتھ اس وقت کی کچھ خوشگوار یادیں تازہ کیں جب ابا جان ہمارے درمیان موجود تھے۔

☆☆

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی لیکن نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ ماں کے آنسو کی حرارت میں اب بھی اپنے ماتھے پر محسوس کر رہا تھا۔ نجانے ماں کو اپنوں کی بے اعتنائی کا دکھ تھا یا یوں کٹ کر تنہا زندگی گزارنے کا!

http://www.bookstube.net
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

لیکن یہ بات تسلیم شدہ تھی کہ نفرت و بدگمانی کی جڑیں کافی مضبوط ہو چکی تھیں۔ میں کیا کروں؟ کیا ماں کی طرح دور رہ کر نفرت و بدگمانی کا سلسلہ آگے بڑھاؤں یا محبت کے نئے سفر کا آغاز کروں؟ دونوں راہوں کے نتائج میرے سامنے تھے۔

ماں کی محبت نے مجھے کچھ اس طرح گھیر رکھا تھا کہ ہر شے مجھے انہی کی ذات سے وابستہ نظر آتی۔ میں بہت دیر تک دونوں راہوں میں سے کسی ایک کے انتخاب میں اُلجھا رہا۔ ذہن مجھ سے ایک ہی سوال کر رہا تھا: کیا تم بھی چیزوں کو اوروں کی نظر سے دیکھو گے، اسی طرز پر چلو گے جس پر سب چلتے ہیں...... اچھوں کے ساتھ اچھے اور بروں کے ساتھ برے! یا اپنی انا مار اس راستے کا انتخاب کرو جس پر چل کر تمھیں کبھی پچھتاوا نہ ہو۔ انھیں سوچوں میں گم نجانے کس لمحے میں نیند کی وادی میں اتر گیا۔

اب میری کوشش ہوتی کہ اماں سے کوئی ایسی بات نہ کروں جس میں ماضی کی تلخ یادوں کا ذکر آجائے۔ لیکن ماضی اور اپنوں سے لاتعلقی کے باوجود ان سے رشتہ برقرار رہا۔ میرا ذہن مسلسل کسی منطقی نتیجہ پر پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔

مجھے گزشتہ شب پڑھی انگریز شاعر، ولیم بلیک کی نظم "A Poison Tree" یاد آنے لگی۔ اس مختصر مگر بامعنی نظم میں ولیم بلیک نے ہمیں ایک اہم اخلاقی سبق دیا ہے۔ شاعر ہمیں بتاتا ہے کہ ایک مرتبہ وہ اپنے دوست سے ناراض ہو گیا۔ اس نے اسے ناراضی کی وجہ بتا دی اور یوں غلط فہمی دور ہو گئی۔ لیکن ایک بار اس سے ناراض ہوا، تو وجہ نہ بتائی۔ اس غلط فہمی نے شاعر کے دل میں اس کے خلاف نفرت کا بیج بو دیا۔ یہ نفرت ایک زہریلے پودے کے مانند پروان چڑھنے لگی۔ رفتہ رفتہ نفرت کے پودے نے درخت کی صورت اختیار کر لی۔ اس پر نفرت کا پھل لگا جسے چکھتے ہی دوست میری نفرت کی بھینٹ چڑھ گیا اور اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔

کئی طرح کے خیالات میرے ذہن کو گھیرے ہوئے تھے۔ روزانہ رات سونے سے قبل میرے سامنے کئی سوال ابھرتے۔ میں خود ہی ان کے جواب تلاش کرتا، پھر دلائل دیتا اور کبھی انھیں رد بھی کر ڈالتا۔

''عادل! خود کو نفرتوں کی بھینٹ مت چڑھانا، محبت کے بیج بونا جس سے زندگی بہت آسان ہو جاتی ہے۔'' اپنے اندر سے ابھرنے والی اس آواز کو میں نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔

بی اے کا فائنل امتحان قریب تھا۔ دن رات اس کی تیاری کے لیے وقف تھے۔ ذہن میں ایک ہی دھن سوار تھی کہ امتحان میں شاندار کامیابی حاصل کر لوں۔ میری زندگی کی سرگرمیاں پہلے ہی محدود تھیں، اب محدود تر ہو گئیں۔

☆☆☆

لوگوں سے پتا پوچھتا میں اپنے آبائی گاؤں پہنچ ہی گیا۔ اگرچہ اس سے میری کچھ زیادہ یادیں وابستہ نہ تھیں پھر بھی انسیت سی تھی جو میں ماحول میں محسوس کرنے لگا۔

''کیا ظفر صاحب کا یہی گھر ہے؟''

''جی تھا اب نہیں۔'' اجنبی نے مختصر جواب دیا۔

''کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں اب وہ کہاں رہتے ہیں؟'' اجنبی نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

تب مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا کہ میں نے اپنا تعارف تو کرایا ہی نہ تھا۔

''اچھا اچھا، آپ کیانی صاحب کے بیٹے ہیں، اللہ ان کی مغفرت فرمائے، بہت نیک انسان تھے۔'' میرے

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

مختصر تعارف پر وہ فوراً ابا جان کی نسبت سے مجھے پہچان گئے اور میرے ساتھ اظہار ہمدردی کرنے لگے۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ مجھے ماضی کے کئی چھوٹے بڑے واقعات سنا چکے تھے۔ ان کے مطابق تایا جان کافی عرصہ پہلے شہر منتقل ہو چکے تھے۔ اب کبھی کبھار ہی ان کا آنا ہوتا۔ میں نے انھیں آنے کا مقصد بتایا اور تایا جان کے نام ایک پیغام لکھ کر ان کے حوالے کیا۔ انھوں نے ان تک پہنچانے کی ذمہ داری خوشی سے قبول کر لی۔

چند ہفتوں ہی میں میرا تایا جان سے رابطہ ہو گیا۔ اور پھر اکثر فون پہ بات ہونے لگی۔ باہمی رابطے نے کئی غلط فہمیوں کو دور کر دیا۔ اور دلوں میں پیدا ہونے والی دوریاں کم ہونے لگیں۔ آخر برسوں سے ٹوٹا تعلق استوار ہونے لگا۔ ان سب باتوں کی اماں کو خبر نہ تھی۔ میں کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھا تاکہ ان کی غلط فہمیاں بھی دور ہو جائیں۔ مجھے یقین تھا، محبت کے اس سفر میں شریک ہونے کے لیے وہ کبھی پیچھے نہیں رہیں گی۔

☆☆

زین نے فون پر نتیجے کی خبر سنائی تو میں کود کر بستر سے باہر نکلا۔ اس سے پہلے کہ کمپیوٹر چلاتا، سرکیانی نے فون کر کے مجھے شاندار کامیابی کی خبر سنائی۔ میں بی اے کے امتحان میں اول آیا تھا۔ اماں نے فوراً شکرانے کے نوافل ادا کیے اور میں سب سے مبارک بادیں وصول کرنے لگا۔ سبھی دوستوں سے فون پر رابطہ ہو گیا۔ ان کے پیغامات بھی وصول ہو رہے تھے۔ لیکن مجھے تایا جان اور خرم کے فون کا انتظار تھا۔ دل چاہ رہا تھا پہل کر ڈالوں لیکن کچھ سوچ کر خاموشی اختیار کیے رکھی۔

☆☆

تایا جان نے فون کیوں نہیں کیا؟ اور پھر خرم نے ایسا کیوں کیا؟ دن بھر انتظار کے بعد دل کئی سوال اٹھا رہا تھا۔ نہیں، مجھے بدگمان نہیں ہونا چاہیے، ہوسکتا ہے سچ وہ نہ ہو جو میں سوچ رہا ہوں۔ ایک آس اور امید تھی جو منفی خیالات کو رد کرنے لگی۔ نہیں، میں نفرت کے سلسلے مزید آگے نہیں بڑھنے دوں گا۔ اس بار بھی میں پہل کر ان سے ملنے خود چلا جاؤں گا...... یہ سوچتے ہوئے میں نجانے کس لمحے نیند کی وادی میں اتر گیا۔

اماں نے میری کامیابی کی خوشی میں سب ملنے جلنے والوں کی پرتکلف دعوت کا اہتمام کیا۔ سو گھر میں خوب رونق تھی۔ میں نے بھی خود کو مصروف کر رکھا تھا۔ لیکن ذہن کسی سوچ میں الجھا ہوا تھا۔ اچانک میری آنکھوں نے وہ منظر دیکھا جس کا میں نجانے کب سے منتظر تھا۔

''السلام علیکم۔'' تایا جان کی آواز سن کر میں خوشی سے ساکت سا ہو گیا۔

''آپ......'' خوشی سے میں صرف اتنا ہی کہہ سکا اور پھر پھیلے بازو دیکھ کر ان کی جانب بڑھا اور لپٹ گیا۔ اماں اور تائی جان بھی ایک دوسرے سے محبت سے ملیں۔ کچھ گلے شکوے ہوئے۔ کچھ گزرے لمحوں کا ذکر چھیڑا گیا اور پھر باتوں ہی باتوں میں سب دوریاں مٹتی چلی گئیں۔ اماں جان اچانک ملنے والی اس خوشی پر حیران تھیں۔

خرم سے بے تکلف گفتگو ہوئی۔ سب کچھ اچھا لگ رہا تھا۔ اماں کے چہرے پر اترے سکون و اطمینان کے رنگ مجھے بھی خوشی سے نہال کر رہے تھے۔ تایا جان میرے لیے تحائف لے کر آئے تھے۔ آج کی شام خوشیوں سے بھرپور تھی۔ ہر چہرہ خوش اور دل مطمئن تھا۔ میرے لیے تو آج کا دن دہری کامیابی والا ثابت ہوا۔ دل محبت کا سفر منتخب کرنے پر نازاں و مطمئن تھا۔

http://www.bookstube.net/

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

جنھوں نے قسمت بدل دی

دو تولے کی بالیاں

نیکی اگر معمولی بھی ہو تو وہ کبھی رائیگاں نہیں جاتی..... ایک ہمدرد لڑکی کی اچھوتی داستان

دانیہ صالح

دنیا میں بعض اوقات عجیب واقعات جنم لیتے ہیں۔ اب مجھے ہی لے لیجیے۔ میری زندگی کے سب سے خوبصورت موڑ کی بنیاد میری ایک ایسی بھلائی پر رکھی گئی جو مجھے بمشکل یاد رہی تھی۔ اگر میں یہ کہانی شروع سے سنانے لگوں تو کئی صفحے درکار ہوں گے۔ مختصر طور پر بتا دیتی ہوں کہ میں فطری طور پر بہت رحمدل واقع ہوئی ہوں۔ امی مجھے میرے بچپن کے قصے سناتی رہتی ہیں کہ میں کس طرح دوسروں کی معمولی سی تکلیف پر بے چین ہو جایا کرتی تھی۔ بہن بھائی شرارتاً ہاتھ پر سرخ روشنائی انڈیل کر مجھے ڈراتے اور میں انھیں سچ مچ زخمی سمجھ کر دیر تک ان کی تیمارداری میں لگی رہتی۔

ہمارا مکان شیخوپورہ کے ایک پرانے محلے میں تھا۔

www.pdfbooksfree.pk

والدین پرانے زمانے کے خیالات رکھتے تھے۔ بھائیوں کو تعلیم حاصل کرنے کی اجازت تھی۔ وہ روزانہ ٹھاٹھ سے اسکول جاتے، ہم تین بہنیں گھر رہ جاتیں۔ بڑی بہن تنک مزاج اور جھگڑالو تھی۔ اس کا سارا وقت لڑنے اور لڑانے میں گزرتا۔

دوسری بہن کو اماں ہر وقت کام میں لگائے رکھتیں۔ اسے خود بھی گھریلو کام سے دلچسپی تھی۔ میں سب سے چھوٹی تھی۔ ماں باپ نے خاصی لاڈلی بنایا ہوا تھا۔ میں دن بھر محلے کے چھوٹے بچوں کے ساتھ گلی ڈنڈا یا آنکھ مچولی کھیلتی پھرتی۔ ابا جان کی خاصی زرعی زمین تھی۔ لہٰذا ہم کھانے پینے کی فکر سے آزاد تھے۔

انہی دنوں میری پھوپھی کا انتقال ہو گیا۔ ان کی کوئی اولاد نہ تھی۔ انھوں نے اپنی نند کا لڑکا لے کر پالا ہوا تھا۔ یہ بچہ شروع سے یتیم تھا۔ پھوپھا اس بچے کو ہمارے پاس چھوڑ گئے۔ شروع شروع میں وہ سب سے ذرا ذرا رہا پھر ہم میں گھل مل گیا۔ ابا جان کو گھر کے امور سے کبھی دلچسپی نہیں رہی۔ امی نے اس بچے پر ظلم ڈھانے شروع کر دیے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ امی اس سے بڑا ظالمانہ سلوک کرتی تھیں۔ غریب تیرہ چودہ سال کا کمزور سا بچہ اناج کی اڑھائی من کی بوری اٹھا کر چکی پر پسوانے لے جاتا۔ بازار سے تیل کے ٹین کندھے پر رکھ کر لاتا۔ یوں سمجھ لیجیے کہ امی کو مفت کا نوکر ہاتھ آ گیا۔ امی کا رجحان دیکھ کر میرے خودغرض فطرت والے بہن بھائیوں نے اس سے پہلے والی ہمدردی اور محبت چھین لی۔ وہ بھی اسے گھر کا نوکر سمجھنے لگے۔

آپ باور کریں گے کہ اسے دن بھر کے کاموں کے بعد باسی کھانا ملتا۔ میں اپنی امی کی برائی نہیں کر رہی، صرف یہ بتانا چاہتی ہوں کہ اگر وہ اپنا رویہ درست رکھتیں، تو دوسرے لوگوں کو اس پر ظلم کرنے کی ہمت نہ ہوتی۔ رفتہ رفتہ محلے والے بھی اس سے اپنے کام کرانے لگے۔ ایک اکیلی میری ذات تھی جو دل ہی دل میں اس پر رحم کھاتی۔ اسے چوری چھپے کھانے کو بھی دیتی۔ اس کے لیے نئے کپڑوں کی سفارش بھی ابا سے کرتی۔ میرا بھی بچپن تھا۔ مجھے اب تو اپنی وہ چھوٹی چھوٹی مہربانیاں یاد بھی نہیں رہتیں جو میں اس پر ترس کھا کر کرتی رہتی تھی۔

اس یتیم کے لیے میں نے جو آخری اچھا کام کیا، وہ بھی دھندلی یاد ہی رکھتا ہے۔ ایک دفعہ امی نے اسے کسی بات پر بگڑ کر بری طرح مارا۔ وہ اسی وقت بازار سے لوٹا تھا۔ شاید کسی شے کی قیمت زیادہ دے آنے کی کوئی بات تھی۔ وہ بچارہ صبح سے کام میں لگا ہوا تھا۔ اس زیادتی پر جواب دے بیٹھا۔ امی کو مارنے کا بہانہ مل گیا۔ پیاز کوٹنے والے ''سوٹے'' سے اس کی پٹائی شروع کر دی۔ میں نے امی کو اسے مارتا دیکھا، تو اتنی زور سے چلانا شروع کیا کہ مجبوراً انھیں میری خبرگیری کرنی پڑی۔ مار کھا کر صدیق منہ سے کچھ نہ بولا اور گھر سے نکل گیا۔ میں اس کے پیچھے دوڑی۔ امی بکتی جھکتی رہیں۔ صدیق نے مجھے خوب پیار کیا اور کہا کہ اپنے ابا جان سے کہہ دینا۔ ''صدیق اب کبھی نہیں آئے گا۔ انھیں میرا سلام بھی کہہ دینا۔''

میں بری طرح رونے لگی۔ مجھے علم تھا کہ اس کے ماں باپ مر چکے لہٰذا وہ اب کہاں بھٹکتا پھرے گا؟ اس نے مجھے تسلیاں دیں اور وعدہ لیا کہ گھر جا کر اس کے جانے کا ذکر نہیں کروں گی۔ وہ دو تین قدم آگے چلا کہ مجھے کچھ یاد آ گیا۔ میں نے اسے آواز دی اور جلدی جلدی اپنے کانوں کی طلائی بالیاں اتار کر اس کی طرف بڑھا دیں۔ یہ بالیاں تقریباً دو تولے کی ضرور ہوں گی کیونکہ اس زمانے میں بچوں کو سونا پہنانا امارت کی نشانی سمجھا جاتا تھا۔

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

وہ پہلے جھجکا پھر میں نے قسم دی کہ کبھی کسی کو نہیں بتاؤں گی کہ میری بالیاں کہاں گئیں۔ اس نے احسان مندی سے مجھے دیکھا اور بالیاں لے کر چلا گیا۔ اس روز میں شام تک اپنی سہیلی کے گھر کھیلتی رہی۔ مجھے گھر آنے پر پتا چلا کہ واقعی صدیق واپس نہیں آیا۔ رات کو میں نے صدیق کی مار والی بات ابا کو بتا دی۔ ابا امی پر بہت بگڑے۔ میں نے کسی کو شبہ ہونے نہ دیا کہ اسے اپنی بالیاں دے کر آ گئی ہوں۔ مجھے بالیاں کھو جانے پہ ڈانٹ پڑی۔ میں نے یہ بہانہ بنایا کہ کھیلتے وقت میں نے بالیاں اتار کر رکھ دی تھیں، پتا نہیں کہاں گئیں۔ بات آئی گئی ہوگئی۔

مجھے اس بھلائی کا اجر پورے چودہ سال بعد ملا۔ اس وقت تک مجھے سب کچھ بھول بھی چکا تھا۔ میرے بھائی لائق نکلے۔ دو بھائیوں کی شادیاں ہو گئیں تو وہ الگ ہوگئے۔ زمین پہلے جتنی نہیں رہی تھی، بس گزارہ ہو رہا تھا۔ ہم دو بہنیں غیر شادی شدہ تھیں۔ ابا جان ہماری فکر میں گھلے جا رہے تھے۔ خاندان میں کوئی معقول رشتہ بھی نہیں تھا۔

ایک دن اچانک ہمارے گھر صدیق آ گیا اور آپ کو علم ہے وہ کس شان سے آیا؟ اپنی قیمتی گاڑی سے اتر کر جب اس نے ہمارے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا، تو ابا جان کو بھی اسے پہچاننے میں مشکل ہوگئی۔ کوئی خواب میں بھی اس بات کا گمان نہیں کر سکتا کہ صدیق اتنا بڑا آدمی بنے گا کہ اس کے آنے پر پورا محلہ اکٹھا ہو جائے۔

اب یہ بتانا شاید ضروری نہیں رہا کہ صدیق میرا شوہر ہے۔ یہ شخص پورے بارہ سال جدوجہد کرتا رہا۔ اس دوران صدیق نے اپنی محنت سے فیصل آباد میں وسیع کاروبار کھڑا کر لیا۔ وہ عمر میں مجھ سے آٹھ نو سال بڑا ہوگا۔ میں اب اسے کہتی بھی ہوں کہ جب اتنا روپیہ مل گیا تھا تو شادی کیوں نہ کر لی؟ اس وقت یہ بات سن کر میری گردن فخر سے اکڑ جاتی ہے کہ وہ میرا اور صرف میرا انتظار کر رہا تھا۔ اس کی ساری امارت کی بنیاد صرف میری دو تولے کی بالیوں پر رکھی گئی۔ وہ اتنے اچھے دل کا آدمی بھلا اپنی محسنہ کو کیسے بھول سکتا تھا؟

◆◆◆

بھکاری

گھر کے دروازے پہ کر کے چاند ماری بے دھڑک
آ گیا ہے مانگنے کوئی بھکاری' بے دھڑک
واسطہ دیتا ہے اپنی بھوک کا' افلاس کا
کر کے شامل اس میں اپنی گریہ زاری بے دھڑک
دس روپے کے نوٹ سے کم بھیک وہ لیتا نہیں
منہ بناتا ہے اگر دیں ریز گاری بے دھڑک
ہاتھ خالی لے کے گھر سے یہ نکلتا ہے غریب
لوٹتا ہے کر کے اپنی جیب بھاری بے دھڑک
صبح دم رکھتا نہیں کیسہ میں ایک پائی مگر
شام کو ہوتا ہے وہ اٹھارہ ہزاری بے دھڑک
جانتا ہے' مانگنے کا اک ہے اک اعلیٰ ہنر
نت نئے ناٹک رچائے یہ مداری بے دھڑک
بینک کا عملہ اسے جو دیکھ لے آتے ہوئے
دوڑتا ہے تھامنے اس کی پٹاری بے دھڑک
لال بتی پہ کھڑے سائل کو جب آواز دی
درجنوں آئے نکل اس کے حواری بے دھڑک
دیکھتا ہوں جب کسی کشکول والے کو ضیاء
دل پہ لگ جاتا ہے کوئی زخم کاری بے دھڑک
(شرافت ضیاء، اسلام آباد)

بھارتی انتہا پسندوں کا مطالبہ

مسلمانو! تم سب ہندو ہو جاؤ

مودی سرکار بنتے ہی حیلے بہانوں سے بھارت کے غریب مسلمانوں کو ہندو بنانے کا "دھندا" شروع ہو چکا

رضیہ جمیل

جب محمد شیخ بیٹری خریدنے گیا، تو دکان دار نے اسے ایک اخبار دکھایا۔ اس میں محمد شیخ کی تصویر چھپی ہوئی تھی۔ وہ کچھ لوگوں اور جلتی آگ کے سامنے بیٹھا تھا۔ دکان دار نے بتایا کہ یہ اس تقریب کی تصویر ہے جس میں اسے مسلمان سے ہندو بنایا گیا۔ یہ سن کر محمد شیخ حیران رہ گیا۔

بیس سالہ محمد شیخ بھارتی شہر آگرہ میں واقع ایک بستی، ویدنگر کا باسی ہے۔ اس بستی میں انتہائی غریب لوگ رہتے ہیں۔ ان میں مزدور، پھیری اور کوڑا چننے والے شامل ہیں۔ خود محمد شیخ کوڑے میں سے کاغذ، لوہا وغیرہ چننے کا

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

کام کرتا تھا۔

محمد شیخ پانچ برس کا تھا کہ اس کے والد فوت ہو گئے۔ تب وہ اپنے آبائی گاؤں، سیلدہ واقع مغربی بنگال میں مقیم تھا۔ چند سال قبل اس کی شادی ہوئی، تو وہ بہتر روزگار کی تلاش میں آگرہ چلا آیا۔ مگر وہ تعلیم یافتہ نہیں اور نہ ہی اسے کوئی ہنر آتا ہے۔ چناں چہ اسے مجبوراً کوڑا چننے والا بننا پڑا۔

وہ روزانہ بیس پچیس کلومیٹر چل کر کوڑے میں سے مطلوبہ اشیا جمع کرتا ہے۔ ان کی فروخت سے اسے روزانہ ایک تا دو سو روپے آمدن ہوتی ہے۔ کبھی کبھی کچھ نہیں ملتا اور تب محمد شیخ کے گھر والوں کو فاقہ کرنا پڑتا ہے۔ اس کا خاندان ماں، بیوی اور ایک بچے پر مشتمل ہے۔

ویدنگر ڈیڑھ کنال رقبے پر پھیلی ہوئی چھوٹی سی بستی ہے۔ وہاں ۲۵ خاندان آباد ہیں جنھوں نے خیمے ڈال رکھے ہیں۔ یہ خیمے شدید سردی نہیں روک پاتے۔ چناں چہ موسم سرما میں خیموں کے مکین مل جل کر سوتے ہیں تاکہ خود کو گرم رکھیں۔ وہ ہر ماہ پلاٹ کے مالک کو آٹھ ہزار روپے کرایہ دیتے ہیں۔

غریبوں کی اس بستی میں بنگلہ دیش اور برما سے آئے ہوئے مسلم مہاجر بھی مقیم ہیں چونکہ وہ غیر قانونی طور پر بھارت میں داخل ہوئے۔ لہٰذا ان کے پاس شناختی کارڈ نہیں اور نہ ہی کوئی ایسی دستاویز جس سے وہ خود کو بھارتی شہری ثابت کر سکیں۔ وہ بھی معمولی کام کر کے گزر اوقات کرتے ہیں۔

محمد اسماعیل کلکتہ سے ہجرت کر کے آگرہ آیا اور ویدنگر کے قریب رہنے لگا۔ وہ بتاتا ہے ’’اگر زمین پر کوئی دوزخ ہو سکتی ہے، تو وہ یہی ہے۔ ہم یہاں کیڑے مکوڑوں کی طرح زندگی گزار رہے ہیں۔‘‘ محمد اسماعیل ایک چھوٹے سے شکستہ گھر میں بیوی اور چار بچوں کے ساتھ رہتا ہے۔

محمد اسماعیل بھی کوڑے میں سے مطلوبہ اشیا چنتا اور انھیں بیچ کر ماہانہ ڈھائی ہزار روپے کماتا ہے۔ وہ کہتا ہے ’’آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس معمولی آمدن سے ہم کتنی عسرت زدہ اور اذیت ناک زندگی گزار رہے ہیں۔ مجھے روزانہ زمین کھودنی پڑتی تاکہ کچھ کما کر اہل خانہ کا پیٹ بھر سکوں۔ اکثر اوقات ہمیں پیٹ بھرے بغیر ہی سونا پڑتا ہے۔‘‘

بھارت میں بسے مسلمانوں میں پھیلی اسی غربت سے انتہا پسند ہندو جماعتیں فائدہ اٹھاتی ہیں۔ وہ ان مسلمانوں کو سہانی زندگی کے خواب دکھا کر اپنے جال میں پھانستی اور انھیں ہندو بنانے پر اکسا دیتی ہیں۔ کچھ ایسا ہی ماجرا آگرہ کے ۵۷ مسلم خاندانوں کے ساتھ بھی پیش آیا۔ ان میں محمد شیخ اور محمد اسماعیل کے خاندان بھی شامل تھے۔

ہوا یہ کہ آگرہ میں مختلف انتہا پسند ہندو جماعتوں .... آر ایس ایس (راشٹریہ سویم سنگھ)، بجرنگ دل، دھرم جاگرن منچ، وشوا ہندو پریشد وغیرہ کے کارکنوں نے درج بالا مسلمان گھرانوں کو گھیر لیا۔ ان مسلمانوں کو یقین دلایا گیا کہ اگر وہ ہندو بن جائیں، تو انھیں راشن کارڈ، اچھی ملازمت، مخصوص رقم حتیٰ کہ شناختی کارڈ بھی فراہم کیے جائیں گے۔

بچپن سے غربت کے پنجوں میں پھنسے بعض مسلمان بہتر زندگی کی چاہ میں ہندو بننے پر تیار ہو گئے۔ چناں چہ ۸ دسمبر ۲۰۱۴ء کو ایک تقریب میں ان ستاون مسلم گھرانوں کے اہل خانہ کو ہندو بنایا گیا۔ انتہا پسند جماعتوں نے اس تقریب کو ’’گھر واپسی‘‘ کے نام سے مشتہر کیا۔

جب ’’گھر واپسی‘‘ تقریب کی خبریں بھارتی اخبارات میں شائع ہوئیں، تو بھارت میں آباد تقریباً اٹھارہ کروڑ مسلمانوں میں تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ ادھر ۵۷ مسلم

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

خاندانوں کو ہندو بنا کر انتہا پسند جماعتوں کے کارکن غائب ہو گئے۔ ان گھرانوں کو سہولتیں فراہم کرنے کے جو وعدے کیے گئے تھے، ان میں سے ایک بھی پورا نہیں ہوا۔ اب ان مسلمانوں کو احساس ہوا کہ انھیں چکمہ دیا گیا ہے۔

چناں چہ ان مسلمانوں نے آگرہ میں آباد اپنے بھائی بندوں کو بتایا کہ انتہا پسند جماعتوں کے کارکنوں نے انھیں کیونکر ٹھگ لیا اور بے وقوف بنایا۔ یوں آگرہ کے مسلمانوں کی زبانی رفتہ رفتہ سبھی بھارتیوں کو علم ہوا کہ انتہا پسندوں نے غریب اسلامیوں کے ساتھ کیا فراڈ کیا ہے۔

دریں اثنا آگرہ آر ایس ایس کے سربراہ لیڈر، راجشوار سنگھ کا ایک خط بھارتی میڈیا میں گردش کرنے لگا۔ راجشوار سنگھ نے یہ خط آر ایس ایس کے ہیڈ کوارٹر کو لکھا تھا۔ اس میں قومی لیڈروں سے رقم بھیجنے کی استدعا کچھ یوں کی گئی:

''مسلمانوں اور عیسائیوں کو ہندو بنانے کے لیے مخصوص آر ایس ایس کی ہماری ذیلی تنظیم، دھرم جگرن منچ پچھلے ایک سال میں ریاست اترپردیش (یوپی) میں چالیس ہزار غیر ہندوؤں کو ہندو بنا چکی۔ ان میں سے دو ہزار مسلمان تھے۔

''اس سال ہم کم از کم ایک لاکھ عیسائیوں اور مسلمانوں کو ہندو بنانے کا عزم رکھتے ہیں۔ مگر اس کام کے لیے کارکن اور بہت سی رقم درکار ہے۔ ایک کارکن مسلم آبادی میں کام کرے، تو اس پر ۵ لاکھ روپے خرچ ہوتے ہیں۔ جبکہ عیسائی بستی میں تبلیغ کرنے والے ہر ہندو کارکن پر ۶ لاکھ روپے خرچہ اٹھتا ہے۔

''ہیڈ کوارٹر سے گزارش ہے کہ وہ ہمیں زیادہ سے زیادہ رقم روانہ کرے تاکہ بھارت کو مکمل طور پر ہندو بنانے کا پروگرام زور وشور سے جاری رہے۔''

درج بالا خط سے عیاں ہے کہ انتہا پسند ہندو غریب مسلمانوں کو سنہرے مستقبل کا خواب دکھلاتے، ان کے جذبات سے کھیلتے اور انھیں ہندو بنا لیتے ہیں۔ یہ طریق واردات زبردستی ہندو بنانے کے زمرے میں نہیں آتا، مگر ایک طرح کا فراڈ اور ٹھگی ضرور ہے۔

آگرہ کا رہائشی عبدالرشید بھی اچھی زندگی کی لالچ میں آ کر ہندو ہو گیا۔ وہ بتاتا ہے ''آر ایس ایس کے مقامی لیڈروں نے مجھے یقین دلایا کہ شناختی کارڈ اور راشن کارڈ ہی نہیں ۲۵ ہزار روپیہ بھی دیا جائے گا۔ چناں چہ میں ایک تقریب میں ہندو بن گیا۔ لیکن ان لیڈروں نے پلٹ کر خبر نہیں لی اور ایک بھی وعدہ پورا نہیں کیا۔''

عبدالرشید برمی مسلمان ہے۔ دو سال قبل وہ اپنی بیوی اور بچے کے ساتھ غیر قانونی طور پر بھارت میں داخل ہوا۔ بھارتی شہروں میں مختلف ملازمتیں کیں۔ کبھی چائے فروخت کی، تو کبھی رکشا چلایا۔ اب وہ کوڑے کرکٹ سے کام کی چیزیں جمع کر کے ماہانہ ۱۵۰۰ روپے کماتا ہے۔ عبدالرشید کے پاس شناختی کارڈ نہیں، لہٰذا پولیس سے بچتا پھرتا ہے۔ خوف و دہشت کے عالم سے نکلنے کی خاطر ہی

http://www.bookstube.net/

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

مجبوراً اس نے ہندو ہونا قبول کیا۔

جب آگرہ کے مسلمانوں کو عبدالرشید جیسے اپنے غریب بھائی بندوں کی حالت زار کا علم ہوا، تو وہ ان کی مالی مدد کرنے لگے۔ انھیں تسلی و دلاسا بھی دیا۔ آج علما کی زیرِ نگرانی وہ سبھی مسلمان دوبارہ مشرف بہ اسلام ہو چکے جو ہندو بن گئے تھے۔

مزید برآں بھارتی مسلمانوں نے اعلان کیا ہے کہ وہ انتہا پسند ہندوؤں کی سازشوں کا بھرپور مقابلہ کریں گے۔ اس ضمن میں تبلیغِ دین کی خاطر انھوں نے ''گھر گھر اسلام'' نامی پروگرام شروع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

دوسری طرف مسلمانوں اور عیسائیوں کو بہتر زندگی کا جھانسہ دے کر ہندو بنانے پر کانگریس اور دیگر اپوزیشن پارٹیوں نے پارلیمان میں زبردست احتجاج کیا اور پارلیمانی کارروائی نہیں ہونے دی۔ آخر حکمران پارٹی، بی جے پی کے دباؤ پر انتہا پسند ہندو جماعتوں نے ''گھر واپسی'' جیسے اپنے منصوبوں میں عمل درآمد روک دیا۔

بھارتی میڈیا کے مطابق وزیراعظم نریندرا مودی نے انتہا پسند جماعتوں کے قائدین کو دھمکی دی تھی کہ اگر مسلمانوں و عیسائیوں کو ہندو بنانے کا پروگرام ختم نہ ہوا، تو وہ مستعفی ہو جائیں گے۔ یہ دھمکی کارگر ثابت ہوئی۔ واضح رہے، بی جے پی انتہا پسند جماعتوں کا سیاسی روپ ہے۔ اس سیاسی جماعت کے اکثر لیڈر نریندرا مودی سمیت کسی نہ کسی انتہا پسند ہندو تنظیم سے وابستہ رہے ہیں۔

☆☆

اپریل ۲۰۱۴ء میں جب نریندرا مودی کی کامیابی کے آثار نمایاں ہوئے، تو کئی بھارتی دانشوروں نے یہ خدشہ ظاہر کیا تھا ''مودی حکومت آنے سے انتہا پسند ہندوؤں کی سرگرمیوں کو فروغ ملے گا۔'' درج بالا حقائق عیاں کرتے ہیں کہ یہ خیال عملی جامہ پہن چکا۔

پورے بھارت میں انتہا پسند ہندو مختلف حیلے بہانوں سے مسلمانوں کو ڈرا دھمکا رہے ہیں۔ ان کی تمنا ہے کہ سبھی مسلمان ہندو ہو جائیں...... کیونکہ وہ مسلمان ہونے سے قبل ہندو تھے۔ آر ایس ایس کا سربراہ، موہن بھگت یہی نظریہ رکھتا ہے۔ جبکہ دھرم جگران منچ اعلان کر چکی کہ وہ ۲۰۲۱ء تک سبھی عیسائیوں اور مسلمانوں کو ہندو بنانا چاہتی ہے۔

دسمبر ۲۰۱۴ء کے اوائل میں بھارتی وزیر مملکت خوراک، نرنجن جیوتی نے لکھنؤ میں ایک بڑے جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے ہندوؤں سے کہا: ''اب آنے والے سبھی الیکشنوں میں رام زادوں (رام کے بیٹوں) کا انتخاب کرنا اور حرام زادوں کو مسترد کر دینا۔'' حرام زادوں سے مراد وہ تمام سیاست دان ہیں جو بی جے پی سے تعلق نہیں رکھتے۔ اس اشتعال انگیز تقریر کے خلاف بھی بھارتی پارلیمان میں زبردست احتجاج ہوا اور وزیر مملکت کو معافی مانگنا پڑی۔

مزید برآں پچھلے ہی ماہ مودی حکومت نے پنڈت مدن موہن مالویہ کو سب سے بڑے بھارتی سول اعزاز ''بھارت رتنا'' سے نوازا۔ یہی پنڈت مالویہ ہندو انتہا پسندی کے بانیوں میں شامل ہے۔ اس نے بیسویں صدی کے اوائل میں لالہ لاجپت رائے کے ساتھ مل کر پہلی انتہا پسند ہندو تنظیم ''ہندو مہا سبھا'' کی بنیاد رکھی۔

مہا سبھائی لیڈروں ہی نے ہندوستان میں ہندو مسلم فساد کے بیج بوئے۔ عام ہندوؤں کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکایا اور یوں دونوں اقوام کے مابین دشمنی کی بنیاد رکھ دی۔ بی جے پی کا بانی، شیاما پرشاد مکر جی بھی مہا سبھائی لیڈر تھا۔

◆◆◆

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

ہاروت ماروت کا پُراسرار کنواں

چاہِ بابل

علمائے اسلام کے اقوال کی روشنی میں سحر و فسوں سے وابستہ ایک قدیم کنویں کی اصلیت آشکار ہوگئی

حافظ نذر احمد

دنیا کے قدیم ترین آثار میں چاہِ بابل بھی شامل ہے۔ اس کنویں کا ذکر قرآن مجید کے علاوہ بائبل میں بھی آیا ہے۔ اب جبکہ بابل شہر ہی نہیں رہا، اس کنویں کے وجود کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

لیکن بابل کہاں ہے؟ بابل کا کنواں کس نوعیت کا تھا؟ ہاروت ماروت (جن کا نام چاہ بابل کے ساتھ ساتھ لازم و ملزوم کی صورت رکھتا ہے) ان کے سحر کی کیفیت کیا تھی؟ اور خود سحر کیا ہے؟ چاہ بابل اور اس کے وائف سمجھنے کے لیے اس قسم کے متعدد سوالات ذہن میں ابھرتے ہیں۔

قرآن مجید کا بیان

ان تمام سوالوں کے جواب کے لیے ہم قرآن مجید کی سورۃ البقرہ کی طویل ترین آیت (۱۰۲) کا ترجمہ نقل کرتے ہیں جس میں ان بیشتر امور کا ذکر موجود ہے:

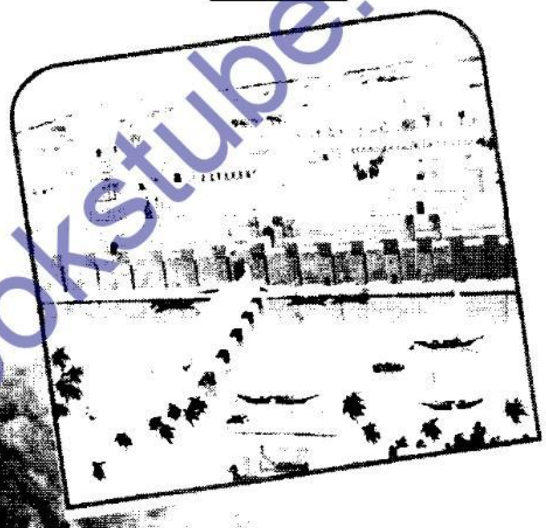

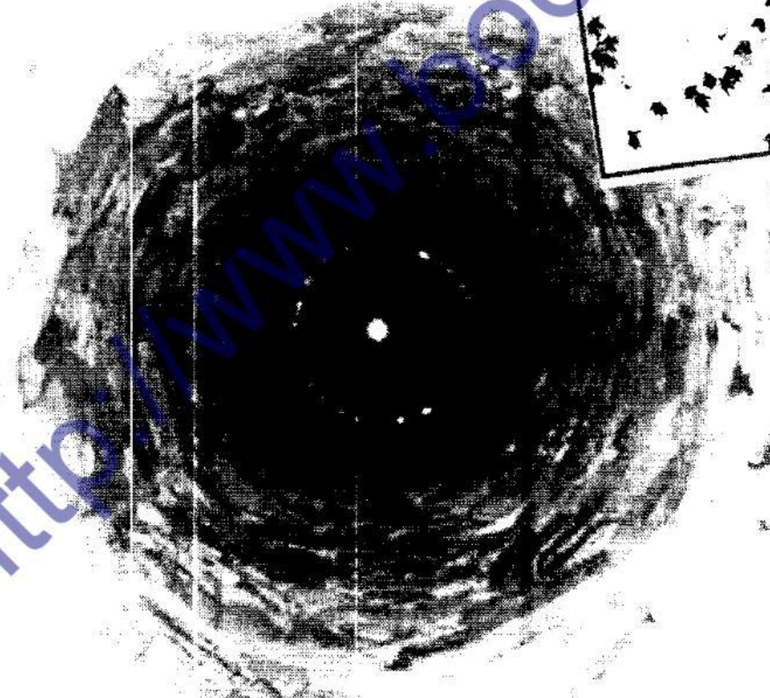

http://www.bookstube.net/

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

"اور یہ لوگ اس علم کے پیچھے لگ گئے جو سلیمان کی بادشاہت میں شیاطین پڑھا کرتے تھے۔ اور سلیمان نے کفر نہیں کیا۔ البتہ شیطان کفر کیا کرتے تھے۔ وہ لوگوں کو سحر کی تعلیم دیتے، اور وہ اس علم کے پیچھے لگ گئے جو بابل میں دو فرشتوں ہاروت ماروت پر اتارا گیا تھا۔ اور وہ دونوں کسی کو بھی نہیں بتلاتے تھے جب تک یہ نہ کہہ دیتے کہ ہم تو اس ایک ذریعۂ امتحان ہیں۔ سو تم کفر اختیار نہ کر لینا۔ مگر ان دونوں سے وہ (سحر) سیکھتے، جس سے وہ خاوند اور بیوی کے درمیان جدائی ڈالتے، حالانکہ وہ کسی کو بھی اس کے ذریعہ نقصان نہ پہنچا سکتے تھے، مگر ہاں ارادۂ الٰہی سے۔

"اور یہ لوگ وہ چیز سیکھتے ہیں جو انھیں نقصان پہنچا سکتی ہے۔ اور یہ خوب جانتے ہیں کہ جس نے اسے اختیار کیا، اس کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔ اور بہت ہی بری ہے وہ چیز جس کے عوض انھوں نے اپنے آپ کو فروخت کر ڈالا ہے۔ کاش وہ جانتے۔"

بائبل کے حوالے

بائبل کے مندرجہ ذیل مقامات میں ان امور کے بارے میں تفصیلات موجود ہیں:

۱۔ کتاب ۱، سلاطین ۱۱،۱۲

۲۔ کتاب ۲، سلاطین باب ۱۷، آیت ۱۷، ۱۹

۳۔ کتاب مکاشفہ باب ۱۰ آیت ۴،۵۔ باب ۱۸ آیات ۲۳، ۲۴، ۳۰۔

بائبل کے تفصیلی بیان سے صرف نظر کرتے ہوئے ہم صرف حوالہ جات پر اکتفا کریں گے۔ البتہ ان کی روایات کا خلاصہ "نقل کفر، کفر نہ باشد" کے بمصداق پیش ہے۔ اس کی صحت کی ذمے داری لینا ہمارے بس سے باہر ہے اور شاید اس کے لیے خود یہود و نصاریٰ کے علما بھی تیار نہ ہوں۔ اسرائیلی روایات کا خلاصہ یہ ہے:

ہاروت ماروت دو فرشتے تھے۔ انھوں نے اللہ کے سامنے انسانوں کے گناہوں کا مذاق اڑایا کہ تیری مخلوق ہر قسم کے انعام کے باوجود گناہ کرتی ہے۔ اللہ کو ان کا طنز پسند نہ آیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، اگر تم دنیا کے ماحول میں ہوتے تو یہی کرتے۔ فرشتوں نے اپنی عصمت کا دعویٰ کیا، تو اللہ تعالیٰ نے انھیں زمین پر بھیج دیا۔ یہاں ایک حسین عورت تھی، جس کا نام زہرہ تھا۔ فرشتے اس پر عاشق ہو گئے۔ اس عورت نے کہا: وصل کی شرط یہ ہے کہ تم شراب پیو، قتل کرو اور بتوں کو سجدہ کرو۔ ان پر عشق کا بھوت ایسا سوار ہوا کہ انھوں نے شراب پی، قتل کیا اور بت پرستی سے بھی گریز نہ کیا۔

زہرہ نے پھر ہاروت ماروت سے آسمان پر جانے کا راز دریافت کیا تو انھوں نے زہرہ کو "اسم اعظم" سکھا دیا۔ وہ اس کی مدد سے آسمان پر چلی گئی اور فرشتے راز الٰہی افشا کرنے کے جرم میں چاہ بابل میں قید کر دیے گئے۔ اس جرم میں وہ قیامت تک کنویں کے اندر لٹکے رہیں گے۔ ساری دنیا کا دھواں ان کی ناک کے ایک نتھنے سے داخل ہو کر دوسرے سے گزرتا رہے گا۔

محاکمہ

ہم درج بالا داستان کو حقیقت کے بجائے صرف ایک کہانی تصور کرتے ہیں۔ اس میں حقیقت کم ہے، اور افسانوی رنگ زیادہ جو عقل اور دین دونوں کے خلاف ہیں۔ بھلا فرشتوں کا عشق و سرمستی سے کیا تعلق؟ سب سے بڑی بات یہ کہ قرآن مجید نے فرشتوں کے بارے میں گواہی دی ہے: "وہ حکم الٰہی کی نافرمانی نہیں کرتے اور انھیں جو بھی حکم دیا جاتا ہے وہی کرتے ہیں۔" (سورۃ التحریم ۶۶:۶)

امام ابن کثیر نے اپنی مشہور تفسیر ابن کثیر میں درج بالا واقعات نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ "مسند امام احمد میں حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کی ایک روایت حضور ﷺ سے

http://www.bookstube.net/

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

منسوب ہے۔ قرینِ قیاس یہ ہے کہ وہ دراصل کعب احبار کا بیان ہے، رسول اللہ ﷺ کی حدیث نہیں ہے۔ اور کعب احبار نے صرف اسرائیلی قصوں سے نقل کر دیا ہے۔ (تفسیر ابن کثیر جلد، ص ۱۴۱)

امام فخر الدین رازی نے ان قصوں کو نقل کرنے کے بعد لکھا کہ یہ سب کچھ فاسد اور مردود ہے۔ عرب عالم دین شہاب عراقی نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ جو شخص ان قصوں کو مانے وہ اللہ کا منکر ہے۔ وجہ یہی کہ فرشتے معصوم ہوتے ہیں اور قصے میں انھیں گنہگار بلکہ شیطان خصلت پیش کیا گیا ہے۔ قاضی عیاض کی رائے بھی یہی ہے۔

ہاروت ماورت کون تھے؟

چاہ بابل کے سلسلے میں سب سے اہم بحث ہاروت ماروت کے بارے میں ہے کہ وہ کون تھے؟ ان کے بارے میں یہود کے ہاں عجیب و غریب روایات مشہور ہیں۔

آرمینیا کی مذہبی کتابوں میں ہاروت ماروت کو دیوتا بیان کیا گیا ہے۔ ان کا وطن جودی پہاڑی بتلایا گیا جسے عبرانی زبان میں اخری طاغ کہتے ہیں۔ کچھ عرصہ قبل خط میخی میں لکھے ہوئے کچھ کتبات دستیاب ہوئے ہیں۔ ان کتبوں میں اس زمانے کے خیالات اور مشہور واقعات کی تفصیل موجود ہے لیکن ان میں ہاروت ماروت کا نام کلمشن لکھا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ ہاروت کا ہی بگڑا ہوا تلفظ ہو۔ (تلمود مدارش یدکوت باب ۴۴)

قرآن مجید میں انھیں ''ملکین'' کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ وما انزل علی الملکین ببابل ھاروت و ماروت (سورۃ البقرہ ۲:۱۰۲) ''ملکین'' کا واحد ''ملک'' ہے جس کے معنی ہیں فرشتہ۔ بہت سے مفسرین نے اس پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ہاروت ماروت اصلاً فرشتے نہ تھے۔ انھیں محض مجازی طور پر ملک کہا گیا۔ وہ

صاحبِ مضمون

حافظ نذر احمد ۱۹۱۹ء میں ضلع بجنور (ہندوستان) میں پیدا ہوئے۔ پنجاب یونیورسٹی سے گریجوایشن کی۔ تحریک پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ۱۹۷۴ء میں لاہور میں ''تعلیم القرآن خط کتابت اسکول'' کی بنیاد ڈالی۔ اس ادارے کے قیام کا مقصد پاکستانی عوام کو قرآن پاک کی تعلیمات سے آگاہ کرانا تھا۔ ادارے کے کورسوں کو بہت مقبولیت ملی اور پاکستان کے طول و عرض میں لاکھوں پاکستانی ان سے مستفید ہوئے۔ آپ محقق و مصنف بھی تھے۔ اسلامیات، قرآنیات اور دینیات کے موضوعات پر کتب تحریر کیں۔ ۳ ستمبر ۲۰۱۱ء کو وفات پائی۔

انسان اور اپنے زمانے کے بااقتدار بادشاہ تھے۔ (تفسیر بیضاوی) چناں چہ آج کل بھی ہمارے ہاں ''ملک'' کے نام سے ایک گوت (خاندان) موجود ہے۔ تمام ککے زئی اور بہت سے راجپوت بھی اپنے آپ کو ملک کہتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ نام کے ساتھ ملک لگ جانے سے وہ فرشتے نہیں بن جاتے۔

شہر بابل

یہ شہر دریائے فرات کے کنارے آباد تھا۔ اس پورے علاقے کو بھی بابل ہی کہتے تھے۔ اپنے زمانے میں یہ علاقہ تہذیب و تمدن کا مرکز تھا۔ بابل و نینوا کی تہذیب عالمی تاریخ میں بہت اونچا مقام رکھتی تھی۔ ان لوگوں کا رہن سہن دوسروں کے لیے نمونہ تھا۔ بخت نصر کا عہد اس تہذیب کے انتہائی عروج اور ترقی کا دور تھا۔ اس کے بعد یہاں کی تہذیب کو زوال آنا شروع ہو گیا۔

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

جدید جغرافیہ میں بابل دنیا کے نقشے پر عراق عرب میں واقع ہے لیکن صرف کھنڈروں کی صورت۔ کبھی یہ شہر میلوں تک پھیلا ہوا تھا۔ مؤرخین کا بیان ہے کہ بابل کے گرد ۵۵ میل لمبی فصیل تعمیر کی گئی تھی۔ انھوں نے اسے "ہفت عجائبات عالم" میں شمار کیا ہے۔ کالدیا اور کلدانیہ اس کے پرانے نام تھے۔ انجیل مقدس میں اس شہر کا ذکر بار بار ہوا ہے۔ ملاحظہ ہو: (کتاب دانیال ۴:۲، کتاب مکاشفہ ۱۰:۵، ۱۷، ۱۳، ۱۸:۲۳ تا ۲۴)

شہر بابل موجودہ بغداد سے قریباً ساٹھ میل دور جنوب کی سمت دریائے فرات کے کنارے آباد تھا۔ اس کے کھنڈروں کے قریب ہی آج بلہ (حلہ) کا شہر آباد ہے۔ ان کھنڈروں میں نہروں کے آثار، پانی کے نلکوں کے نشان، شاہی محلات کی بنیادیں اور مضبوط قلعوں کے نشانات اب بھی موجود اور اپنی تہذیب و تمدن کے کمال کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔

شہر بابل کی مشہور عمارات میں مندرجہ ذیل خاص اہمیت کی حامل تھیں:

قصر سمیرامیس، بخت نصر کا محل، برج نمرود، معلق باغ جو کئی طبقات پر مشتمل تھا، ایک عالی شان رصد گاہ، بعبوس کا مقبرۂ شہر کی طویل و عریض سہ طرفہ حیرت انگیز فصیل اور برج بابل وغیرہ۔

برج بابل کے متعلق مؤرخین لکھتے ہیں کہ اس برج میں سات رنگ کے طبقے تھے۔ ان کا تعلق سات اجرام سماوی سے تھا: پہلا طبقہ سیاہ رنگ کا تھا: یہ زحل سے منسوب تھا۔ دوسرا طبقہ سفید رنگ کا تھا: یہ زہرہ سے نسبت رکھتا۔ تیسرا طبقہ نارنجی رنگ کا تھا: اس کی نسبت مشتری سے تھی۔ چوتھا طبقہ نیلے رنگ کا تھا: یہ عطارد سے میلان رکھتا۔ پانچواں طبقہ قرمزی رنگ کا تھا: اس کا مریخ سے میل تھا۔ چھٹا طبقہ نقرئی تھا: اس کا تعلق چاند سے تھا۔ ساتواں طبقہ طلائی تھا: اس کی نسبت سورج سے تھی۔

بابل کے لوگ معبودانِ باطل کے پرستار تھے۔ ان کے خیال میں یہ معبود آسمان کی فضاؤں میں رہتے تھے۔ یہ لوگ اپنی قسمت ان سے وابستہ سمجھتے۔ اسی لیے وہ نجوم شناسی اور علم افلاک میں بڑے ماہر تھے۔ ان کے بت کدوں میں ستاروں کی پرستش ہوتی تھی۔

بابل کے کھنڈر اور چاہِ بابل

جنگ عظیم دوم کے دوران ہمارے عزیز محترم، چودھری علی احمد سرور عراق گئے۔ انھوں نے بابل کے کھنڈر اور چاہ بابل کا بغور مشاہدہ کیا۔ ہم اس عنوان کے تحت انھی کے غیر مطبوعہ سفرنامہ کے اقتباسات شکریہ کے ساتھ نقل کر رہے ہیں:

''آج یہ سب کھنڈر کے ڈھیر، لیکن چشم بینا کے لیے سرمۂ بصیرت ہیں۔ ان پُرہول ڈھیروں میں عجیب ہیبت پنہاں ہے اور ساتھ ہی ایک اندوہناک اور نہایت حسرت آمیز درسِ عبرت بھی۔

بابل بغداد سے شہر حلہ کو جانے والی سڑک پر چون (۵۴) میل دور واقع ہے۔ اس سڑک کو ایک چھوٹی سی نہر کاٹتی ہے۔ یہیں سے بابل کی حدود شروع ہو جاتی ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ شہر کی فصیل تھی۔ آدھ میل آگے چلیں، تو ایک چھوٹا سا عجائب گھر ہے اور اس کے متصل ایک ریسٹ ہاؤس بنا ہوا ہے۔ یہ دونوں عمارتیں حکومت عراق کے محکمہ آثار قدیمہ نے تعمیر کرائی ہیں۔

عجائب گھر میں بابل کے کچھ عجائبات، تصویر کشی اور نقاشی کے نادر نمونے اور قدیم شہر کا مٹی سے بنا ہوا ماڈل رکھا ہے۔ عجائب گھر کی پشت پر ایک ٹیلہ ہے جس پر نشان راہ کی تختیاں نصب ہیں۔ کچھ آگے شاہ بنوکدنصر (بخت نصر) کے جلوس کا راستہ ہے۔ مشرق کی سمت ''نین ماخ'' کا ایک چھوٹا سا معبد ہے۔ گزرگاہِ جلوس کے مغرب میں ایک عمارت ہے جو جنوبی محل کے نام سے مشہور ہے۔

http://www.bookstube.net
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

دوسری عمارت معلق باغ (Hanging Garden) کی ہے جسے "محل اعظم" بھی کہتے ہیں۔ اس سے تھوڑی دور آگے ایک تہ خانہ ہے۔ کہتے ہیں یہاں نمرود نے حضرت شعیب علیہ السلام کو شیر کے آگے ڈالا تھا۔ اس تہ خانہ کی دیواروں پر تصاویر بنی ہیں جو اس دور کے ماہرین فن کی فنکاری کا ایک بہترین نمونہ ہیں۔ جو اینٹیں یہاں استعمال ہوئیں، وہ اپنی شناخت اور مضبوطی کے اعتبار سے دور حاضر سے بہت بہتر ہیں۔ چند قدم آگے چل کر ایک کنواں آتا ہے جو اوپر سے مربع شکل کا ہے۔ اس کنویں کو "چاہ بابل" کے نام سے منسوب کرتے ہیں۔

چاہ بابل کے قریب پتھر کا ایک بڑا مجسمہ ہے اور ساتھ ہی چند معبد ہیں، جن کو "ننی نورتا" اور "گلا" کے نام سے منسوب کیا گیا ہے۔ "برج بابل" بھی اس کے قریب ہی واقع ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سکندر اعظم نے ہندوستان سے واپسی پر داعی اجل کو لبیک کہا۔

کھنڈروں سے دو تین میل کے فاصلے پر ایک مسجد کا گنبد نظر آتا ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ مسجد حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے تعمیر کرائی تھی۔ اس کے گنبد اور در و دیوار پر نہایت نفیس نقش و نگار ہیں۔ انھیں دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کاریگر ابھی چند دن پہلے کام سے اٹھ کر گئے ہیں۔

بابل کے حکمران

بابل کے بانی کا نام نمرود بیان کیا گیا ہے۔ اس کا زمانہ قریباً چار ہزار سال قبل مسیح پہلے آیا۔ اس کے باپ کا نام کوش اور دادا کا نام حام تھا۔ حضرت مسیح سے کوئی پونے چار ہزار سال قبل بنو عاد کے سامی قبیلے نے بابل پر قبضہ کر لیا۔ دو یا ڈھائی سو سال ان کی حکومت رہی۔

سامیوں کے بعد اس پر یلامی خاندان کا قبضہ ہو گیا۔ وہ نمرود اسی خاندان کا ایک حکمران تھا جس نے خدائی کا دعویٰ کیا۔ نمرود اس کا خاندانی لقب تھا، اس کا اصل نام ذوالامر بیان کیا گیا ہے۔ نمرود کا زمانہ ۲۳۰۰ سال قبل مسیح میں آیا۔ اسی نمرود نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو زندہ آگ میں جلا دینے کا حکم دیا تھا۔

اس خاندان کے بعد بابل کے بادشاہوں میں بنوکدنصر بہت مشہور ہوا۔ اسے بخت نصر بھی کہتے ہیں۔ اس نے بہت سے علاقے بزور شمشیر فتح کیے۔ اس کے ہاتھوں فلسطین میں یہودیوں پر تباہی آئی اور بیت المقدس کا شہر اجڑا۔ اس نے کتاب مقدس کا ایک ایک نسخہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر جلا ڈالا۔ اس خاندان کا آخری تاجدار نیل شغر تھا۔

حضرت مسیح سے ۵۳۸ (اور بعض روایات کے مطابق ۵۴۹) سال قبل فارس کے بادشاہ نے بابل پر حملہ کر دیا اور اس طرح یہ ملک ایران کا باج گزار بن گیا۔

بابل کا جادو

حضرت سلیمان علیہ السلام جب وفات پا گئے تو بنی اسرائیل بالعموم سحر و طلسم میں مصروف رہنے لگے۔ انھوں نے حقیقت چھوڑ کر جادوگری، شعبدہ بازی، طلسم بندی کو اختیار کر لیا۔ بابل کے باشندے اس سلسلے میں سب سے آگے بڑھ گئے۔

انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس کے فاضل محققین کا بیان ہے کہ اس شہر کے باشندے بہت بڑے جادوگر تھے۔ ان کی مذہبی اور دینیات کی کتابوں میں بھی جگہ جگہ جادو منتر ہی نظر آتے ہیں۔ گویا یہ لوگ سحر اور طلسم کو مذہب کا درجہ دے چکے تھے (ملاحظہ ہو کتاب مذکور جلد ۲ صفحہ ۱۱۶)

مختصر یہ کہ بابل جادو منتر اور سفلی عملیات میں دور دور تک مشہور تھا۔ کالدیہ اس شہر کا پرانا نام تھا۔ اسی لیے انگریزی میں آج بھی جادوگر کو "کالڈین" کہا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہیے کہ اس شہر کا باشندہ ہونا ہی جادوگر ہونے کی علامت تھی۔

http://www.bookstube.net/

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

ملاقات: الطاف حسین قریشی
صہیب اعجاز قریشی، کامران الطاف

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk

پچھلے چھ سات برس سے بجلی، گیس اور تیل کے بحرانوں کے باعث قومی معیشت کو سخت نقصان پہنچا۔ پے در پے آنے والے بحرانوں سے ایک طرف شہری پریشان ہوئے تو دوسری طرف قومی صنعت و تجارت اور کاروبار کو نقصان پہنچا۔ تاہم حال ہی میں عالمی منڈی میں تیل کی قیمتوں میں کمی تازہ ہوا کا جھونکا ثابت ہوئی۔

حکومت پاکستان نے بھی ڈیزل اور پٹرول کی قیمت کم کر دی۔ اس کمی سے صنعتوں کو فائدہ ملنا شروع ہو گیا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ اس غیبی امداد سے ہماری لڑکھڑاتی معیشت اپنے پیروں پر کھڑی ہو جائے۔ حکومت کی آمدن میں اضافہ بھی عوامی ترقی و خوشحالی بڑھانے میں معاون ثابت ہوگا۔

پاکستانی حکومت نے شہریوں پر چار بڑے ٹیکس سیلز ٹیکس، انکم ٹیکس، کسٹم ڈیوٹی اور فیڈرل ایکسائز ڈیوٹی لگا رکھے ہیں۔ ایف بی آر (فیڈرل بورڈ آف ریونیو) وہ سرکاری ادارہ ہے جس پر شہریوں سے درج بالا ٹیکس جمع کرنے کی ذمے داری عائد ہے۔ اس کے دو بڑے حصے ہیں: (۱) ان لینڈ ریونیو ونگ (سابقہ انکم ٹیکس ڈیپارٹمنٹ) اور (۲) پاکستان کسٹم سروس۔

بدقسمتی سے پاکستان میں خصوصاً انکم ٹیکس دینے کی شرح بہت کم ہے۔ اعداد و شمار کے مطابق صرف آدھ فیصد پاکستانی انکم ٹیکس دیتے ہیں۔ دوسری طرف پاکستانی شہروں میں گھومیے پھریے تو بڑے عالیشان بنگلے اور بیش قیمت کاریں دیکھ کر یہی لگتا ہے کہ کم از کم ایک کروڑ ہم وطن تو ضرور اچھا خاصا انکم ٹیکس دے سکتے ہیں۔

حال ہی میں انکشاف ہوا کہ پاکستان میں ۶۴ ہزار رجسٹرڈ کمپنیاں ہیں۔ لیکن ان میں سے صرف ۱۵ ہزار ٹیکس

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

آٹھ فیصد پاکستانی ٹیکس دیتے ہیں، بھارت میں شرح تین فیصد ہے

گوشوارے داخل کراتی ہیں۔ ہم سے زیادہ تو بھارتی شہری محب وطن اور دیانت دار ہیں...... وہاں تقریباً ۳ فیصد لوگ انکم ٹیکس ادا کرتے ہیں۔ جن ممالک میں قانون مضبوط و توانا ہے، جیسے امریکا، برطانیہ اور جرمنی، وہاں تو ۵۰ فیصد سے زائد آبادی ٹیکس دیتی ہے۔

پاکستان سمیت کئی ترقی پذیر ممالک میں شہری دو بڑی وجوہ کی بنا پر ٹیکس نہیں دیتے۔ اول یہ کہ انھیں اپنی حکومتوں پر اعتماد نہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ان کی رقم ترقیاتی کاموں پر خرچ نہیں ہوتی بلکہ سیاست دان اور بیوروکریسی اسے ہڑپ کر جاتے ہیں۔

دوم کئی ترقی پذیر ممالک میں ان ڈائریکٹ یا بالواسطہ ٹیکس بہت زیادہ ہیں۔ سیلز ٹیکس، کسٹم ڈیوٹیاں اور فیڈرل ایکسائز ڈیوٹیاں بالواسطہ ٹیکس کی مثالیں ہیں۔ مثلاً پاکستان میں ایف بی آر اپنی ''۷۰ تا ۷۵ فیصد'' آمدن بالواسطہ ٹیکسوں کے ذریعے ہی حاصل کرتا ہے۔

مثال کے طور پر ایف بی آر نے جولائی ۲۰۱۴ء تا جنوری ۲۰۱۵ء انکم ٹیکس کے ذریعے ''۵۲۶ ارب'' روپے حاصل کیے۔ جبکہ سیلز ٹیکس کی مد میں ''۶۱۵ ارب روپے'' حاصل ہوئے۔ اسے کسٹم ڈیوٹیوں کے ذریعے ۱۵۶ ارب روپے اور فیڈرل ایکسائز ڈیوٹیوں کے ۱۸۳ ارب روپے ملے۔

حکومت کی نااہلی و کرپشن اپنی جگہ، لیکن کیا ان وجوہ کی بنا پر ایک پاکستانی اپنی ایمان داری ترک کر دے؟ یہ ہر صاحب حیثیت پاکستانی کی اخلاقی، مذہبی اور قانونی ذمے داری ہے کہ وہ نیک نیتی سے اپنا انکم ٹیکس ادا کرے۔

یہ امر باعث مسرت ہے کہ نواز حکومت کرپشن پہ قابو پانے کی جدوجہد کر رہی ہے۔ اسی تناظر میں وزیراعظم پاکستان نے جولائی ۲۰۱۳ء میں جناب طارق باجوہ کو ایف بی آر کا چیئرمین مقرر کیا۔ آپ کا شمار اعلیٰ انتظامی صلاحیتیں رکھنے والے نیک نام سرکاری افسروں میں ہوتا ہے۔

جناب طارق باجوہ نے پنجاب یونیورسٹی سے قانون اور سیاسیات میں ایم اے کیے۔ بعدازاں ہارورڈ یونیورسٹی کے کینیڈی اسکول آف گورنمنٹ سے پبلک ایڈمنسٹریشن میں ماسٹرز کیا۔ پھر وطن عزیز کی بیوروکریسی کا حصہ بنے اور کئی اہم عہدوں پر تعینات رہے۔ ایف بی آر آنے سے قبل بطور سیکرٹری خزانہ پنجاب خدمات انجام دے رہے تھے۔

ایف بی آر کی سربراہی سنبھالتے ہی آپ نے اصلاحات کا جامع پروگرام شروع کیا۔ سرفہرست ادارے سے کرپشن کا خاتمہ کرنا تھا۔ چناں چہ کرپٹ افسروں کے گرد گھیرا تنگ کیا گیا۔ ساتھ ساتھ یہ اقدامات بھی کیے گئے کہ انکم ٹیکس نہ دینے والے پاکستانیوں کو قانون کی گرفت میں لایا جائے۔

پچھلے دنوں اسلام آباد کی ایک خنک شام جناب طارق باجوہ کے ساتھ بھرپور نشست رہی۔ ہمارے ممدوح نے بڑے مدلل انداز میں ایف بی آر میں جنم لینے والی انقلابی تبدیلیوں کا تذکرہ کیا۔ ان کی باتوں سے امید کے پھول کھلے، تو راہ میں بکھرے کانٹے بھی نمایاں ہوئے۔ جناب طارق باجوہ سے لیا گیا معلوماتی انٹرویو پیش خدمت ہے۔

☆☆☆

سوال: کہا جاتا ہے کہ بحیثیت سیکرٹری خزانہ

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

پنجاب آپ نے بہت کام کیا۔ شہباز شریف بھی آپ کے بہت مداح ہیں۔ وہ آپ کو دیانت دار اور محنتی شخصیت سمجھتے ہیں۔

جواب: شہباز صاحب خود محنت کرتے ہیں اور دوسروں سے بھی محنت کراتے ہیں۔ ان کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہمیشہ صف اول پہ رہ کر دوسروں کی رہنمائی کرتے ہیں۔

سوال: لیکن بعض اوقات وزیراعلیٰ بہت بوجھ اٹھا لیتے ہیں۔ ہمارا کہنا ہے کہ دوسروں کی تربیت بھی ہونی چاہیے۔ حکومت ایک آدمی کا نام تو نہیں، پوری ٹیم مل کر کام کرتی ہے۔ بہرحال انھوں نے طرز حکمرانی کا اپنا انداز بنا لیا ہے۔ شاید وہ اسے بدلنے میں دشواری محسوس کرتے ہیں۔ گو انھیں تبدیل ہونے کی سعی کرنا چاہیے۔

جواب: مسئلہ یہ ہے کہ افسر شاہی کا معیار بھی رفتہ رفتہ گرتا جا رہا ہے۔ لہٰذا جو اچھے کام کرنے والے افسر ہوں، ان کی ٹیم سی بن جاتی ہے۔

سوال: یہ بات درست ہے۔ مگر بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ جونیئر افسر کو بہت آگے لایا جاتا ہے۔ ایسے میں میرٹ مجروح ہوتا ہے اور کئی طرح کے سوال اٹھتے ہیں۔ نظام تھوڑی بہت کج روی تو برداشت کر لیتا ہے، مگر بہت زیادہ اتھل پتھل نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔

اب یہ بتائیے کہ ایف بی آر میں آپ کا جاری کردہ اصلاحات کا پروگرام کہاں تک پہنچا اور اس سے کیا فوائد حاصل ہوئے؟

جواب: ہمارا بنیادی مسئلہ دو پہلوؤں سے متعلق ہے۔ اول پہلو آمدن ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ہمیں ٹیکسوں کے ذریعے بہت کم آمدن ہوتی ہے۔ اگر ہم صوبوں کی بھی ملا لیں، تو یہ آمدن جی ڈی پی کی ۵ء۱ فیصد بنتی ہے۔ یہ مقامی اور عالمی، دونوں لحاظ سے کم ہے۔ مثال کے طور پر ترکی میں حکومت کو جی ڈی پی میں ۲۵ تا ۲۶ فیصد آمدن ٹیکسوں سے ہوتی ہے۔ بھارت میں ۱۵ تا ۱۶ فیصد کے قریب ہے۔

دوسرا پہلو یہ کہ انکم ٹیکس دینے والے پاکستانی کون ہیں؟ اس وقت کینیڈا میں ۸۰ فیصد شہری ٹیکس دیتے ہیں۔ ہمارے ہاں صرف آدھا فیصد پاکستانی ٹیکس ادا کرتے ہیں۔ ویسے تو اکثر پاکستانی ٹیکس دیتے ہیں۔ مثلاً کسی نے پری پیڈ فون کارڈ خریدا، تو وہ بھی ٹیکس دیتا ہے۔ لیکن صرف آدھ فیصد پاکستانی اپنے ٹیکس گوشوارے داخل کراتے ہیں۔ جب ایک پاکستانی گوشوارہ داخل کرائے، تبھی وہ ٹیکسوں کے قومی نظام کا حصہ بنے گا۔ ٹیکس گوشوارہ نہ ہونے سے حکومت کو پتا نہیں چل پاتا کہ ایک شہری نے مطلوبہ ٹیکس دیا ہے یا ڈنڈی مار گیا۔

یکم جولائی ۲۰۱۳ء کو صرف سات لاکھ بائیس ہزار پاکستانی ٹیکس گوشوارے فائل کر رہے تھے۔ یہ تعداد بڑھانے کے لیے ایک منصوبہ، "یونیورسل سیلف اسیسمنٹ اسکیم" شروع ہوا تھا۔ اس منصوبے کے مطابق ایک پاکستانی خود فیصلہ کرتا ہے کہ اس کی کتنی آمدن ہے اور اس پر کتنا ٹیکس دیا جائے۔ لیکن یہ منصوبہ اسی وقت کامیاب ہوتا جب آڈٹ اور نگرانی کا سلسلہ چل رہا ہوتا۔ آڈٹ کا نظام کئی برس سے ٹھپ پڑا تھا۔ اسی باعث یہ اسکیم کامیاب ثابت نہیں ہو سکی۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ ٹیکس دہندگان کی تعداد بڑھانا دو تین سال کی بات نہیں، کم از کم دس پندرہ برس مسلسل کوششیں کرنا ہوں گی، تبھی محنت رنگ لائے گی۔ لیکن منزل تک پہنچنے میں دوران سفر کئی رکاوٹیں حائل ہیں اور کانٹے بھی! اسی لیے رفتار کبھی آہستہ رہے گی اور کبھی

http://www.bookstube.net/

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

تیز۔ لیکن یہ سفر جاری رہنا چاہیے، ہمارے پاس اور کوئی چارہ کار نہیں۔

ایک اور مسئلہ یہ تھا کہ صنعتی و کاروباری ٹیکس دہندگان کو ایس آر او (Statutory Regulatory Order) کے تحت سیکڑوں استثنیٰ (چھوٹ) دے دیے جاتے۔ ان استثنیٰ سے صنعت کاروں سے لے کر عام افراد تک مستفید ہوتے۔ چناں چہ بیشتر لوگ کوئی نہ کوئی استثنیٰ پیش کر کے ایف بی آر سے ٹیکس میں چھوٹ حاصل کر لیتے۔ مثلاً یہ کہ ہمارا فلاحی ادارہ ہے، یا ہم نے سامان مہنگا خریدا تھا، اب وہ سستا ہو چکا وغیرہ وغیرہ۔

نواز شریف حکومت کو یہ کریڈٹ جاتا ہے کہ وہ ایس آر او کلچر کا خاتمہ چاہتی ہے۔ اسی لیے پچھلے سال کے دوران چھوٹے موٹے استثنیٰ ہی دیے گئے۔ مثلاً آلوؤں کی درآمد پر ڈیوٹی عائد تھی۔ جب ملک میں آلو کی قلت ہوئی، تو ہم نے وہ ڈیوٹی ختم کر دی۔ ان کے علاوہ حکومت نے کسی کو ٹیکسوں میں بڑی چھوٹ نہیں دی۔ یہ ایک بہت بڑا قدم ہے۔ اس سے ٹیکسوں کا نظام بہتر بنانے میں مدد ملی۔

ماضی میں ۱۰۳ ارب روپے کے استثنیٰ دیے گئے تھے۔ لیکن حالیہ بجٹ میں انھیں ختم کر دیا گیا۔ دراصل لوگ ان سے ناجائز فائدہ اٹھاتے تھے۔ انداز کار میں شفافیت بھی بہت کم تھی۔ پھر ایف بی آر کے افسر بھی ایس آر او کلچر سے مستفید ہوئے۔ وہ اپنے جاننے والوں کو استثنیٰ دے کر کمائی کر لیتے۔ چناں اس کلچر کو ختم کرنا بہت ضروری تھا۔

ٹیکسوں کا نظام صاف و شفاف ہونا چاہیے۔ ہر ایک کو معلوم ہو کہ اس نے کون سے ٹیکس ادا کرنے ہیں۔ ایس آر او کلچر نے اس نظام کو بھی بہت پیچیدہ بنا ڈالا۔ آپ یہ دیکھیے کہ ہماری آٹھ ہزار ٹیرف لائنز ہیں۔ ان سے ساڑھے چھے ہزار پہ مختلف استثنیٰ موجود تھے۔ لہٰذا ایک نئے کاروباری یا صنعت کار کو یہ ایس آر او کلچر سمجھ ہی نہیں آتا۔

ہماری حکومت نے یہ قدم اٹھایا کہ جن استثنیٰ سے عوام کو فائدہ نہیں پہنچ رہا تھا، وہ ختم کر دیے گئے۔ ہم اگلے دو سال میں مزید استثنیٰ ختم کریں گے۔ طرفہ تماشا یہ ہے جب کسی کو کوئی استثنیٰ مل جائے، تو پھر وہ پندرہ بیس سال تک چلتا ہے۔ لہٰذا ہم شفافیت لانے کے لیے ان کا خاتمہ چاہتے ہیں۔ ہمارا نقطہ نظر یہ ہے کہ کوئی استثنیٰ دینا ہی ہے، تو وہ بہ مطابق قانون دیا جائے۔ مثلاً بجٹ میں اس کا اعلان ہو جائے۔ پھر یہ استثنیٰ اتنے آسان ہونے چاہئیں کہ عام آدمی بھی انھیں سمجھ سکے۔

ہم نے دوسرا قدم یہ اٹھایا کہ آڈٹ نظام کو فعال بنایا۔ یہ نظام شروع ہوئے ایک سال ہو چکا۔ خوش آئند بات یہ کہ اس ضمن میں عدالتوں سے بھی ہمیں مدد ملی۔ پہلے ہم متعین حدود کی بنیاد پر آڈٹ کرتے تھے لیکن لوگ انھیں عدالتوں میں چیلنج کر دیتے۔ مثلاً ہم نے ایک حد یہ بنائی کہ جن کی ماہانہ آمدن دس لاکھ روپے سے زائد ہے، ان میں سے منتخب لوگوں کا حساب کتاب آڈٹ ہو گا۔ مگر لوگ عدالت میں یہ سوال اٹھا دیتے کہ پانچ لاکھ یا پندرہ لاکھ روپے آمدن دینے والے کیوں منتخب نہیں ہوتے؟

یہ مسئلہ ختم کرنے کے لیے پچھلے سال ہم نے قرعہ

http://www.bookstube.net/

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

اندازی کا طریق کار اختیار کر لیا۔ اس طریقے سے جن ٹیکس دہندگان کا نام نکلے، انہی کا آڈٹ ہوتا ہے۔ کئی برس بعد پچھلے سال آڈٹ کا ایک چکر مکمل ہوا جو ہماری بڑی کامیابی ہے۔ یہ کام آڈٹ کمشنر کرتے ہیں جن کا اپنا علیحدہ شعبہ ہے۔ چونکہ مشینری کو زنگ لگ گیا تھا لہٰذا ہم نے کمشنروں کو تربیت بھی دلوائی تاکہ وہ اپنا کام صحیح طرح انجام دے سکیں۔ تربیت کا یہ سلسلہ جاری رہے گا تاکہ ہمارے آڈٹ کمشنر بہترین طریقے سے اپنی ذمے داریاں ادا کرتے رہیں۔

سوال: آڈٹ کا چکر مکمل کرنے سے کچھ مالی فائدہ ہوا؟

جواب: جی ہاں، اس کے ذریعے ٹیکس دہندگان کی طرف ۱۵ارب روپے نکل آئے۔ یہ پہلا قدم ہے۔ اس کے بعد ہم متعلقہ لوگوں کو نوٹس دیتے ہیں اور ریکوری کا عمل شروع ہوتا ہے۔ تب کچھ لوگ عدالت میں بھی جاتے ہیں۔ مگر ہمیں امید ہے کہ بذریعہ آڈٹ ہم بھاری رقم جمع کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

یونیورسل سیلف اسیسمنٹ اسکیم کی بنیاد اعتماد ہے۔ ٹیکس دہندگان جو آمدن بتائیں، ہم اُسے مان لیں گے۔ لیکن انھیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ ہم بعض لوگوں کا انتخاب کر کے ان کے حساب کتاب کی پڑتال کریں گے۔ اسی طرح پتا چلے گا کہ ٹیکس گوشوارہ درست فائل ہوا ہے یا نہیں۔

دنیا کے دیگر ممالک میں بھی یونیورسل سیلف اسیسمنٹ اسکیم موجود ہے۔ وہاں آڈٹ ہی حکومت کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ اس کی مدد سے حکومت سعی کرتی ہے کہ لوگ غلط بیانی نہ کریں اور دیانت داری کے ساتھ ٹیکس گوشوارے داخل کرائیں۔

یہ سیلف اسیسمنٹ اسکیم ۲۰۰۱ء میں متعارف کرائی گئی۔ اس سے قبل انکم ٹیکس افسر ٹیکس گوشوارہ دیکھ کر طے کرتا تھا کہ آپ کی آمدن پہ کتنا ٹیکس لگنا چاہیے۔

ہم سے اکثر یہ شکایت ہوتی تھی کہ ایف بی آر نے پہلے سے موجود ٹیکس دہندگان پر سارا بوجھ ڈالا ہوا ہے۔ اس سلسلے میں ہم نے ایک نیا نظریہ متعارف کرایا جسے حکومت منظور کر چکی۔ لہٰذا اس پر عمل درآمد بھی ہو رہا ہے۔

اس نئے نظریے کی رو سے باقاعدہ ٹیکس دینے والے ہر پاکستانی کے ساتھ امتیازی سلوک ہوگا۔ مثال کے طور پر آپ بینک میں رقم رکھوائیں، تو اس پر ۱۰فیصد ودہولڈنگ ٹیکس لگتا ہے۔ ہم نے یہ طے کیا کہ جو پاکستانی ٹیکس دیتا ہے، وہ ۱۰فیصد ہی ادا کرے۔ لیکن ٹیکس نہ دینے والے پر ۱۵فیصد ٹیکس عائد کیا جائے گا۔ اسی طرح ڈیوائنڈ کی مد میں ٹیکس کی شرح ۱۰فیصد ہے۔ مگر ٹیکس نہ دینے والا ۱۵فیصد کے حساب سے ادا کرے گا۔

اسی طرح اگر کوئی شہری غیر منقولہ جائیداد کی خریداری کرے، تو ٹیکس دہندہ ایک فیصد جبکہ غیر ٹیکس دہندہ دو فیصد سرچارج دے گا۔ گاڑیوں کی خرید و فروخت پر بھی ٹیکس دہندہ کم سرچارج دے گا۔ یوں اخراجات کے جو بڑے شعبے ہیں، وہاں باقاعدگی سے ٹیکس دینے والوں کو مالی چھوٹ دی گئی تاکہ انھیں فائدہ پہنچ سکے۔ مدعا یہ بھی ہے کہ ٹیکس نہ دینے والے کے لیے کاروباری اخراجات میں اضافہ ہو جائے تاکہ اسے اپنی غلطی کا احساس ہو۔

ہماری آئندہ بھی کوشش ہو گی کہ ٹیکس دہندگان کو زیادہ سے زیادہ سہولتیں اور مراعات دی جائیں۔ اس طرح کہ وہ مختلف ٹیکس کم شرح سے دیں، جبکہ ٹیکس نہ

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

دینے والوں کے لیے شرح بڑھتی چلی جائے۔ جو شخص ٹیکس نظام میں نہیں آنا چاہتا، اس کے اخراجات بھی زیادہ ہونے چاہئیں۔ یوں پاکستانیوں کو تحریک ملے گی کہ وہ ٹیکس نظام کا حصہ بن کر اپنے جاری اخراجات کم کر سکیں۔

سوال: ٹیکس دہندہ اور نہ دینے والے پاکستانیوں کے مابین تفریق کرنے سے کچھ فرق پڑا؟

جواب: جی ہاں، پچھلے ایک برس میں ۴۰ ہزار پاکستانی نئے ٹیکس دہندہ بن چکے۔ فی الوقت ہمیں ساڑھے آٹھ لاکھ پاکستانیوں کے انکم ٹیکس گوشوارے آ چکے۔ ہمیں امید ہے کہ نئے سال میں ہم نو لاکھ کا عدد پار کر جائیں گے۔

ہماری اب کوشش ہے کہ زیادہ سے زیادہ پاکستانیوں کو ٹیکس نظام میں لایا جائے۔ اس ضمن میں ہم نے ایک قدم یہ اٹھایا ہے کہ جو پاکستانی زیادہ اخراجات کرتے ہیں، ہم مختلف طریقوں ان کی معلومات لینے لگے ہیں۔ مثلاً اگر آپ جہاز میں بیرون ملک جائیں، تو یہ معلومات ہم تک پہنچے گی۔ اسی طرح جو والدین اپنے بچوں کی سالانہ دو لاکھ روپے اسکول فیس دیتے ہیں، ہم ان تک پہنچ رہے ہیں۔

اسی طرح گاڑی خریدنے والے کا نام و پتا ہم تک پہنچتا ہے۔ ہم موبائل کمپنیوں سے بھی ڈیٹا لینے لگے ہیں۔ جو لوگ ماہانہ پچاس ہزار روپے سے زیادہ بل دیتے ہیں، ہم ان کے متعلق جان رہے ہیں۔ یوٹیلٹی کمپنیوں سے بھی ڈیٹا آ رہا ہے۔ بینکوں سے بھی ڈیٹا لینے کی سعی کر رہے ہیں مگر اس پر سٹے آرڈر آ چکا۔

غرض ہم درج بالا ذرائع سے صاحب حیثیت پاکستانیوں کی معلومات اکٹھی کر رہے ہیں۔ اس غرض سے ہمارا ڈیٹا بیس بن چکا۔ لہٰذا ہم امرا کو یہ نوٹس بھیج رہے ہیں کہ آپ اپنی آمدن مدنظر رکھتے ہوئے ٹیکس دیجیے۔ اسی طرح قانون حرکت میں آتا ہے تاکہ انھیں بھی ٹیکس نظام میں لایا جا سکے۔ ہم نے اپنا یہ ہدف مقرر کیا ہے کہ ہر سال ایک لاکھ پاکستانی ٹیکس نظام میں شامل ہو جائیں۔

سوال: گویا آپ ٹیکس نہ دینے والوں کے گرد گھیرا تنگ کر رہے ہیں۔

جواب: جی بالکل! کچھ عرصہ قبل مجھے برطانیہ جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں میں ٹیکس لینے والے ادارے، کسٹمز اینڈ ریونیو کے افسروں سے ملا۔ میں نے ان سے دریافت کیا کہ آپ ٹیکس نہ دینے والوں کو اپنے نظام میں کیسے لاتے ہیں؟ یہ سن کر وہ بہت حیران ہوئے کیونکہ برطانیہ میں ٹیکس نہ دینے کا تصور ہی موجود نہیں، وہاں ٹیکس دینے کا کلچر رواج پا چکا۔

اب ہم نے پاکستان میں بھی اسی کلچر کو جنم دینا ہے۔ نیز پاکستانیوں کے رویے میں بھی مثبت تبدیلی لانی ہے تاکہ وہ قومی فرض جان کر خود ٹیکس دیں۔ اس عمل کو اپنی اخلاقی و مذہبی ذمے داری سمجھیں۔ اسی سلسلے میں ہم نے پچھلے سال ارکان قومی اسمبلی کی ٹیکس ڈائریکٹری جاری کی ہے۔ اس کے بعد سبھی ٹیکس دہندہ پاکستانیوں کی ڈائریکٹری بھی جاری کر دی۔ یہ ڈائریکٹری ویب پر دستیاب ہے۔ یوں اب یہ جاننا بہت آسان ہو چکا کہ فلاں پاکستانی ٹیکس دیتا ہے یا نہیں۔ مدعا یہ ہے کہ ٹیکس نہ دینے والوں کو شرمندہ کرنے کا عمل جنم لے سکے۔ لوگ

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

اب ایک دوسرے کو بتاتے ہیں کہ فلاں شخص کروڑوں روپے کمار ہا ہے مگر معمولی سا ٹیکس دیتا ہے۔ یہ ایک طرح سے بے عزتی کی بات ہے۔

اب معاشرے میں سوال اٹھ رہے ہیں کہ فلاں پاکستانیوں کا طرز زندگی ارب پتیوں جیسا ہے جبکہ وہ چند لاکھ روپے بطور ٹیکس دیتے ہیں۔ اب اس بدروش کو بدلنا چاہیے۔ دراصل اسی قسم کی معاشرتی تبدیلی آنے کے بعد ہی پاکستان میں ٹیکس کلچر پروان چڑھے گا۔

ہم نے چاروں صوبوں کے وزرائے تعلیم کو خط لکھ کر ان سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ ٹیکس دینے سے متعلق سوال جواب درسی کتب میں شامل کرائیں۔ یوں بچپن سے ایک پاکستانی شہری کو پتا چلے گا کہ ٹیکس دینا اس کی قومی، اخلاقی، مذہبی اور معاشرتی ذمے داری ہے۔ مزید براں بچوں میں یہ حس ہوتی ہے کہ وہ اچھی باتوں پر زبردستی والدین سے عمل کراتے ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ ہر کمانے والا پاکستانی ٹیکس ادا کرنے لگے، تو حکومت معاشی بحران سے نکل آئے۔ ہمارے سامنے یہ چیلنج ہے کہ ہر امیر پاکستانی کو ٹیکس نظام میں لایا جائے اور یہ بھی کہ وہ ہر سال باقاعدگی سے ٹیکس ادا کرے۔ ظاہر ہے، ہم ہر سال نئے ٹیکس دہندہ تو نہیں ڈھونڈ سکتے۔ جیسے پچھلے سال جو پچاس ہزار نئے ٹیکس دہندہ آئے تھے، اس سال ان میں سے بعض نے ٹیکس گوشوارہ داخل نہیں کرایا۔ ہم کوشش کر رہے ہیں کہ وہ بدستور نظام میں شامل رہیں۔

ایک کام ہم یہ کر رہے ہیں کہ ہمارے افسروں کو جو حد سے زیادہ طاقت حاصل ہے، اسے ختم کیا جائے۔ مزید برآں ہم افسروں اور ٹیکس دہندگان کے درمیان موجود خلا بھی پُر کرنا چاہتے ہیں۔ اس سلسلے میں ہم نے انفارمیشن ٹیکنالوجی کی مدد سے گوشوارے بھرنے کے لیے آئرس (Iris) نامی پروگرام تخلیق کیا۔ مدعا یہ تھا کہ ٹیکس دہندہ سہولت سے گوشوارہ بھر سکے۔

یوں ٹیکس دہندہ دفتر آنے جانے کی زحمت سے بچ گئے۔ پہلے انھیں مختلف کاغذات بھرنے کے لیے دفتر آنا پڑتا تھا، مگر اب وہ آئرس کی مدد سے داخل کرنے لگے۔ مثلاً ایک ایگزمشن سرٹیفکیٹ فائل ہوتا ہے۔ یہ ذاتی طور پر دفتر جا کر حاصل کیا جاتا۔ اب ٹیکس دہندہ آن لائن اسے بھر سکتا ہے۔ یہ طریق کار پندرہ دن پہلے متعارف کرایا گیا۔

نئے طریق کار اپنانے کا مقصد یہی ہے کہ ٹیکس دینے کے مراحل آسان بنائے جائیں۔ مثال کے طور پر سیلز ٹیکس رجسٹریشن کا معاملہ لیجیے۔ اس ضمن میں رسک بیڈ سسٹم متعارف کرایا جا رہا ہے۔ اس میں آپ کی رسک پروفائلنگ ہو گی۔ اگر آپ ''گرین'' میں آ جائیں گے، تو آپ کو خودبخود رجسٹریشن سرٹیفکیٹ جاری ہو جائے گا۔ آپ کو کسی کے پاس جانے کی ضرورت نہیں۔ اگر آپ ''ریڈ'' میں ہوں گے، تو آپ کو معلومات دینی ہوگی۔ پھر کوئی آدمی آ کر آپ کے دفتر کا جائزہ لے گا۔

غرض ہم ایسا نظام وضع کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جو قانونی دائرہ کار میں رہ کر کام کرے اور ٹیکس دہندہ کو فائدہ پہنچائے۔ نظم و ضبط اپنا کر ہی ہمارے پیچیدہ معاملات درست ہو سکتے ہیں۔ اس ضمن میں حکومت کو یہ کریڈٹ جاتا ہے کہ انھوں نے انتظامی امور میں مجھے فری ہینڈ دیا ہوا ہے۔ پالیسی بنانا حکومت کا کام ہے، لیکن تمام انتظامی امور میرے ہاتھ میں ہیں۔

یہ یاد رہے کہ ایف بی آر ایک بہت بڑا سرکاری ادارہ ہے۔ اس میں ۲۴ افسر تو گریڈ اکیس کے ہیں۔

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

میں کسی بھی افسر کو کوئی عہدہ تفویض کر سکتا ہوں۔ میں نے کوشش کی ہے کہ کلیدی عہدوں پر ایماندار افسروں کو تعینات کیا جائے۔ اس ادارے میں کل ۲۲ ہزار افراد کام کر رہے ہیں۔ اسی لیے ایف بی آر میں تبادلے ہونا معمول کی بات ہے۔

مثال کے طور پر چند دن بعد ہمارے ۴۱ نئے افسروں کی پاسنگ آؤٹ پریڈ ہے۔ اب ان ۴۱ کو کہیں لگانا اور وہاں سے ۴۱ کو ہٹانا ہے۔ یوں ۸۲ تبادلے تو یہی ہو گئے۔ ہمارے تین تربیتی پروگرام ہیں: ایم سی ایم، ایس ایم سی اور این ایم سی۔ مزید برآں کچھ افسر نیشنل ڈیفنس کالج بھی جاتے ہیں۔ سال میں دو مرتبہ افسر نئی تربیت پا کر نکلتے ہیں۔ اسی باعث تبادلوں کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ ادارے میں گریڈ ۱۷ سے اوپر تقریباً دو ہزار افسر ہیں۔

ہم نے تمام افسروں کو خود اعتمادی بخشی ہے۔ انھیں ہدایات دی گئی ہیں کہ کسی کی ناجائز بات نہ سنیے۔ وہ اپنے ضمیر، تجربے اور قانون کے مطابق درست فیصلے کریں۔ میں نے انھیں کہہ رکھا ہے کہ اگر کوئی زیادہ دباؤ ڈالے، تو آپ کہہ دیجیے کہ جا کر چیئرمین صاحب سے بات کریں۔ لہٰذا میں نے کوشش کی ہے کہ انھیں ایک مثبت ماحول دیا جائے جس میں وہ بلا خوف و خطر اپنی ذمے داریاں ادا کر سکیں۔

ہماری یہ پالیسی واضح ہے کہ کرپشن کو کسی صورت برداشت نہیں کیا جائے۔ اگر کرپشن کا کوئی کیس ہمارے سامنے آئے، تو پھر گناہ گار کو نہیں چھوڑتے۔ یہی وجہ ہے، تمام سرکاری اداروں میں سب سے زیادہ ایف بی آر میں افسروں کے خلاف انکوائریاں چل رہی ہیں۔ انھیں سزائیں ملی ہیں اور نکالا بھی گیا۔ ان میں سینئر افسر بھی شامل ہیں۔ یہ بہت غیر معمولی بات ہے کہ اتنے سینئر افسروں کو ملازمت سے نکالا جا رہا ہے۔ ہم نے بھی افسروں سے کہا ہے کہ آپ کی دیانت داری اور فرض شناسی قابل تعریف، مگر اپنے ماتحتوں پر بھی نگاہ رکھیے۔ اگر کوئی غلط حرکت کرے، تو اسے پکڑ لیجیے۔

ماضی کی حکومتیں کئی کام نہیں کرا سکیں۔ مثال کے طور پر ہر پاکستانی کی ذمے داری ہے کہ وہ اپنی جائیداد کی تفصیل حکومت کو بتائے۔ پچھلے سال ہمارے کہنے پر قومی رہنماؤں اور ارکانِ اسمبلی نے اپنے اثاثہ جات ڈکلیئر کیے۔

پچھلے ہی برس ایف بی آر کے افسروں کو بھی حکم دیا گیا کہ وہ اپنے ٹیکس گوشوارے فائل کریں۔ یہ معاملہ بھی کئی برس سے لٹکا چلا آ رہا تھا۔ جب یہ حکم سامنے آیا، تو بعض افسروں نے ناک بھنوں تو چڑھائی مگر انھیں اس کو ماننا پڑا۔ دراصل ہم خود ہی قوانین پہ عمل نہ کریں، تو کس منہ سے دوسروں کو کہیں گے کہ وہ ٹیکس جمع کرائیں؟

اس معاملے میں افسروں کا خاصا سخت ردعمل سامنے آیا۔ کہا گیا کہ کئی برس سے افسر ٹیکس ریٹرن فائل جمع نہیں کرا رہے تھے، آپ اس بھیڑ چال کو برقرار رکھتے۔ آخر کس کو پتا چلنا تھا کہ ایف بی آر کے افسر گوشوارے جمع نہیں کراتے؟ لیکن ہم چاہتے ہیں کہ ملک میں ٹیکس کلچر جنم لے، اس لیے یہ قدم اٹھایا گیا۔

ہم کسٹمز کے شعبے میں بھی اصلاحات متعارف کرا رہے ہیں۔ مثال کے طور پر اس سال حکومت نے کسٹم

http://www.bookstube.net/

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

ڈیوٹی کا زیادہ سے زیادہ ٹیرف ۳۰ سے کم کر کے ۲۵ کر دیا۔ مزید برآں ایک ٹیئر بھی ختم کیا گیا۔ حکومت آمدہ بجٹ بھی ایک ٹیئر کم کرنا چاہتی ہے۔

سوال: ٹیئر سے آپ کی کیا مراد ہے؟

جواب: ہمارے ریٹ ہوتے ہیں، مثلاً صفر، پانچ، دس، پندرہ، بیس، تو یہ ہر ایک ٹیئر ہے۔ ہم یہ نظام بھی درست کر رہے ہیں۔

اس وقت شعبہ کسٹمز میں ہمارے پاس وسائل بہت کم ہیں۔ اسی لیے اس شعبے میں ہمیں کئی چیلنج درپیش ہیں۔ فی الوقت کسٹمز کے سپاہیوں کی اوسط عمر ۵۵ یا ۵۲ سال ہے۔ نیز شعبے میں بیشمار آسامیاں خالی پڑی ہیں۔ ۱۹۹۶ء کے بعد وہاں بھرتی نہیں ہوئی۔ لہٰذا کسٹمز میں حالات کافی ناسازگار ہیں۔

اگر ہم نے اپنی سرحدوں پر اسمگلنگ روکنی ہے، تو اس کے لیے چاق و چوبند اور مستعد فورس ہونی چاہیے۔ وسائل کی کمی کا یوں اندازہ لگائیے کہ ہمارے پاس آپریشنل کشتی موجود نہیں۔ بہرحال بہتری کے لیے ہم نے دو کام کیے۔ اول یہ کہ کسٹمز ایکٹ کے تحت اسمگلنگ روکنے کا اختیار پاکستان کی دیگر فورسز مثلاً فرنٹیئر فورس اور رینجرز کو بھی دے دیا۔

سوال: پہلے یہ اختیار انھیں حاصل نہیں تھا؟

جواب: کسی زمانے میں تھا، پھر ان سے لے لیے گئے۔ ہم نے انھیں دوبارہ تفویض کر دیے۔ ان فورسز میں میری ٹائم سیکیورٹی اور کوسٹ گارڈز بھی شامل ہیں۔

دوم ہم نے یہ کام کیا کہ اپنے تمام وسائل جمع کر کے نئی اینٹی اسمگلنگ فورس تشکیل دی۔ اس کے سربراہ ڈی جی انٹیلی جنس کسٹمز ہیں۔ اس اقدام کا نتیجہ یہ نکلا کہ پچھلے برس کے دوران وطن عزیز میں اسمگلنگ کم ہو چکی اور ہمیں کامیابیاں نصیب ہوئیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسمگلنگ رک گئی ہے۔ یہ بہت بڑا مسئلہ ہے۔ بہرحال ہمارے مثبت اقدامات کی وجہ سے نمایاں تبدیلی ضرور آئی۔

افغان ٹرانزٹ تجارت بھی اسی مسئلے سے متعلق ہے۔ فی الوقت ہم اس تجارت پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔ کراچی سے جو سامان نکلے، ہم چمن اور طورخم تک اسے ٹریک کرتے ہیں۔ اس کی مانیٹرنگ بھی ہوتی ہے۔ لیکن کچھ سامان افغانستان جا کر واپس پاکستان آ جاتا ہے۔

اس قسم کی اسمگلنگ روکنے کے لیے تجویز تھی کہ افغان کسٹمز والے سامان پر کسٹم ڈیوٹی لینے لگیں یا ہمیں یہ اختیار دے ڈالیں۔ حال ہی میں افغان صدر پاکستان آئے تھے۔ انھوں نے یہ تسلیم کر لیا ہے کہ افغان کسٹمز کسٹم ڈیوٹی وصول کریں گے۔

ہونا یہ چاہیے کہ جوں ہی کراچی بندرگاہ میں مال پہنچے، تو اس کی کسٹم ڈیوٹی وصول کر لی جائے۔ لہٰذا اگر مال افغانستان سے واپس پاکستان آیا، تو اس کی لاگت اتنی زیادہ بڑھ جائے گی کہ اس اسمگلنگ سے زیادہ مالی فائدہ نہیں ہو گا۔ بہرحال صدر اشرف غنی کے اقدام سے افغان ٹرانزٹ تجارت میں اسمگلنگ کم ہوگی۔ ہم نے ایک قدم یہ بھی اٹھایا کہ افغان حکومت کے ساتھ الیکٹرانک ڈیٹا انٹرفیس قائم کر دیا۔ مدعا یہ ہے کہ جب سامان افغانستان پہنچ جائے، تو افغانی برقی (الیکٹرانک) طور پر ہمیں آمد کی دستاویز بھجوا دیں۔ یوں کسی انسان کو یہ ذمے داری دینے کی ضرورت نہیں۔ طورخم میں الیکٹرانک ڈیٹا انٹرفیس قائم ہو گیا ہے۔ چمن میں تنصیب کا کام جاری ہے۔

ہم چین کے ساتھ بھی الیکٹرونک ڈیٹا انٹرفیس قائم

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

کرنا چاہتے ہیں۔ اس سلسلے میں ہماری ایک ٹیم آج ہی چین گئی ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ چینی سامان کے سلسلے میں جو اسمگلنگ ہو رہی ہے، وہ رک جائے گی۔ ہمیں پھر چین سے کسٹمز کا ڈیٹا براہ راست ملنے لگے گا۔ غرض ہم اپنے ڈھانچے میں ایسی مثبت تبدیلیاں لانا چاہتے ہیں۔

اس کے علاوہ ہم نے کسٹم سامان کی کلیئرنس کے لیے ویب بیسڈ ون کسٹمز (Web Based One Customs) کا نظام متعارف کرایا۔ فی الوقت ملک میں ۸۰ فیصد مال اسی نظام کے ذریعے کلیئر ہو رہا ہے۔ آمدہ جون تک یہ اوسط ۹۵ فیصد تک پہنچ جائے گی۔ یہ نظام کاروبار دوست ہے اور اس کی وجہ سے مال جلد کلیئر ہونے لگا ہے۔ مال جتنی دیر تک پورٹ پہ رہے، اس کی لاگت اتنی ہی بڑھ جاتی ہے۔ لہٰذا مال جلد از جلد کلیئر ہونا چاہیے۔

مزید برآں ہم بین الاقوامی سرحدوں پر ایسے کسٹمز اسٹیشن کھول رہے ہیں جو ''انٹی گریٹڈ ٹرانزٹ ٹریڈ مینجمنٹ سسٹم'' کی بنیاد پر کام کریں گے۔ یہ اقدام اس سوال پر مبنی ہے کہ پاکستان کی جو اہم جغرافیائی تزویراتی پوزیشن ہے، اس سے کیونکر فائدہ اٹھایا جائے؟ وہ اس طرح کہ پاکستان علاقے میں تجارت کا مرکز بن جائے۔ مثلاً چین سے سامان آئے، تو وہ ایران، افغانستان اور وسطی ایشیا بھیجا جائے۔ ایسا اسی وقت ہو سکتا ہے جب ہمارے کسٹمز اسٹیشن موثر انداز میں کام کر رہے ہوں۔

ہم نے ''انٹی گریٹڈ ٹرانزٹ ٹریڈ مینجمنٹ سسٹم'' کا منصوبہ وزیراعظم کو پیش کیا جنھوں نے اسے منظور کر لیا۔ یہ منصوبہ بہت بڑا ہے اور مختلف وزارتیں مثلاً داخلہ، ریلوے، خزانہ وغیرہ اس کا حصہ ہیں۔ اسی لیے کئی محکمے مل کر اسے تیار کر رہے ہیں۔ ایشیائی ترقیاتی بینک بھی اس ضمن میں ہماری امداد کرنے کو تیار ہے۔

سوال: ایف بی آر کے ملازمین میں کام ذمے داری سے کرنے کا جذبہ ابھارنے کی خاطر آپ نے کچھ اقدامات کیے؟

جواب: جی ہاں، اس سلسلے میں ہم نے انٹی گریٹڈ یونٹ کھولا۔ اس کے تحت ہم کارکردگی کی بنیاد پر ملازمین کا تعین کریں گے۔ مقصد یہ ہے کہ جو لوگ اچھا کام کریں، انھیں انعام ملے اور جو سستی و کاہلی کا مظاہرہ کرتے ہیں، ان پر سختی کی جائے۔ ہر ادارے میں یہی طریق کار ہوتا ہے۔ امید ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ بہتری آئے گی۔

سوال: ایک شکایت ہے کہ ایف بی آر کے افسر ٹیکس دینے والوں سے بھی وہی (سخت) رویہ روا رکھتے ہیں جو نہ دینے والوں سے رکھا جاتا ہے۔ اس بارے میں کچھ فرمائیے۔

جواب: آپ نے درست کہا۔ ہماری کوشش ہے کہ ٹیکس دینے والوں کو عزت و احترام ملے۔ مثلاً ہم نے ہر شعبے میں سے ۱۰۰ ٹیکس دہندگان کا انتخاب کیا، پھر وزیراعظم نے خود انھیں تعریفی اسناد عطا کیں۔ ہم نے انھیں مراعات بھی دیں مثلاً ہوائی اڈوں پہ ان کے کام جلد ہوتے ہیں۔ ان کا آئی ڈی پی الاؤنس بڑھا دیا۔

دوسری طرف ہم ٹیکس نہ دینے والے امرا کو قانون کے شکنجے میں کس رہے ہیں۔ اعداد و شمار کے مطابق اب ہم نے ایسے ۲۷۸ لوگوں کے بینک اکاؤنٹ منجمد کر

http://www.bookstube.net/

www.pdfbooksfree.pk

Copyrighted material

دیے ہیں۔ ۸۷ افراد کے اثاثہ جات کی نیلامی شروع ہو چکی۔ نیز ۱۰۰ لوگوں کی گرفتاری کے وارنٹ جاری ہو چکے۔ ٹیکس نہ دینے والے دو لاکھ چالیس ہزار امرا کو ٹیکس نوٹس دیے جا چکے۔

ہماری حکمت عملی یہ ہے کہ جو امیر پاکستانی ٹیکس نظام سے باہر ہیں، انھیں اندر لانے کے لیے ان کو آسانیاں دیں۔ لیکن وہ پھر بھی ٹیکس نہیں دینا چاہتے، تب ان پر سختی کی جائے۔ ہم ایف بی آر میں بھی طریق کار درست کر رہے ہیں۔ مثلاً ہم نے یہ قانون بنایا ہے کہ سالانہ ہر افسر کم از کم ۱۵ دن کی تربیت لے تاکہ وہ باخبر اور ادارے کے مقاصد سے وابستہ رہے۔

ہم نے تربیت میں اخلاقیات کا موضوع بھی متعارف کرایا ہے جو پہلے موجود نہیں تھا۔ کوشش ہے کہ عمدہ مقرر ہمارے افسروں اور ملازمین کو اخلاقی نکات پر لیکچر دیں تاکہ ان کا ضمیر جاگے، خوف خدا آئے اور ایمان تازہ رہے۔

سوال: جو پاکستانی دیانت داری سے ٹیکس دے رہے ہیں، ایف بی آر انھیں کیا سہولت دیتا ہے؟ دیکھا گیا ہے کہ کرپٹ افسر انھیں بھی تنگ کرتے ہیں۔

جواب: یہ خرابی دور کرنے کی خاطر ہی ہم اپنا نظام بہتر بنا رہے ہیں۔ ہم نے حال ہی میں اخبارات میں یہ اشتہار شائع کرایا ہے کہ اگر آپ کو آڈٹ کا نوٹس آتا ہے اور اس کے نیچے بارکوڈ موجود نہیں، تو اسے پھاڑ کر پھینک دیں۔ یہ اقدام اسی لیے کیا گیا افسر خواہ مخواہ کسی کو نوٹس نہ بھیج سکیں۔ ایسے افسر ٹیکس دہندگان کا استحصال کرتے ہیں۔

ایف بی آر کے ملازمین کو راہ راست پر لانے کی خاطر مختلف اقدامات کیے جا رہے ہیں۔ انھیں سزائیں دی ہیں، ضمیر جگانا چاہا ہے، مراعات بھی دی ہیں۔ کارکردگی کی بنیاد پر انعام بھی دیے ہیں۔ لیکن کرپشن ختم کرنے کا حل یہ ہے کہ پورا نظام قانون کے دائرے میں آ جائے۔ اس کے علاوہ ہم اپنے نظام کو آئی کی بنیاد پر منظم کر رہے ہیں تاکہ کرپشن جڑ سے اکھاڑی جا سکے۔

سوال: اکثر لوگوں کا کہنا ہے کہ ایف بی آر نے بہت سے کام ٹیکس دہندگان کے سپرد کر رکھے ہیں۔ اگر کوئی چھوٹا سا ادارہ ہے، تو وہاں بھی پانچ افراد ٹیکسوں کے حساب کتاب میں مصروف رہتے ہیں۔ یوں جس نے محنت کرنی ہے، کام کرنے ہیں، اس کی تو ذمے داریاں بڑھ گئیں۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ بیشتر ٹیکس دہندگان ادھار پر کاروبار یا تجارت کرتے ہیں۔ لہٰذا انھیں عموماً نقد رقم کی کمی کے مسئلے سے نمٹنا پڑتا ہے۔ لیکن ان کو سیلز ٹیکس لازماً جمع کرانا ہوتا ہے جو بہت زیادہ ہے۔ پھر ۳۳ فیصد انکم ٹیکس بھی لیا جاتا ہے۔ یہ امر بھی ان کے کیش فلو پر منفی اثر ڈالتا ہے۔ ان عوامل کی بنیاد پر لگتا ہے کہ پاکستان میں ٹیکس نہ دینے والے کی نسبت دینے والا زیادہ پریشان ہے۔

جواب: یہ بات درست ہے کہ ٹیکس دہندگان پر بوجھ زیادہ ہے۔ وہ ودہولڈنگ ایجنٹ بن چکے یعنی دوسروں کا ٹیکس کاٹتے ہیں۔

سوال: تب ایف بی آر کو انھیں اس کی فیس دینی چاہیے۔

جواب: جناب! سارا پیسا آپ کا ہے۔ ایف بی آر اس ملک کے لیے رقم اکٹھی کرتا ہے۔

سوال: یہ بھی کہا جاتا ہے کہ پاکستان میں ٹیکس

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

بہت زیادہ ہیں۔ اگر ٹیکس کم کر دیے جائیں یا ان کی شرح کم ہو جائے، تو ممکن ہے کہ بہت سے پاکستانی ٹیکس دینے لگیں۔

جواب: لیکن یہ طریق کار اسی معاشرے میں کامیاب ہو سکتا ہے جہاں شہری اصول و قانون کے مطابق عمل کرتے ہوں۔ جس ملک میں قانون کمزور ہے، وہاں شرح کم بھی کر دی جائے، تو لوگ ٹیکس نہیں دیں گے۔ مثال کے طور پر ہم نے پچھلے برس سیلز ٹیکس کی شرح ۱۶ سے ۱۷ فیصد کی، تو اضافی آمدن آئی۔ اس سال ہم نے ٹیلی فون کارڈ پر ودہولڈنگ ٹیکس ۱۵ سے ۱۴ فیصد کر دیا۔ درج بالا نظریے کی رو سے آمدن بڑھنی چاہیے تھی، مگر وہ الٹا کم ہوگئی۔

بنیادی بات یہ ہے کہ پاکستان میں ٹیکس کلچر پروان چڑھنا چاہیے۔ ہر پاکستانی اس امر پر متفق ہو جائے کہ جو شہری کما رہا ہے، وہ ٹیکس ضرور دے گا۔

سوال: بیرون ممالک میں جو شہری ٹیکس نہیں دیتا، اس کی زندگی حرام کر دی جاتی ہے۔ لیکن پاکستان میں اربوں روپے کمانے والے ایک پائی کا ٹیکس نہیں دیتے۔

جواب: ایسا ہی ہے۔ اسی لیے ہماری کوشش ہے کہ سبھی امرا کے گرد گھیرا تنگ کیا جائے۔ مثال کے طور پر جس شخص کے بینک اکاؤنٹ میں ۱۰ لاکھ روپے سے زائد رقم ہوئی، اس کے متعلق ایف بی آر کو رپورٹ مل جائے گی۔ اس قانون کے خلاف بینک عدالتی جنگ لڑ رہے ہیں۔ مگر ہماری سعی ہے کہ یہ قانونی جنگ جلد از جلد جیتی جائے۔

سوال: ایف بی آر نے ایکسپورٹروں کے لیے ڈی ٹی آر اسکیم شروع کر رکھی ہے۔ لیکن اس سے انھیں زیادہ فائدہ نہیں پہنچا۔ وجہ یہ کہ ایس آر او کے تحت ایسی بہت سی اشیا امپورٹ ہو جاتی ہیں جو ملک میں بن سکتی ہیں یا بنتی ہیں۔

جواب: آپ نے اچھا معاملہ اٹھایا۔ حکومت نے حال ہی میں یہ بڑا فیصلہ کیا ہے کہ اب امپورٹر صرف انہی اشیا پر ٹیکس چھوٹ حاصل کر سکیں گے جو ملک میں نہیں بنتیں۔ صرف توانائی سے متعلق اشیا کو مستثنیٰ رکھا گیا ہے کہ وطن عزیز میں بجلی کی قلت ہے۔

سوال: بنگلہ دیشی حکومت نے اپنے ایکسپورٹروں کو کئی سہولتیں دے رکھی ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ برآمدات بڑھ سکیں۔ لیکن پاکستان میں ڈی ٹی آر کی منظوری کراتے ہوئے ہی اتنی دیر لگ جاتی ہے کہ سیزن گزر جاتا ہے۔

جواب: میں اس معاملے کا جائزہ لیتا ہوں۔ اگر کوئی مسئلہ ہوا، تو اسے یقیناً دور کیا جائے گا۔

ہمارے ہاں تعلیم یافتہ لوگ بھی ٹیکسوں کے نظام کو پیچیدہ اور ”ہوا“ سمجھتے اور وکلا کے سپرد کیے رکھتے ہیں۔ لیکن جب ہم طارق باجوہ صاحب سے مل کر اٹھے، تو دودھ کا دودھ، پانی کا پانی ہو چکا تھا۔ انھوں نے ٹیکس نظام کو بہت عام فہم اور پانی کی طرح شفاف بنا کے پیش کر دیا۔

گفتگو کا ماحصل یہ رہا کہ ہر صاحب حیثیت پاکستانی ٹیکس ادا کرے، تو اسے سکون قلب نصیب ہو گا اور اللہ تعالیٰ اس کے کاروبار و کام میں برکت بھی ڈالیں گے۔ دوسری صورت میں اب وہ قانون کی سخت ہوتی گرفت سے نہیں بچ سکتے۔ ان کا شاہانہ طرز زندگی ہی ان کے جرم کی منہ بولتی گواہی بن جائے گا۔

◆◆◆

http://www.bookstube.net

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

بقیہ: انٹرویو پرویز رشید

''مگر اخبارات میں آپ کی حکومت کے خلاف آئے دن کالم چھپ رہے ہیں جو ایک قسم کی رائے عامہ کی تشکیل کر رہے ہیں۔''

''پاکستان ایک جمہوری ملک ہے جس میں سرگرم سیاسی جماعتیں بھی ہیں اور لوگوں کے اپنے اپنے ذہن بھی۔ جس طرح ہمارے اچھے اقدامات کے حق میں لکھنے سے کوئی آپ کو روک نہیں سکتا، اسی طرح ان کی طرف بھی لوگ ہیں جنھیں ہماری شکلیں بری لگتی ہیں، البتہ وہ ایک جملہ کہہ دیتے ہیں کہ پرویز صاحب سے میرے بہت اچھے تعلقات ہیں۔''

طیب اعجاز کے ایک سوال نے گفتگو کا رُخ بھارت کی طرف موڑ دیا۔ انھوں نے عام ذہن میں اٹھنے والا سوال پوچھا: ''حال ہی میں اوباما انڈیا آئے جن کا نہایت پرجوش استقبال ہوا۔ مودی عالمی حالات پر اثر انداز ہونے کی بڑی منظم کوششیں کر رہے ہیں، جبکہ ہمارے وزیراعظم اس قدر فعال نظر نہیں آ رہے؟''

''ہمارے وزیراعظم نے جو طرزِ عمل اختیار کیا ہے، آنے والے چند مہینوں میں اس کے ثمرات پاکستان کو ملنا شروع ہو جائیں گے ان شاء اللہ۔ مودی صاحب نے جو رویہ اپنا رکھا ہے، اس کے مہلک نتائج بھی سامنے آنے لگیں گے۔ کچھ ہی عرصے بعد صورتِ حال وہ نہیں ہوگی جو آج نظر آ رہی ہے۔ دانش مندی کا تقاضا یہی ہے کہ آپ وہی بات منہ سے نکالیں جو آپ ایک سال اور دو سال بعد بھی کہہ سکیں۔ انڈیا کی جو ضروریات ہیں، وہ مودی کے موجودہ ہیجان انگیز رویوں سے حاصل نہیں ہو سکتیں۔''

''بھارتی باشندوں کی توقعات اُن سے بہت زیادہ ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ گاندھی کے بعد اگر ہمیں کوئی لیڈر ملا ہے، تو وہ مودی ہے۔'' طیب اعجاز نے اپنا وہ تاثر بیان کر دیا جو انھوں نے بھارت کے مختلف دوروں کے دوران قائم کیا تھا۔

''لیڈر، تو انھیں مل گیا، لیکن کیا اس جنونی رویے کے ساتھ انڈیا کی حد سے بڑھی ہوئی خواہشات پوری ہو سکتی ہیں؟ وہ پاکستان سے محاذ آرائی کی پالیسی جاری رکھیں گے، تو اسے یاد رکھنا ہوگا کہ پاکستان بھی ۱۸ کروڑ لوگوں کا ملک اور ایک نیوکلیئر پاور ہے۔ خطے میں اس کی اپنی ایک اہمیت ہے۔ اس کی دفاعی صلاحیتوں کو دنیا بھر میں تسلیم کیا جاتا ہے۔ آج جتنے بڑے ملک دہشت گردی کے خلاف لڑ رہے ہیں، انھیں پاکستان کے ساتھ اچھے تعلقات قائم رکھنا ہوں گے کیونکہ اس کی موثر شمولیت کے بغیر جنگ میں فتح و کامرانی حاصل نہیں کی جا سکتی۔ ان معروضی حالات میں مودی کب تک یہ رویہ قائم رکھ سکے گا؟ اوباما نے عوامی سطح پر اسے کچھ کہا ہو یا نہ کہا ہو، لیکن جب وہ اس کے ساتھ چائے پی رہا تھا، تب لازمی طور پر کچھ نہ کچھ ضرور کہا ہوگا کہ بھائی یہ آپ نے جو مذاکراتی عمل روک رکھا ہے، اسے کھولنا پڑے گا۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ انڈیا آئے دن ہماری ایل او سی پر بلا اشتعال فائرنگ کرتا رہے، جھڑپوں کا سلسلہ جاری رکھے اور تب بھی امریکہ اس کے ساتھ پینگیں بڑھاتا رہے اور ہمارے ساتھ بھی اسٹریٹجک تعلقات کا دم بھرتا رہے۔''

''کیا ہمیں ہمہ وقتی وزیرِ خارجہ میسر آ سکتا ہے کہ ہم انتہائی سنجیدہ اور آتش گیر مسائل میں گھرے ہوئے ہیں؟'' میں نے ایک دم سخت چبھتا ہوا سوال کر ڈالا۔

''ابھی تک تو وزیراعظم وزارتِ خارجہ کو دیکھتے ہیں۔ میرے خیال میں جب کابینہ میں توسیع ہوگی، تو وزیراعظم کا بوجھ

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

ہلکا ہوگا یا پھر اس بوجھ کو وہ کسی کے حوالے کر دیں گے۔"

اس کے بعد یہ بحث پھر چل نکلی کہ ہر سطح پر واضح پالیسی کا فقدان ہے۔ خرم دستگیر خاں ابھی تک تجارتی پالیسی نہیں دے سکے۔ اسی طرح کوئی تعلیمی پالیسی سامنے نہیں آئی۔ اس عہد میں ثقافتی پالیسی بھی غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے، مگر اس کا دور دور تک نام و نشان دکھائی نہیں دیتا۔ زرعی میدان میں بھی بریک تھرو کی ضرورت ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ادارے کچھ کام نہیں کر رہے۔ اس پر جناب پرویز رشید نے اپنا نقطۂ نظر بیان کرتے ہوئے کہا:

"خیر یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ کچھ نہیں کر رہے۔ زراعت میں قیمتیں نیچے کی گئی ہیں۔ چاول اور گنے والوں کو ہم نے سہارا دیا۔ آپ جب تک اپنی کوالٹی بہتر نہیں کریں گے، تب تک ایکسپورٹ میں اضافہ نہیں ہوگا۔ اب اگر آپ جالے والا کنو پیدا کر رہے ہیں، تو اس میں سرکار کیا کر سکتی ہے؟ اتنے ادارے موجود ہیں جو ان کو بتاتے ہیں کہ آپ کے درخت کی عمر پوری ہوئی ہے، اس کو اکھاڑ دو اور نیا پودا لگاؤ۔ یہ کام آرڈیننس کے ذریعے تو نہیں کیا جا سکتا، فقط علم اور ٹیکنالوجی فراہم کی جا سکتی ہے۔ ایکسپورٹ زون ہم بنا رہے ہیں، سیالکوٹ ایئر پورٹ کی جو بات ہوئی وہ بھی اسی نکتے سے ہوئی تھی کہ ہم وہاں پہ کولڈ اسٹوریج بنانا چاہتے ہیں۔ وزیراعظم نے خواجہ آصف سے کہا کہ آپ پبلک پرائیویٹ پارٹنرشپ کی پرپوزل لے کر آئیں۔ اسی طرح سرگودھا میں ایکسپورٹ زون بن رہا ہے۔"

طیب اعجاز نے پبلک پرائیویٹ پارٹنرشپ کے تجربے کا ماحصل بیان کرتے ہوئے کہا:

"پبلک پرائیویٹ پارٹنرشپ کا نظام جو پرویز الٰہی دور میں آیا تھا، بہت زیادہ سودمند ثابت نہیں ہوا۔ پراجیکٹ پورا پبلک ہو یا پورا پرائیویٹ ہونا چاہیے۔ دونوں کے اشتراک سے معاملات اُلجھ کے رہ جاتے ہیں۔ اس ضمن میں وزیر اطلاعات نے اپنی حکومت کا بنیادی موقف بیان کرتے ہوئے کہا:

"اگر کوئی پرائیویٹ سیکٹر میں کام کرنا چاہتا ہے تو اسے ہماری طرف سے اجازت ہوگی۔ لیکن کوئی پرائیویٹ پارٹی اگر کہتی ہے کہ یہ بہت بڑا پراجیکٹ ہے اور میں اس کو نہیں کر پاؤں گی، اس لیے سرکار بھی اپنا حصہ ڈالے، تو اس صورت میں ہم اُن کے ساتھ کھڑے ہوں گے۔ پبلک پرائیویٹ سیکٹر میں ہم یہ نہیں کہتے کہ کنٹرول حکومت کے پاس ہوگا۔ کنٹرول آپ ہی کے پاس ہوگا۔ ہم اس میں محض ایک حصے دار کے طور پر موجود ہوں گے اور ایڈمنسٹریشن آپ ہی کے پاس رہے گا۔"

اس اہم اور دوررس نتائج کی حامل وضاحت کے بعد میں نے پی ٹی وی کے بارے میں پوچھا، کیا وہاں کوئی بہتری آئی ہے اور اس کا معیار بلند کرنے کے لیے آپ کیا کوششیں کر رہے ہیں؟ اُن کے ہونٹ مسکرائے اور الفاظ کی ایک قطار لگتی گئی۔

"پی ٹی وی میں کھلا پن تو آیا ہے۔ جو کنٹرول پہلے تھا وہ اب نہیں رہا۔ ہم کسی کو پروگرام میں بلانے سے نہیں روکتے۔ آج مجھے میرے ایک ایم این اے کا پیغام آیا کہ گزشتہ رات میں پی ٹی وی پروگرام میں گیا اور مجھے یوں لگ رہا تھا کہ جتنے بھی اینکر پرسن ہیں، وہ سارے کے سارے اپوزیشن سے تعلق رکھتے ہیں۔ انھوں نے مجھے بہت پریشان کیا۔"

"سر آپ کی کوالٹی بہتر ہوئی ہے، مگر کیبل والے اس چینل کو آخر میں دکھاتے ہیں۔" کامران الطاف نے کہا۔

"میں نے سارے کیبلز والوں کو بلا کر ایک درخواست کی تھی کہ آپ یُو کے بنا لیں، نیوز کا یُو کے علیحدہ اور انٹرٹینمنٹ کا علیحدہ۔ وہ اس بات پر متفق ہو گئے ہیں، لیکن انھوں نے کہا کہ ہمیں کچھ وقت لگے گا کہ ہمارے تین چار ہزار کیبل آپریٹرز ہیں اور پھر ان کی دو تین یونینز بھی ہیں۔ پھر اس میں کچھ نہ کچھ "مال" بھی چلتا ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ قوانین بنا کر انھیں قابو میں رکھیں۔ افہام و تفہیم ہی سے معاملات بہتر کیے جا سکتے ہیں۔"

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

میں ذاتی طور پر بند یوٹیوب کھولنے کے حق میں ہوں

''سوشل میڈیا میں بھی ہمارا کوئی مثبت امیج نہیں جا رہا۔ ہم اس میں بہت پیچھے ہیں، اس پر بڑی تیزی سے پوری دنیا میں بات پھیل جاتی ہے۔'' ایک نیا سوال کیا گیا۔

پرویز صاحب سوچتے ہوئے گویا ہوئے ''اس پر بھی اب ایک سیل بن چکا ہے جس میں انفارمیشن ٹیکنالوجی کی وزارت بڑی فعال ہے۔ ہم ایک سائبر بل بھی لا رہے ہیں تاکہ منفی رجحانات پر قابو پایا جا سکے۔ سرکار تو اس معاملے میں بہت پیچھے تھی۔ ہمارا جو ڈائریکٹوریٹ آف الیکٹرانک ہے، اس میں مانیٹرنگ اسکرین ہی نہیں تھیں۔ وہاں جو عملہ سرکار نے رکھا تھا، وہ انڈر میٹرک یا میٹرک پاس تھا۔ آپ ان شاء اللہ دیکھیں گے کہ تین مہینوں کے اندر ہم آٹھ دس ہزار نئے ویب پیجز بنالیں گے۔ اپنے وزرائے کرام سے بھی کہا ہے کہ اپنے اپنے پیج ڈویلپ کرنا شروع کر دیں تاکہ لوگ آپ سے سوال جواب بھی کر سکیں۔ میں پچھلے تین چار مہینے سے اس پر کام کر رہا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ وزارت اطلاعات کا پیج ان شاء اللہ دو تین ماہ میں تیار ہو جائے گا۔ یوٹیوب کا معاملہ عدالت میں ہے، اس لیے ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ ویسے ذاتی طور پر میں اس پابندی کے خلاف ہوں۔ سرکاری وکیل بھی پابندی ختم کرانے کے لیے مقدمہ لڑ رہا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اسے فلٹر کرو، ہم نے ہزاروں کے حساب سے پروگرام فلٹر کیے، وہ روز نئے بن کر آ جاتے ہیں۔ گوگل والوں نے کہا کہ ہم پاکستان کے لیے گوگل کا ایک پیج کھول دیتے ہیں جس کے لیے آپ کو ہم سے ایک معاہدہ کرنا پڑے گا۔ بہت ساری چیزیں ایسی ہوتی ہیں جنھیں ہم برا سمجھتے ہیں' لیکن وہ اسے برا نہیں سمجھتے' تاہم گوگل والوں سے ہماری بات چیت چل رہی ہے۔''

طیب اعجاز نے ایک فکرانگیز سوال پوچھا:

''نوجوان پاکستانی انٹر پرینیور اپنے وطن کے لیے کیا کر سکتے ہیں؟''

''ابھی جو ہمیں مواقع مل رہے ہیں، ان کے اندر رہتے ہوئے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائیں۔ اس سے عوام کو روزگار اور سرکار کو ٹیکس ملتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنے لوگوں کو معیار کا احساس ضرور دلانا چاہیے تاکہ آپ اپنی مصنوعات مارکیٹ میں فروخت کر سکیں۔ لوگوں کو آگہی دیں اور سیمینار میں بنیادی مسائل زیر بحث لائیں۔ اگر آپ ریڈیو یا ٹیلی ویژن پر کوئی پروگرام کرنا چاہتے ہیں، تو میری طرف سے کھلی اجازت ہے۔''

''ہمارے ۸۰ کے قریب کاروباری نوجوان تیزی سے ترقی کرنے والی کمپنیوں سے وابستہ ہیں اور ان کو ہارورڈ میں بھی بلایا گیا ہے۔ ہم یہ کر سکتے ہیں کہ ان کی کامیابی کی کہانیاں نئے آنے والوں تک پہنچائیں تاکہ ان میں آگے بڑھنے کی اُمنگ پیدا ہو۔'' طیب اعجاز نے بتایا۔

جناب پرویز رشید نے اس جذبے کو سراہتے ہوئے کہا:

''ہمارے میڈیا پر بھی اب کچھ اچھا نظر آنے لگا ہے۔ پچھلے تیس، پینتیس برسوں سے جن باتوں پر اختلاف چلا آ رہا تھا' اب ان پہ اتفاق ہوتا جا رہا ہے، پہلے پاکستان کی سمت کا کچھ پتہ ہی نہ چلتا تھا۔ کبھی ہم کابل سے اُلجھے ہوتے اور کوئی ہمیں ''ڈومور'' کہہ رہا ہوتا۔ الحمدللہ اس صورت حال سے ہم نکل آئے ہیں۔ پھر مذہب کا استعمال جس طرح ہمارے ہاں ہوتا رہا۔ اس میں اصلاح کا شعور تبلیغ کے بجائے لوگوں نے اپنے تجربے سے حاصل کیا ہے۔ یہ باتیں پہلے کب ہوتی تھیں کہ ہم سب پاکستانی ہیں خواہ ہمارا کوئی مذہب اور کوئی عقیدہ اور کوئی نسل ہو۔ صرف یہ باتیں ہوتی تھیں کہ تمھارے حقوق کا ہم خیال رکھیں

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

گے۔ یہ عظیم تبدیلیاں وہ ہیں جن سے اقوام بنتی ہیں۔"

انٹرویو ختم ہوا تو ہلکی پھلکی اور ذہن کو تازگی بخشنے والی باتیں چل نکلیں۔

"آپ موسیقی کون سی سنتے ہیں؟"

"کلاسیکی موسیقی بہت پسند ہے۔ بڑے غلام علی صاحب، روشن آرا بیگم اور اقبال بانو کی ٹھمریاں اور مرحوم امانت علی کو شوق سے سنتا ہوں۔ ان کے شاگرد بھی بہت اچھا گاتے ہیں، ان کو بھی سن لیتا ہوں۔ فتح علی خان ہیں حیدر آباد کے، ان کی موسیقی بھی بہت لطف دیتی ہے۔ "مالکا" گاتے ہیں، ابھی نوجوان ہیں۔"

"سر! فلم بھی دیکھتے ہیں؟"

"فلم دیکھے عرصہ گزر گیا۔"

"حیدر" یا "پی کے" فلم ضرور دیکھیے گا، آپ شوق سے کیا پڑھتے ہیں؟"

"میں اب زیادہ افغانستان کی تاریخ پڑھتا ہوں۔ جب ہم تاریخ پڑھتے ہیں، تو پتہ چلتا ہے کہ کچھ بھی نہیں بدلا صرف کردار تبدیل ہوئے ہیں، باقی سب کچھ وہی ہے۔ تازہ ترین کتاب War on Afghanistan پڑھی ہے اور عراق وار جو سرور منیر راؤ نے لکھی ہے۔ دوسری چیز جو میں بلاناغہ پڑھتا ہوں وہ تابش علوی کی نعتیں ہیں جن میں کہیں بھی نقطہ نہیں۔ بڑی کمال نعتیں لکھی ہیں۔"

"لکھنے کا شوق ہے یا وقت نہیں ملتا؟"

"اُردو میں مضامین لکھتا ہوں۔ کبھی شوق ہوتا تھا، تو نوائے وقت میں نظامی صاحب کے نکتۂ نظر کے خلاف مضامین چھپوالیتا تھا۔ اُن میں وسعت نگاہ تھی۔"

"آپ کے بچے کتنے ہیں؟"

"دو بیٹیاں ہیں اور دونوں شادی شدہ۔"

"کیا خان صاحب کے ساتھ حکومت کے معاملات سلجھتے نظر آرہے ہیں؟"

"خان صاحب اپنے مطالبات بدلتے رہتے ہیں۔ جیسے آج انھوں نے کہہ دیا کہ میں ٹریبونل کے فیصلے ہی کو نہیں مانتا۔"

"آپ کو کیا لگتا ہے کہ مستقبل میں اُن کا لائحہ عمل کیا ہوگا؟"

"میرا خیال ہے کہ وہ سیاسی جماعت کے سربراہ رہیں اور سیاست کرتے رہیں گے۔"

◆◆◆

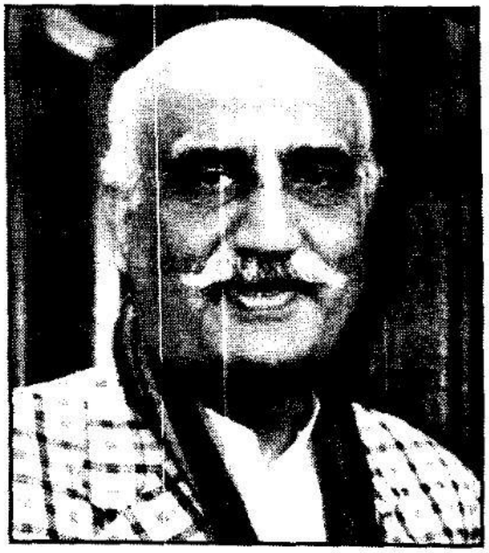

خصوصی اعلان

قائدِ حزب اختلاف، سید خورشید احمد شاہ کا تعلق شاعر امن و محبت' شاہ عبداللطیف بھٹائی کی سرزمین سے ہے۔ آپ کبھی دھیمے اور کبھی کڑے لہجے میں حکومتِ وقت پہ تنقید کرتے ہیں۔ آپ کی اپنی زندگی بھی جدوجہد اور محنت سے عبارت ہے۔ سید صاحب کا انکشافات سے بھرپور انٹرویو اگلے شمارے میں ملاحظہ فرمائیے۔ (ادارہ)

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

گور پیا کوئی ہور

ایک بوڑھی کا عجب ماجرا وہ قبر اندر سے دیکھنا چاہتی تھی......

فتح اللہ خان بھٹی

یہ ۸۰ سال پرانی بات ہے۔ جب میں چھے سات سال کا لڑکا تھا۔ ہوا یہ کہ گاؤں سے باہر اپنے ڈیرے پر چارپایاں بچھائے ہمارے چاچے تائے وغیرہ بیٹھے گپ شپ لڑا رہے تھے۔ سردیوں کی چمکیلی گرم اور نکھی دھوپ میں ہم بچے بیٹھے گنے چوس رہے تھے۔ گاجریں اور مولیاں بھی کھائی جا رہی تھیں۔

اچانک گاؤں کی طرف سے ایک آدمی تیز تیز چلتا آیا اور بولا "چاچا جی! فلاں آدمی فوت ہو گیا ہے۔ اس کے کفن دفن کا انتظام کرنا ہے۔"

افسوس کرنے کے بعد گاؤں کے گورکن کو بلایا گیا۔ پھر قبرستان میں جگہ کا تعین کرا کرا سے قبر کھودنے بھیج دیا۔ گورکن اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ اس زمانے میں قبر بغلی بنتی تھی جس میں مردہ دفنانے کے بعد گھڑے رکھ مٹی سے لیپ دی جاتی۔ آج کی طرح کنکریٹ سلیبوں والی نہیں!

مرکزی سڑک سے ایک چھوٹی پگڈنڈی گاؤں کو جاتی تھی۔ اس پر سے کم ہی لوگ گزرتے۔ قبر اسی راہداری کے کنارے بن رہی تھی۔ ایک بوڑھی عورت پگڈنڈی سے گزری۔ اس نے قبر کھدتی دیکھی، تو نجانے کیوں کھڑی ہو گئی۔

دراصل عورتوں نے کب قبریں اندر سے دیکھی ہوتی ہیں؟ وہ مائی بھی تجسس کے مارے ذرا آگے ہو کر قبر کے اندر جھانکنے لگی۔ قبر کی کچھ مٹی نیچے قبر بناتے گورکن کے پاس گری، تو اس نے کہا "مائی! پیچھے ہٹ کر کھڑی ہو۔" وہ پیچھے ہٹ گئی، لیکن اسے پھر قبر اندر سے دیکھنے کی طلب نے آ ستایا۔ وہ قبر کی مٹی پر کھڑی ہو کر اندر دیکھنے لگی۔ پھر مٹی گری، تو گورکن چلایا۔ بوڑھی پیچھے ہٹ گئی۔

پتا نہیں اس عورت کو کیا تجسس تھا کہ وہ تیسری بار پھر مٹی پر کھڑی ہو کے اندر جھانکنے لگی۔ اس دفعہ کافی مٹی قبر میں گر گئی۔ گورکن نے چلا کر اسے ڈانٹ پلائی۔ بوڑھے لوگوں کا دل کمزور ہوتا ہے۔ ڈانٹ سن کر مائی اتنی خوفزدہ ہوئی کہ لرز کر پہلے مٹی پر گرا اور پھر لڑھک کر قبر کے اندر گورکن کے قدموں میں جا پڑی۔

کچھ دیر گورکن کو سمجھ نہ آئی کہ کیا ہوا ہے؟ پھر وہ چیختا چلاتا ڈیرے کی طرف بھاگا۔ جا کر شور مچا دیا کہ سب آؤ۔ لوگوں نے اس سے پوچھا، کیا ہوا بھائی؟ کیا سانپ نکل آیا ہے قبر میں سے؟...... بہرحال ہم سب قبرستان پہنچے۔ قبر کے کنارے کھڑے ہو کر گورکن کی طرف دیکھنے لگے کہ ہاں بتاؤ کیا بات ہے؟ اس نے ہاتھ کے اشارے سے کہا، اندر دیکھو۔ سب اندر دیکھنے لگے۔ اندر بوڑھی مری پڑی تھی۔ گورکن نے پھر سارا ماجرا بیان کیا۔

اب اس مائی کو دفن کرنے کا مسئلہ پیدا ہو گیا۔ امام مسجد بلائے گئے۔ اب ہم لڑکوں کا مسئلہ نہ رہا۔ لہٰذا ہم ادھر اُدھر چلے گئے۔ دوسرے دن ہم لڑکے نئی قبر دیکھنے پہنچے، تو دیکھا وہاں دو قبریں بنی ہوئی ہیں۔ ◆◆◆

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

کھیل کھلاڑی

سیلز مین سے شہرت یافتہ بالر بننے تک

سعید اجمل کی داستان جدوجہد

اس مایہ ناز پاکستانی کا حیران کن سفرِ زیست

جن کی جوانی کے قیمتی سات برس

مفاد پرست سلیکٹروں کی وجہ سے مٹی ہوگئے

رضوان شاہ

۹ ستمبر ۲۰۱۴ء کو پاکستانی شائقین کرکٹ نے یہ خبر اداسی و مایوسی سے سنی کہ آئی سی سی نے سعید اجمل پر پابندی لگا دی ہے۔ وطن عزیز کے ممتاز آف بریک بالر پر پابندی ان کے بالنگ ایکشن کی وجہ سے لگی۔

دنیائے کرکٹ کا یہ بین الاقوامی قانون ہے کہ بالر بال کراتے وقت کہنی

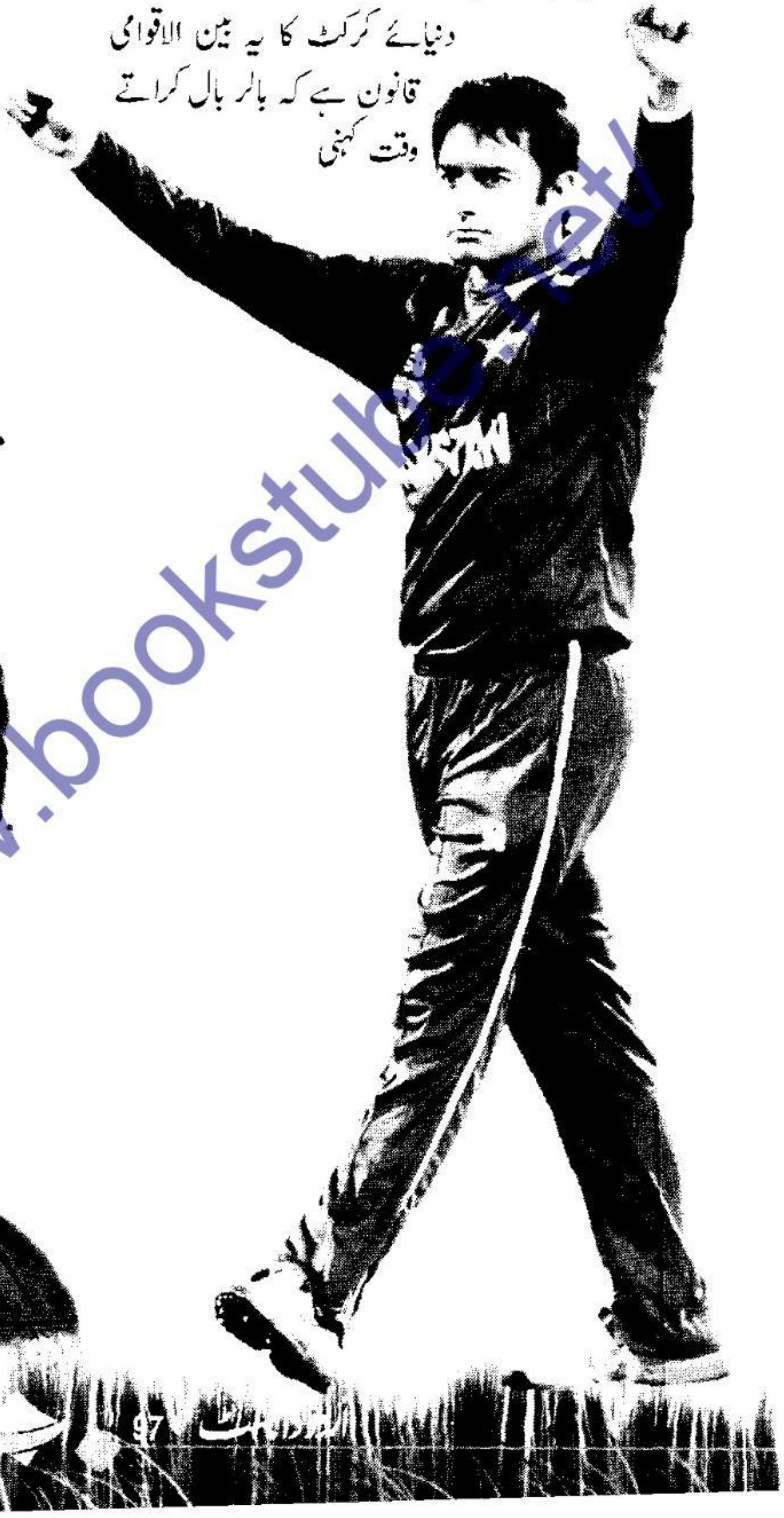

http://www.bookstube.net

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

کو زیادہ سے زیادہ ۱۵ درجے زاویے (ڈگری) تک سیدھا کر سکتا ہے۔ جب کہ آسٹریلوی شہر، برسبین کے نیشنل کرکٹ سینٹر میں معائنے سے معلوم ہوا، سعید اجمل کا ہاتھ ۱۵ درجے سے زیادہ سیدھا ہوتا ہے۔ اس قسم کی بالنگ ''وٹا'' (Chucking) کے زمرے میں آتی ہے، چناں چہ سعید اجمل کو بین الاقوامی کرکٹ کھیلنے سے روک دیا گیا۔

سعید اجمل دراصل ایک حادثے میں اپنی کلائی کی ہڈی تڑوا بیٹھے تھے۔ اسی لیے ان کا بالنگ ایکشن عام بالروں سے مختلف ہے۔ تاہم آئی سی سی نے طبی وجہ قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ چناں چہ سعید اجمل مشہور پاکستانی بالر، ثقلین مشتاق کی راہنمائی میں اپنا بالنگ ایکشن تبدیل کرنے کی سعی کرنے لگے۔ تادم تحریر اس کوشش میں انھیں کامیابی ہوئی ہے۔ لیکن ممکن ہے، آسٹریلیا میں ہونے والے عالمی کپ میں وہ شرکت نہ کر سکیں۔

جب سعید اجمل پر پابندی لگی، تو وہ ایک روزہ عالمی کرکٹ میں بہترین یا نمبرون بالر ہونے کا اعزاز رکھتے تھے۔ ٹیسٹ کرکٹ اور ٹی ٹوئنٹی کرکٹ میں بھی وہ دنیا کے دس بہترین بالروں میں شامل تھے۔ لیکن اچانک پابندی لگنے سے وہ یک دم دنیائے کرکٹ سے باہر ہو گئے۔

پاکستان کرکٹ بورڈ کے سابق سربراہ، ذکا اشرف کا دعویٰ ہے، بھارتیوں نے سازش کر کے سعید اجمل پر پابندی لگوائی ہے۔ یاد رہے، دو برطانوی امپائروں نے آئی سی سی کو مطلع کیا کہ سعید اجمل کا بالنگ ایکشن ''مشکوک'' ہے۔ نیز ایک اور اہم پاکستانی بالر محمد حفیظ کا بالنگ ایکشن بھی مشکوک قرار پایا۔ مدعا یہی ہے کہ ان بہترین بالروں کی عدم موجودگی میں پاکستانی ٹیم ورلڈ کپ نہ جیت سکے۔

☆☆☆

۴۷ سالہ سعید اجمل خود پروردہ (سیلف میڈ) شخصیت ہیں۔ ان کی ڈرامائی زندگی جدوجہد اور ثابت قدمی سے عبارت ہے۔ یہ آشکارا کرتی ہے کہ انسان ہمت دکھائے، تو راہ میں آنے والے پہاڑ بھی اس کے سامنے رائی ثابت ہوتے ہیں۔

سعید کا متوسط مہاجر خاندان سے تعلق ہے۔ آپ کے دادا، عبداللہ شیخ امرتسر شہر میں کپڑے کی تجارت کرتے تھے۔ تاہم وہ جوانی ہی میں وفات پا گئے۔ چناں چہ کاروبار حیات چلانے کی ذمہ داری سعید اجمل کے والد، معراج دین شیخ کے کاندھوں پہ آن پڑی۔

اسی دوران ہندوستان تقسیم ہو گیا اور پاکستان معرض وجود میں آیا۔ لہٰذا معراج دین والدہ کو لیے فیصل آباد چلے آئے۔ وہاں وہ نمک کا کاروبار کرنے لگے۔ جب کام مستحکم بنیاد پر استوار ہوا، تو انھوں نے شادی کر لی۔ معراج دین کے ہاں چھے بیٹوں اور ایک بیٹی نے جنم لیا۔ سعید بہن بھائیوں میں چھٹے نمبر پر ہیں۔ وہ ۱۴/اکتوبر ۱۹۷۷ء کو پیدا ہوئے۔ گھرانا مذہبی تھا، اسی لیے سعید بچپن ہی سے نماز کی پابندی کرنے لگے۔ انہی دنوں معراج دین نے نمک کے کاروبار کو خیرباد کہا اور کپڑے کی تجارت کرنے لگے۔ وہ ۲۰۰۹ء میں انتقال کر چکے۔ سعید کی والدہ رضیہ بی بی زندہ ہیں۔ ان کا تعلق سرگودھا سے ہے۔

سبھی بچوں کی طرح سعید بھی کھیل کود کے دیوانے تھے۔ اکثر صبح سے شام تک کھیلنے میں محو رہتے۔ کنچے، اخروٹ اور چھوگول گرم مرغوب کھیل تھے۔ تاہم وقت پر پڑھائی بھی کرتے۔ اسی لیے جماعت میں ہمیشہ اچھے نمبر لیتے۔ یوں ان کا تعلیمی سفر بھی مثبت انداز میں جاری رہا۔

http://www.bookstube.net/

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

۱۹۸۷ء میں انھوں نے ہائی اسکول میں داخلہ لے لیا۔ اب ہاکی، اسنوکر اور پتنگ بازی ان کے پسندیدہ کھیل بن گئے۔ تب سمیع اللہ، حنیف خان، حسن سردار اور کلیم اللہ دنیائے ہاکی میں چھائے ہوئے تھے۔ یہی کھلاڑی سعید کے ہیرو بھی تھے۔

ہڈی ٹوٹ گئی

پیسوں کی کمی تھی، چناں چہ دوست شاپنگ بیگ جمع کرتے اور انھیں آگ لگا دیتے۔ جب وہ پگھل جاتے، تو پگھلے مادے کو گیند کی شکل دے دی جاتی۔ جب کہ لکڑیاں بطور بلا استعمال ہوتیں۔ یوں من پسند کھیل کھیلنے کا بندوبست کیا جاتا۔ گو یہ گیند بڑی سخت ہوتی، جسم پر جہاں زور سے لگتی، نیل ڈال دیتی۔

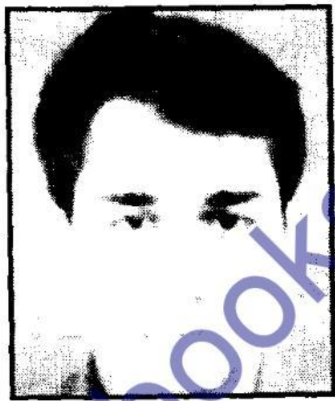

کرکٹ دوسرا پسندیدہ کھیل تھا۔ تب سعید فاسٹ بالنگ کرتے تھے۔ چونکہ ان کی گیند خاصی سوئنگ ہوتی، اس لیے اپنے علاقے میں ''فنگر باؤلر'' کے خطاب سے مشہور تھے۔ وہ اکثر بڑے بھائیوں کے ساتھ کرکٹ میچ کھیلتے جن میں ''ٹیپ بال'' استعمال ہوتی۔

خدا کا کرنا یہ ہوا کہ ایک میچ میں لڑکوں کے مابین لڑائی ہوگئی۔ ایک بڑے لڑکے نے سعید کو اٹھا کر زمین پر دے مارا۔ سعید کی کلائی پہ شدید ضرب لگی اور وہ ٹوٹ گئی۔ وہ زار و قطار رونے لگے۔ انھیں روتا دیکھ کر مخالف ٹیم کے بھی لڑکے فرار ہوگئے۔

سعید کی کلائی کا آپریشن ہوا اور اس پر پلاسٹر چڑھا رہا۔ ایک سال بعد جا کر انکشاف ہوا کہ وہ الٹی جڑ گئی ہے۔ اسی لیے گیند کراتے ہوئے قدرتی طور پہ سعید کا بازو ۱۵ درجے سے زیادہ بلند ہوتا ہے۔ اسی غیر معمولی پن نے سعید کی ''دوسرا'' نامی گیند کو بڑا خطرناک بنا دیا۔ ''دوسرا'' آف بریک گیند مخالف سمت گھومتی اور بلے باز کو پریشان کر دیتی ہے۔

۱۹۹۳ء میں سعید اجمل نے میٹرک پاس کر لیا۔ تب تک وہ ایک عمدہ بالر کی حیثیت سے مشہور ہو چکے تھے۔ لہٰذا فیصل آباد کے ایک کرکٹ کلب، نیشنل جم خانہ نے انھیں بطور فاسٹ بالر اپنی ٹیم میں شامل کر لیا۔ جم خانہ میں وقار احمد خان بالنگ کوچ تھے۔ انھوں نے ایک دن سعید سے کہا ''بیٹا! تمھارا قد چھوٹا ہے۔ تم تیز بالنگ کے بجائے آف اسپن کراؤ، تو زیادہ کامیاب رہو گے۔''

نوجوان سعید کو یہ مشورہ پسند آیا، چناں چہ وہ آف اسپن بالنگ کرنے لگے۔ وہ فاسٹ بالنگ کرتے ہوئے تھک جاتے۔ لہٰذا اسپن گیندیں کرانا انھیں آسان نظر آیا۔ خدا کی قدرت کہ غیر معمولی کلائی رکھنے کے باعث وہ ''دوسرا'' بال بڑی مہارت سے کرانے لگے۔ اور رفتہ رفتہ یہی گیند سعید کی پہچان بن گئی۔

ایک بدمزہ واقعہ

۱۹۹۴ء میں اپنی شاندار کارکردگی کے باعث سعید فیصل آباد کی انڈر ۱۹ ٹیم کے لیے منتخب ہوئے۔ مگر اسی سال ایک ایسا بدمزہ واقعہ پیش آیا جس نے سعید کا دل توڑ ڈالا۔ حتیٰ کہ انھوں نے کرکٹ کے کھیل ہی سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔

ہوا یہ کہ ایک میچ میں سعید نے مخالف ٹیم کے چار کھلاڑی آؤٹ کر دیے۔ اتفاقاً وہ میچ فیصل آباد کرکٹ ایسوسی ایشن کے سیکرٹری بھی دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے سعید کے کپتان کو پیغام بھجوایا: ''ارے یہ لڑکا آؤٹ پہ

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

آؤٹ کیے جا رہا ہے۔ اسے ہٹا دو۔'' گویا سیکرٹری سعید اجمل کو نمایاں ہوتا دیکھنے کا خواہش مند نہیں تھا۔

سیکرٹری کے حکم پر کپتان نے سعید کو بالنگ سے ہٹا دیا۔ اس ناانصافی نے نوجوان سعید کے دل پر گہرا اثر ڈالا۔ وہ جان گئے کہ کرکٹ کے کرتا دھرتا من پسند لڑکوں ہی کو آگے لاتے ہیں۔ ایسی ناگفتہ بہ صورت حال میں وہ قطعاً قومی ٹیم کا حصہ نہیں بن سکتے تھے۔

چناں چہ سعید نے دنیائے کرکٹ کو خیر باد کہہ دیا۔ تب ان کے والد مل مارکیٹ میں کپڑے کی دکان کھول چکے تھے۔ سعید دکان پر سیلزمینی کرنے لگے۔ یہ دیکھ کر معراج دین شیخ بہت خوش ہوئے۔ انھوں نے سکون کا سانس لیا کہ بیٹا ''ٹھیے'' پر بیٹھ گیا ہے۔ سعید نے کرکٹ کے شوق سے چھٹکارے کی خاطر اپنے بلے، پیڈ اور دیگر سامان نذرِ آتش کر دیا۔

۱۹۹۵ء میں سعید اسٹیٹ لائف سے منسلک ہو کر انشورنش کا کام بھی کرنے لگے۔ انھیں واپس کرکٹ میں لانے کا سہرا ان کے دوست، صابر حسین کے سر بندھتا ہے۔ صابر اٹھتے بیٹھتے سعید اجمل کو یہی بتاتے: ''تم بہت باصلاحیت بالر ہو۔ کوشش کرو، تو قومی ٹیم میں شامل ہو سکتے ہو۔''

آخر صابر حسین اصرار کر کے اپنے دوست کو لاہور لے آئے۔ ان دونوں نے ایم اے او کالج، لاہور میں داخلہ لیا۔ اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ تب ایم اے او کالج کی کرکٹ ٹیم کا بہت شہرہ تھا۔ حسب توقع سعید بہ حیثیت بالر کالج کرکٹ ٹیم کا حصہ بن گئے۔ عمدہ ٹیموں کے ساتھ کھیلتے ہوئے ان کی بالنگ میں نکھار آیا اور آخر کار وہ ابھرتے ہوئے کھلاڑیوں میں نمایاں بالر بن سامنے آئے۔

۱۹۹۶ء میں فیصل آباد شہر کی کرکٹ ٹیم نے سعید اجمل کو اپنی صف میں شامل کر لیا۔ اسی کی طرف سے انھوں نے اپنا پہلا فرسٹ کلاس میچ کھیلا۔ بعدازاں وہ واپڈا، خان ریسرچ لیبارٹریز، اسلام آباد اور زرعی ترقیاتی بینک کی کرکٹ ٹیموں سے بھی وابستہ رہے۔ نیز برطانیہ اور آسٹریلیا میں بھی فرسٹ کلاس کرکٹ کھیلی۔

اس زمانے میں ''دوسرا'' بال کے موجد، ثقلین مشتاق دنیائے کرکٹ میں چھائے ہوئے تھے۔ وہی نوجوان سعید کا آئیڈیل بالر بن گئے۔ سعید گھنٹوں ثقلین کی بالنگ وڈیو دیکھتے اور مختلف گیندیں سمجھنے کی سعی کرتے۔ انھوں نے وڈیو دیکھ دیکھ کر آف اسپن بالنگ کے اسرار و رموز سیکھے۔

مایوسی کی انتہا

سعید کی ذہنی و جسمانی بڑھوتری جاری رہی۔ حتیٰ کہ ۲۰۰۳ء کے ڈومیسٹک کرکٹ سیزن میں انھوں نے (فرسٹ کلاس میچوں میں) ۶۵ وکٹیں لیں۔ وہ اس سیزن میں سب سے زیادہ وکٹیں لینے والے پاکستانی بالر تھے۔ لہٰذا سعید کو امید تھی کہ بنگلہ دیشی ٹیم کے ساتھ ہونے عنقریب ہونے والی ٹیسٹ سیریز میں انھیں شامل کیا جائے گا۔ مگر قومی سلیکٹروں نے انھیں نظر انداز کر دیا۔

تاہم سعید اجمل ناکامی سے دل برداشتہ نہیں ہوئے اور انھوں نے پوری دل جمعی اور سرگرمی سے بالنگ کرانے کا سلسلہ جاری رکھا۔ انھیں امید تھی کہ شاندار کارکردگی دکھا کر وہ اگلے سال قومی کرکٹ ٹیم کا ضرور حصہ بن جائیں گے۔

۲۰۰۴ء کے ڈومیسٹک سیزن میں سعید نے ۶۲ وکٹیں لیں اور دوبارہ وطن عزیز کے نمایاں بالر ہونے کا اعزاز پایا۔ اس سال ساریو گنگولی کی قیادت میں بھارتی ٹیم پاکستان آئی۔ سعید کو یقین تھا کہ اس بار وہ ضرور پاکستانی ٹیم میں شامل ہو کر اپنی جادوئی بالنگ کا

http://www.bookstube.net

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

کرشمہ دکھا سکیں گے۔

جب پاکستان کرکٹ بورڈ نے قذافی اسٹیڈیم میں قومی کرکٹ ٹیم کا تربیتی کیمپ لگانے کا اعلان کیا، تو سعید اجمل بھی اسکواڈ میں شامل تھے۔ قدرتاً یہ جان کر وہ بہت خوش ہوئے۔ سعید اٹھتے بیٹھتے یہی سپنے دیکھنے لگے کہ وہ قومی ٹیم میں شامل ہو کر ٹنڈولکر اور گنگولی جیسے بڑے بلے بازوں کو آؤٹ کر رہے ہیں۔ مگر انھیں خبر نہ تھی کہ بدقسمتی ان کے تعاقب میں ہے۔

قومی ٹیم منتخب کرنے والے کارپردازوں نے انھیں پھر مسترد کر دیا۔ یہ دیکھ کر سعید اجمل ہمت ہار بیٹھے۔ وہ گزشتہ دو برس سے بہترین کارکردگی دکھا رہے تھے مگر اقربا پروری اور مصلحت پسندی کا شکار سلیکٹر انھیں خاطر ہی میں نہ لائے۔ یہ ایک بڑا المیہ تھا۔

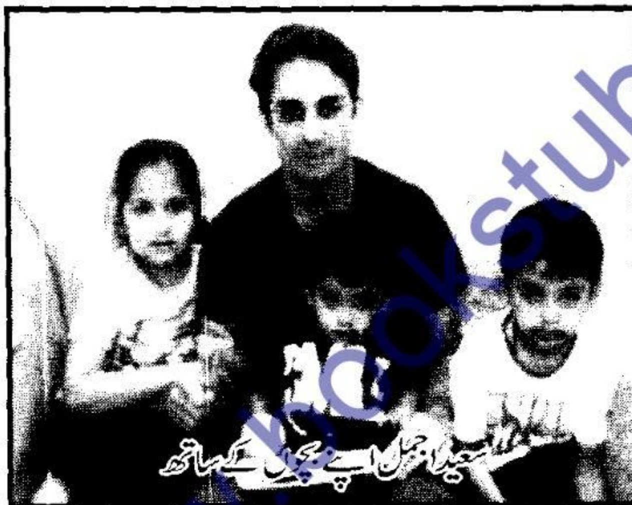
سعید اجمل اپنے بچوں کے ساتھ

مایوس ہو کر سعید اجمل نے پھر دنیائے کرکٹ کو خیرباد کہا اور کپڑے کے آبائی کاروبار سے منسلک ہو گئے۔ ویسے بھی ان کی عمر ۲۷ برس ہو چکی تھی۔ اس عمر میں تقریباً ہر نوجوان کسی نہ کسی شعبے میں قدم جما لیتا ہے۔

۲۰۰۵ء میں سعید نے والدین سے درخواست کی کہ ان کی شادی کر دی جائے۔ والد کہنے لگے "بیٹا! تم کہیں ٹک کر کام نہیں کرتے۔ پہلے کوئی باقاعدہ کام کرو، پھر شادی کا سوچیں گے۔"

اس پر بیٹے نے وعدہ کیا کہ وہ کپڑے کے کاروبار کو پورا وقت دے گا۔ چناں چہ دسمبر ۲۰۰۶ء میں ایک مناسب رشتہ دیکھ کر ان کی شادی کر دی گئی۔ تاہم شادی کے بعد جب ایک برطانوی لیگ ٹیم نے انھیں کرکٹ کھیلنے کی دعوت دی، تو سعید اسے رد نہ کر سکے۔ یوں ان کا اپنے پسندیدہ کھیل سے پھر رشتہ جڑ ہو گیا۔

برطانیہ میں کرکٹ میچ کھیلنے سے اچھی خاصی رقم ملتی ہے۔ اس لیے وہ ۲۰۰۷ء میں بھی انگلستان گئے۔ ۲۰۰۸ء میں جانے کی تیاری کر رہے تھے کہ مصباح الحق نے انھیں پیغام بھجوایا: "بیرون ملک نہ جاؤ۔ ہو سکتا ہے، ایشیا کپ کے کسی میچ میں تمھیں موقع دے دیا جائے۔"

سعید اجمل کو پیسا کمانے سے زیادہ قومی ٹیم میں کھیلنے سے زیادہ دلچسپی تھی۔ اس لیے قومی ٹیم میں جگہ پکی نہ ہونے کے باوجود وہ پاکستان ہی میں رک گئے۔ مصباح کی پیشین گوئی درست ثابت ہوئی۔ آخر بھارت کے خلاف ایک روزہ بین الاقوامی میچ میں سعید کو قومی ٹیم میں شامل کر لیا گیا۔ یوں ان کا ایک حسین سپنا پورا ہوا۔

وٹا کرانے پہ معطل

زندگی کے پہلے عالمی میچ میں سعید نے صرف ایک وکٹ لی۔ تاہم انھوں نے تمام پاکستانی بالروں میں سب سے زیادہ کم رن دیے۔ یوں بہ حیثیت "اکنامکل بالر" ان کی پاکستانی ایک روزہ قومی ٹیم میں جگہ پکی ہو گئی۔

سعید قومی ٹیم میں اپنی جگہ بنانے کے لیے خوب تگ و دو کر رہے تھے کہ ان پر ایک مصیبت آ پڑی۔ آئی سی سی

http://www.bookstube.net/

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

نے ان پر الزام لگایا کہ وہ "دفعا" بالنگ کراتے ہیں۔ لہٰذا سعید کو معطل کر دیا گیا۔ یہ اپریل ۲۰۰۹ء کی بات ہے۔

اگلے ماہ یونیورسٹی آف ویسٹرن آسٹریلیا میں سعید کا بالنگ اسٹائل ٹیسٹ سے گزرا۔ امتحانی جانچ سے معلوم ہوا کہ بال کراتے ہوئے ان کا بازو ۵ اور جے زاویے سے کچھ ہی اوپر اٹھتا ہے۔ ٹوٹی کلائی اس عمل کا باعث تھی۔ چونکہ یہ ایک غیر معمولی کیس تھا لہٰذا سعید پر عائد پابندی ہٹالی گئی۔ انھوں نے پھر سکون کا سانس لیا۔

سعید نے ۲۰۰۹ء میں اپنا اولین ٹیسٹ میچ اور ٹی ٹوئنٹی میچ کھیلا۔ وہ اب تک ۳۵ ٹیسٹ، ۱۱۱ ایک روزہ عالمی مقابلے اور ۶۳ بین الاقوامی ٹی ٹوئنٹی میچ کھیل چکے۔

۲۰۰۹ء میں دوسرا ٹی ٹوئنٹی کپ کھیلا گیا۔ اس میں ابتداً سعید قومی ٹیم میں شامل نہیں تھے۔ مگر کھلاڑیوں کے پرزور اصرار پر انھیں ٹیم میں لیا گیا۔ سعید نے اپنا انتخاب درست ثابت کر دیا جب عالمی کپ میں ۱۲ وکٹیں لے کر دوسرے کامیاب ترین بالر بن گئے۔ صرف پاکستانی بالر، عمر گل کی وکٹیں (۱۳) ان سے زیادہ تھیں۔ وہ عالمی کپ پاکستان ہی نے جیتا۔

۲۰۱۰ء کے ٹی ٹوئنٹی کپ میں بھی سعید نے اپنی بہترین فارم برقرار رکھی تاہم آسٹریلیا کے خلاف سیمی فائنل میں ان کی قسمت یاوری نہ کر سکی۔ وہ میچ پاکستان جیت رہا تھا کہ مائیکل ہسی نے سعید کے اوور میں تین چھکے اور ایک چوکا لگا کر بازی پلٹ دی۔ سعید اسے اپنے کیریئر کے سب سے برے اور افسوس ناک لمحات قرار دیتے ہیں۔

سعید اجمل کی داستان حیات سے عیاں ہے کہ سلیکٹروں نے طویل عرصہ ان پر توجہ نہیں دی۔ یوں ان کی نوجوانی کے وہ قیمتی سال ضائع ہوگئے جب سعید زیادہ بہتر کارکردگی دکھا سکتے تھے۔ اگر ۲۰۰۲ء یا ۲۰۰۳ء میں سعید کو قومی ٹیم کا حصہ بنایا جاتا، تو یقیناً وہ پاکستان کی جھولی میں زیادہ فتوحات ڈال دیتے۔ نیز ان کی وکٹوں کی تعداد بھی زیادہ ہوتی۔

◆◆◆

آج کا سبق

استاد جماعت میں داخل ہوا اور اس نے کچھ کہے بغیر تختہ سیاہ پر ایک لمبی لکیر کھینچ دی پھر طلبہ کی طرف متوجہ ہوا اور کہنے لگا "تم میں سے کوئی ہے جو اس لکیر کو چھوئے بغیر چھوٹا کر دے۔"

سب طالب علم خاموش تھے۔ آخر ایک طالب علم نے کہا "سر! یہ ناممکن ہے۔ اسے چھوٹا کرنے کے لیے مٹانا پڑے گا۔ جب کہ آپ اس کو چھونے سے بھی منع کر رہے ہیں۔"

استاد نے پھر کلاس کا جائزہ لیا۔ سب بچوں کے چہرے پر یہی لکھا تھا۔ استاد نے پھر کچھ کہے بغیر تختہ سیاہ پر پہلی لکیر کے متوازی مگر اس سے بڑی ایک اور لکیر کھینچ دی۔ بچے حیران رہ گئے کیونکہ انھیں صاف نظر آ رہا تھا کہ اب پہلی لکیر چھوٹی ہوگئی ہے۔ جب کہ اسے نہ چھیڑا گیا اور نہ ہی چھوا گیا۔

استاد نے کہا "بیٹا، اس لکیر کا یہی پیغام ہے کہ ہم زندگی میں دوسروں کی لکیریں مٹائے بغیر بھی اپنی لکیر بنا سکتے ہیں۔ اس کے لیے نہ کسی کی لکیر کو مٹانے کی ضرورت ہے نہ چھوٹا کرنے کی۔ گویا ہم دوسروں کو نقصان پہنچائے بغیر، انھیں بدنام کیے بغیر، ان سے حسد کیے اور الجھے بغیر بھی آگے بڑھ سکتے ہیں۔"

(مرسلہ: محمد خلیل چودھری، دینہ ضلع جہلم)

http://www.bookstube.net
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

تہذیبِ مغرب میں جنم لینے والی

تبدیلی

زندگی میں ہر پل تبدیلیاں لانے کے ایک شوقین نے کھیل کھیل میں اقدار کا جنازہ نکال ڈالا

جمیل اختر

میں ٹام کو پچھلے پانچ سال سے جانتا ہوں۔ کوئی دن ایسا نہیں گزرتا جب ایک دوسرے پر ہماری نظر نہ پڑے اور چار چھ جملوں کا تبادلہ نہ ہو۔ وہ میرا ہمسایہ ہے۔ میرے دائیں ہاتھ کے چوتھے گھر میں اپنے باپ جیمز، اپنی دوست، کیتھی اور چمک دار کالے رنگ والے چھوٹے خوبصورت کتے کے ساتھ رہتا ہے۔

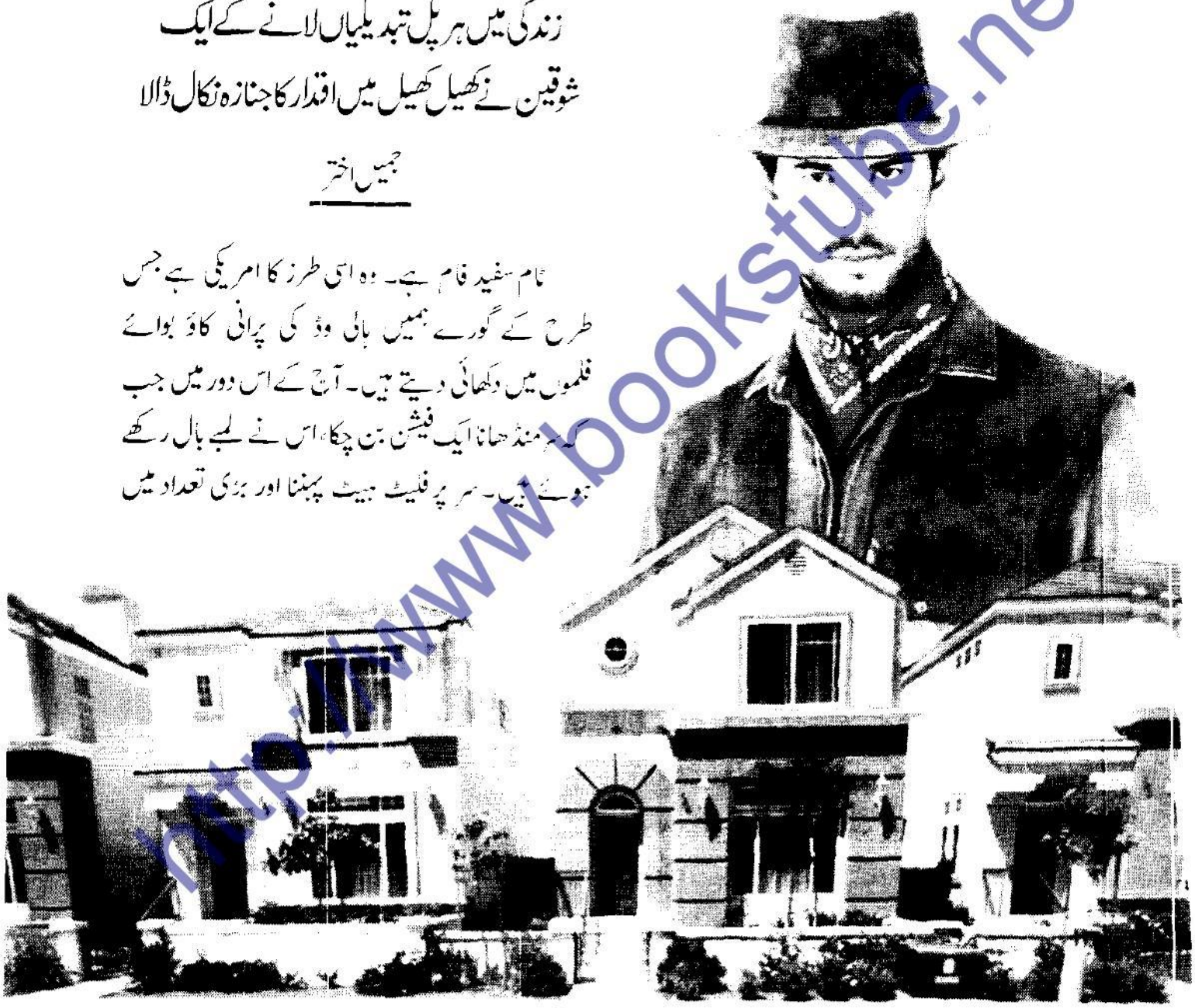

ٹام سفید فام ہے۔ وہ اسی طرز کا امریکی ہے جس طرح کے گورے ہمیں ہالی وڈ کی پرانی کاؤ بوائے فلموں میں دکھائی دیتے ہیں۔ آج کے اس دور میں جب کہ سر منڈھانا ایک فیشن بن چکا، اس نے لمبے بال رکھے ہوئے ہیں۔ سر پر فلیٹ ہیٹ پہننا اور بڑی تعداد میں

http://www.bookstube.net/

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

سگریٹ پھونکنا اس کی شخصیت کا حصہ ہیں۔ کبھی کبھی مجھے خیال آتا ہے کہ اگر وہ واشنگٹن کے اس مضافاتی قصبے، سپرنگ فیلڈ کے بجائے ہالی وڈ میں ہوتا، تو شاید وہاں فلموں میں چھوٹا موٹا کردار کرتے دکھائی دیتا۔

ٹام نے پانچ سال پہلے میپل کے اونچے درختوں سے گھرے اس علاقے میں مکان خریدا۔ اس شام جب میں باہر نکلا، تو ہماری گلی میں چوتھے گھر کے سامنے ایک ٹرک کھڑا تھا۔ دو سیاہ فام مزدور سامان اتار کر اندر لے جا رہے تھے۔ ٹام سگریٹ پیتے ہوئے انھیں ہدایات دے رہا تھا۔ میں نے قریب سے گزرتے ہوئے ہیلو کہا، تو وہ بڑی گرم جوشی سے ملا۔ دو چار رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد میں نے پوچھا ''کہاں سے آئے ہو؟''

وہ کندھے اچکا کر بولا ''پچھلی گلی سے۔''

میرے منہ سے بے اختیار نکلا ''وہ کیوں؟''

وہ چند لمحے حیرت سے میری جانب تکتا رہا۔ پھر مسکرا کر بولا ''وہاں بور ہو گیا تھا۔ تین سال بہت ہوتے ہیں کسی ایک گھر میں رہنے کے لیے! بس تبدیلی کو دل چاہا، تو ادھر آ گیا۔''

تین سال بعد ٹام کا دل شاید اس گھر سے بھی سیر ہو گیا اور مکان کے باہر ''برائے فروخت'' کا بورڈ لگ گیا۔ دلچسپ بات یہ کہ ان تین برسوں کے دوران شاید ہی کوئی ہفتہ ایسا گزرا ہو جب میں نے ٹام کے گھر میں تبدیلی آتے نہ دیکھی۔ کبھی باہر لان میں نئے پودے لگ رہے ہیں، تو کبھی رنگ روغن کرنے والے ڈبے، برش اور سیڑھی اٹھائے گھوم رہے ہیں۔ کبھی نئے پردے لگانے والے آتے، تو کبھی فرنیچر تبدیل ہو رہا ہے، حتیٰ کہ ان تین برسوں میں، میں نے تین بار اس کی گاڑی بھی تبدیل ہوتے دیکھی۔

البتہ چوتھا سال شروع ہونے پر یہ سلسلہ رک گیا۔ اس لیے نہیں کہ ٹام کا دل اس گھر میں لگ گیا تھا بلکہ کساد بازاری کے باعث تبدیلی کی کوئی خواہش پوری کرنا ممکن نہیں رہا تھا۔ بالآخر چھے مہینے بعد اسے اپنے مکان کے سامنے سے برائے فروخت کا بورڈ بھی اتارنا پڑا۔

اس نے بڑے دکھ سے بتایا ''ان چھے مہینوں میں صرف پانچ لوگ گھر دیکھنے آئے۔ صرف ایک نے پیش کش دی اور وہ بھی میری قیمت خرید سے آدھی۔'' پھر وہ سگریٹ کا کش لگا کر بولا ''تمھیں پتا ہے، جب میں نے اپنا پچھلا گھر سیل پر لگایا تھا، تو پہلے ہی ہفتے سات پیش کشیں آئی تھیں۔ میں نے ایک پر ہاں کر دی۔ اس سودے میں مجھے پورے پچاس ہزار ڈالر بچے تھے۔''

میں نے کہا ''پوری دنیا مندے کی لپیٹ میں ہے۔ کچھ اور انتظار کر لو۔'' اس نے اپنے کندھے اچکا کر سگریٹ سلگا لی۔

مکان بیچنے میں ناکامی کے باوجود ٹام چھوٹی موٹی تبدیلیاں کر کے تبدیلی کا اپنا شوق پورا کرتا رہا۔ مثلاً کبھی اپنے سگریٹ کا برانڈ بدل کر، کبھی اپنی گاڑی پر نئے اسٹیکر لگا، کبھی لان کے پودے اور کبھی ان میں آرائشی لیمپ لگا کر۔

ہماری گلی میں اپنی رہائش کے پہلے تین سال میں ٹام نے تین بار نوکری بدلنے کا شوق بھی پورا کیا۔ مگر چوتھے سال اسے یہ شوق خاصا مہنگا پڑا۔ آخری نوکری چھوڑنے کے بعد اسے چھے مہینے سے زیادہ عرصے تک بیروزگار رہنا پڑا۔ مجھے یاد ہے، ان دنوں وہ باقاعدگی سے اپنا بیروزگاری الاؤنس وصول کرنے جاتا تھا۔ پورا دن وہاں گزار کر جب واپس آتا، تو اس کا چہرہ کھلا ہوا ہوتا۔

http://www.booksube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

اس نے ایک سے زیادہ بار مجھے کہا تھا "یہ نہ سمجھنا، میں خیرات ملنے پر خوش ہوں۔ بلکہ خوشی کی وجہ یہ ہے کہ زندگی میں کوئی تبدیلی تو آئی۔ آئی ٹی والے موٹے باس کا مکروہ چہرہ دیکھ دیکھ کر میں بور ہو گیا تھا۔"

چھے ماہ کی بیروزگاری کے بعد وہ ایک بڑے گراسری اسٹور میں ملازمت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ میں نے اس سے پوچھا، کیا تم وہاں نیٹ ورکنگ کے شعبے میں کام کرو گے؟

وہ کندھے اچکا کر بولا "نہیں، وہاں بیکری کی ملازمت ہے۔"

میں نے حیرت سے پوچھا "تو کیا آئی ٹی انجینئر ڈبل روٹیاں بنائے گا؟"

اس نے حسب عادت خوش دلی سے قہقہہ لگایا اور کہا "شکر ہے، ملازمت میں کوئی تبدیلی تو آئی۔ میں کمپیوٹر کی سکرین سے بور ہو گیا تھا۔"

ٹام نے اس محلے میں چوتھا سال تو جیسے تیسے گزار لیا مگر پانچواں سال شروع ہوتے ہی اس پر شدید بوریت کا دورہ پڑ گیا۔ وہ ایک بار پھر اپنا مکان بیچنے کی کوشش کرنے لگا۔ کساد بازاری کے اس دور میں جائیداد کی خرید و فروخت کرنے والے ایجنٹ کو اور کیا چاہیے تھا۔ اس نے ٹام کو مشورہ دیا کہ آج کے دور میں مکان بیچنے کے لیے ضروری ہے کہ اسے دلھن کی طرح خوب اچھی طرح بنایا سنوارا جائے۔

ایجنٹ کے مشورے پر اس نے گھر کا رنگ روغن تبدیل کرایا۔ نئے پردے لٹکائے، نیا قالین ڈلوایا، فرنیچر کی سیٹنگ تبدیل کی۔ اس بار ایجنٹ نے پہلے سے کہیں بڑا بورڈ لگایا۔ اخبارات اور انٹرنیٹ پر باتصویر اشتہارات دیے۔ دو مہینے تک ہر اتوار کو رنگ برنگے غبارے لگا کر اوپن ہاؤس بھی لگایا۔ مگر اس سارے عرصے میں وہاں سوائے میرے اور کوئی نہیں گیا۔ میں بھی یہ پوچھنے جاتا تھا کہ کوئی مکان دیکھنے آیا؟ ہر بار ٹام پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ نفی میں گردن ہلا دیتا۔

آٹھویں مہینے مکان کے باہر لگا ہوا برائے فروخت کا بورڈ ایک بار پھر اتر گیا۔ میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا "یہ بہت اچھا گھر اور بہت اچھی جگہ ہے۔ آخر تم اسے کیوں بیچنا چاہتے ہو؟"

وہ سگریٹ کا کش لگا کر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "میرا خیال ہے کہ تمھاری شکل دیکھنے کے لیے پانچ سال بہت ہیں۔"

میں نے ہکلاتے ہوئے پوچھا "کیا مطلب؟"

وہ سنجیدگی سے بولا "میں نے شادی اس لیے نہیں کی کہ کوئی ایک چہرہ عمر بھر نہیں دیکھ سکتا۔ اسی لیے دوست رکھتا ہوں۔ جب دل تبدیلی کو چاہے، نئی لے آتا ہوں۔"

پھر وہ ایک سرد آہ کھینچ کر بولا "کیتھی کے ساتھ رہتے ہوئے پانچ سال ہو گئے ہیں۔ کوئی نیا گھر لوں گا تو......"

اس واقعے کے ایک مہینے بعد میں شام کی سیر کرنے باہر نکلا۔ ٹام اپنے گھر کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ چمک رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ بڑے جوشیلے انداز میں بولا "میں نے ملازمت تبدیل کر لی ہے۔ اگلے ہفتے میں بیکری نہیں بلکہ ایک ادویہ ساز کمپنی کے دفتر جاؤں گا۔"

پھر وہ اپنی بائیں آنکھ دبا کر بولا "اگلے ہفتے سوزی یہاں آجائے گی۔"

میں نے حیرت سے پوچھا "سوزی کون ہے؟"

وہ مسکرایا "نئی دوست ہے۔ کیتھی پرسوں ہوسٹن چلی جائے گی۔ اسے وہاں ملازمت مل گئی ہے۔"

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

میں نے ہنس کر کہا ''تو بس اب گھر ہی پرانا ہے۔ باقی تو تم نے سب کچھ ہی تبدیل کر لیا۔''

وہ قدرے اداس ہوتے ہوئے بولا ''کساد بازاری نہ ہوتی، تو میں تبدیلی کا کام گھر ہی سے شروع کرتا..... خیر میں اس پرانے گھر کو ہی نیا بناؤں گا۔''

کل شام نے اپنے پرانے گھر کی نئے سرے سے آرائش کرنے پر دعوت دی۔ اس محفل میں محلے میں سے اس نے صرف مجھے ہی بلایا۔ باقی سارے مہمان نئے تھے۔ پردے، صوفے، تصاویر، سب کچھ نیا تھا۔ شام ایک دبلی پتلی لڑکی سے سب کا تعارف کرا رہا تھا۔ وہ سویٹی تھی۔ کمرے میں پرانے کالے کتے کے بجائے روئی کے گالوں جیسی سفید بلی گھوم رہی تھی۔ شام نے مجھے بتایا کہ بلی سویٹی کے ساتھ آئی ہے۔ پھر وہ شرارتاً بائیں آنکھ دبا کر مسکرایا اور بولا ''اب اس گھر میں صرف ایک چیز پرانی ہے اور وہ ہوں میں۔''

میں نے ٹوکا ''مگر تمھارے والد بھی تو ہیں۔''

وہ قدرے آہستہ آواز میں بولا ''میں کل رات انھیں اولڈ ایج ہاؤس چھوڑ آیا ہوں۔''

◆◆◆

مبارک اردو لائبریری

رحیم یار خان کی تحصیل صادق آباد میں محمد آباد نامی گاؤں آباد ہے۔ اس گاؤں کی وجہ شہرت مبارک اردو لائبریری ہے۔ اس گاؤں کی وجہ شہرت مبارک اردو لائبریری ہے۔ یہ کتب خانہ ۱۹۲۶ء میں سید مبارک شاہ جیلانی نے قائم کیا۔ مبارک شاہ جیلانی اردو زبان و ادب کے عاشق اور خطۂ بہاولپور کو یونیورسٹی بنانا چاہتے تھے۔ مشاہیر سے انھیں خاص قربت تھی۔ مولوی عبدالحق، نیاز فتح پوری اور سید سلیمان ندوی جیسے جید اہل قلم کی مشاورت سے کتب خانے کی پُرشکوہ عمارت تعمیر کی گئی۔ روش صدیقی کی مشاورت سے ۱۹۳۳ء میں ریاست بہاولپور کا پہلا ادبی پرچہ ''لالہ صحرا'' بھی یہیں سے جاری ہوا۔

مشاہیر سے مراسلت اور رابطوں کی وجہ سے کتب خانہ ہندوستان بھر میں مشہور ہوا۔ ماہر القادری، رئیس امروہوی، رئیس احمد جعفری سمیت کئی مشاہیر نے کتب خانے کو شرف مہمانی بخشا۔ اس کتب خانے کی خاص بات یہ ہے کہ یہاں مشاہیر کے ۱۵۰۰۰ ہزار خطوط محفوظ ہیں جن میں سرسید احمد خان، علامہ اقبالؒ اور دیگر مشہور ہستیاں شامل ہیں۔ لائبریری میں اسلام، فقہ، تاریخ، فلسفہ، اردو ادب، فارسی ادب و تاریخ، انگریزی ادب، نفسیات، سماجیات سمیت ہر موضوع پر ۱۶۰۰۰ ہزار کتابیں موجود ہیں۔ قرآن پاک کے قدیم قلمی نسخے بھی لائبریری میں محفوظ ہیں۔

یہ کتب خانہ اب مبارک صاحب کے فرزند سید انیس شاہ جیلانی نے سنبھال رکھا ہے۔ تاہم اس کی حالت بہت ناگفتہ بہ ہے۔ عمارت انتہائی خستہ حالی کا شکار ہے۔ جگہ کی کمی اور خاص ترتیب نہ ہونے کی وجہ سے نایاب کتابیں بوریوں میں بند مٹی سے اٹی پڑی ہیں۔ کتاب خانے کی حالت زار دیکھ کر مجھے قوم کی بدقسمتی پر رونا آتا آ گیا۔ کتاب دوستی جس قوم کی میراث تھی، آج علم و تحقیق سے کوسوں دور ہے۔ ہمارے کتب خانے ویران، تفریح گاہیں اور ''فوڈ پوائنٹس'' آباد ہیں۔ نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔ اغیار جو کبھی ہمارے زیر تھے، زبر ہو چکے۔ جب تک مسلمان کتاب اور کتب خانوں سے جڑے رہے، دنیا پر حکمران رہے تاج ان کے سر پر سجا رہا۔ آج تعلیم کا مقصد علم کی جستجو نہیں روزگار کے لیے ڈگری کا حصول ہے۔ ایسے میں تعلیمی ادارے ڈگریاں تو دے رہے ہیں کردار سازی کہیں نہیں ہو رہی۔ یہی وجہ ہے کہ ہم معاشرتی اور معاشی زبوں حالی کا شکار ہیں۔ (مرسلہ: فاروق شہزاد)

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

کہاں کی اینٹ کہاں کا روڑا......

شعر کو پڑ گئے چور

ان اشعار کا تذکرہ خوش ادا
جو دوسرے شاعروں سے منسوب ہوئے

محمد آصف جعلی

کچھ غلطیاں اتنی پختہ ہوجاتی ہیں کہ ان کی اصلاح کرنے والا خود آزمائش میں پڑ جاتا ہے۔ مثال کے طور پر میر تقی میر کا درج ذیل شعر جب بھی پڑھا، لکھا یا بولا جائے، تو اس کا متن یہی ہوتا ہے۔

میر کیا سادہ ہیں، بیمار ہوئے جس کے سبب
اسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں

حالانکہ میر تقی میر کے کسی بھی مستند کلیات کا مطالعہ کر لیں، تو معلوم ہوگا کہ میر نے شعر کے دوسرے مصرع میں لونڈے کا لفظ ہرگز استعمال نہیں کیا۔ میر کا کہا ہوا صحیح

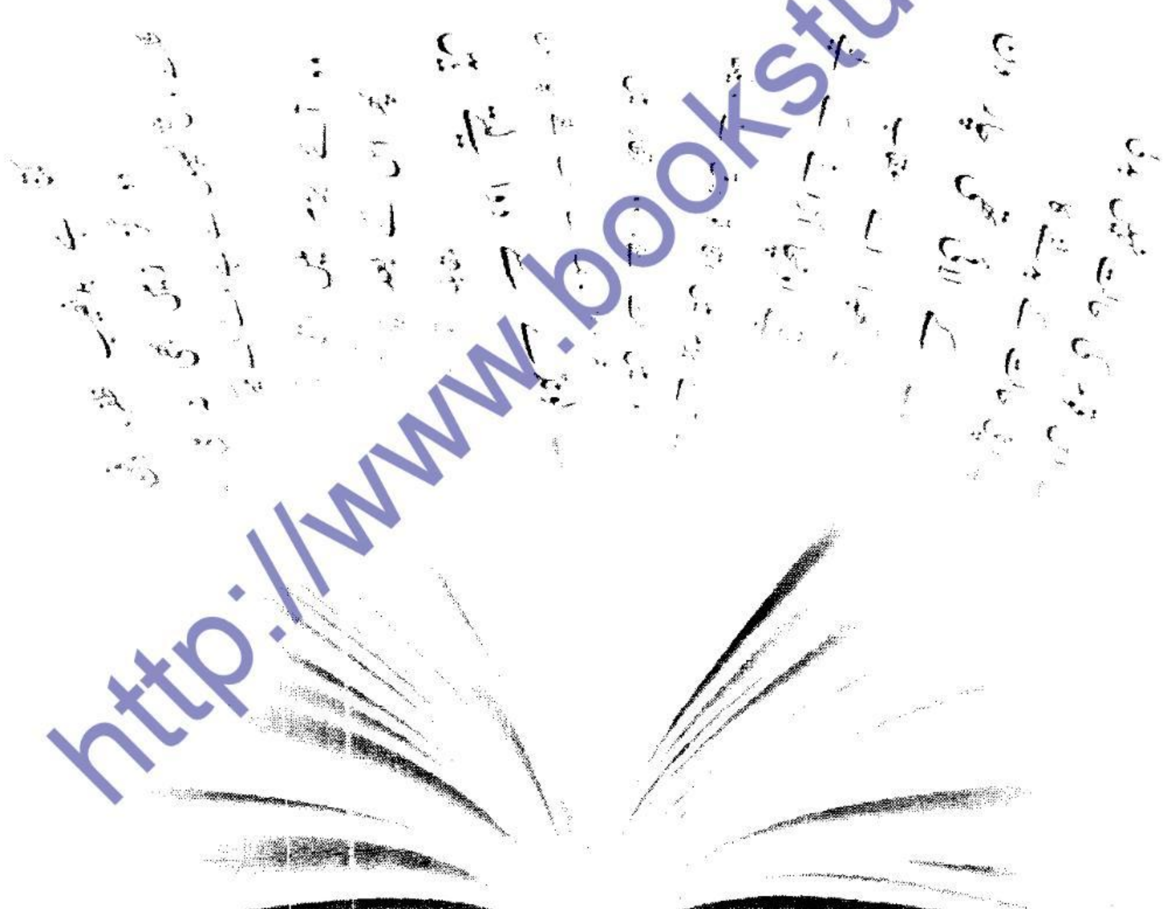

http://www.bookstube.net/

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

مصرع یہ ہے ع

اسی عطار کے لڑکے سے دوا لیتے ہیں

☆☆

آپ نے اخبارات و رسائل میں سیکڑوں دفعہ درج ذیل شعر علامہ اقبالؒ کے حوالے سے پڑھا ہوگا۔

تندیٔ بادِ مخالف نہ گھبرا اے عقاب
یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اُڑانے کے لیے

یہ شعر ضلع سیالکوٹ کی سابق تحصیل شکرگڑھ کے ایک ایڈووکیٹ، سید صادق حسین کا ہے۔ ان کی ایک مختصر کتاب ''برگ سبز'' ۱۹۷۶ء میں شائع ہوئی تھی جس میں یہ شعر موجود ہے۔ غالباً لفظ عقاب کی وجہ سے یہ شعر علامہ اقبال سے منسوب کر دیا گیا۔ یوں سید صادق حسین ایڈووکیٹ کو ان کے اکلوتے مشہورِ زمانہ شعر سے بھی محروم کر دیا جاتا ہے۔

☆☆

اسی طرح اردو کا ایک ضرب المثل شعر مقررین اکثر اپنی تقاریر اور کالم نویس اپنے کالموں میں استعمال کرتے ہیں:

وہ آئے بزم میں اتنا تو میرؔ نے دیکھا
پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

یہ شعر آغا شاعر قزلباش کے ایک شاگرد مہاراج بہادر برق کا ہے اور غلط طور پر میر تقی میرؔ سے منسوب ہوا۔ آپ میرؔ کے چھے دیوان پڑھ لیں، کہیں بھی آپ کو یہ شعر نظر نہیں آئے گا۔ دہلی میں ۱۸۸۴ء میں پیدا ہونے والے مہاراج برق کے مذکورہ بالا شعر کا پہلا مصرع اچھی طرح یاد کر لیں ع

وہ آئے بزم میں اتنا تو برقؔ نے دیکھا

☆☆

بہادر شاہ ظفر کا درج ذیل شعر ہر کسی نے سن ہوگا:

کتنا ہے بدنصیب ظفرؔ، دفن کے لیے
دو گز زمیں بھی نہ ملی کوئے یار میں

عوام الناس نے اسی غزل کے حوالے سے ایک اور شعر بھی بہادر شاہ ظفر سے منسوب کر رکھا ہے۔

عمرِ دراز مانگ کے لائے تھے چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے، دو انتظار میں

لیکن یہ شعر بہادر شاہ ظفر کا بالکل نہیں بلکہ سیماب اکبر آبادی کا ہے۔ ان کی ۱۹۴۷ء میں شائع ہونے والی کتاب ''کلیم عجم'' میرے پاس موجود ہے۔ اس میں یہ شعر آیا ہے۔ جس شخص کو شبہ ہو، اسے سیماب اکبر آبادی کی پوری غزل کی فوٹو کاپی مہیا کی جا سکتی ہے۔ سیماب نے زیر بحث شعر کا پہلا مصرع اس طرح کہا ہے ع

عمرِ دراز، مانگ کے لائی تھی چار دن

☆☆

بڑے پڑھے لکھے اور اعلیٰ ادبی ذوق رکھنے والے حضرات بھی درج ذیل شعر کو کبھی علامہ اقبالؒ اور کبھی مولانا حالیؔ سے منسوب کر دیتے ہیں:

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

یہ شعر قرآن حکیم کی ایک مشہور آیت کا ترجمہ ہے۔ یہ منظوم تخلیقی ترجمہ مولانا ظفر علی خان نے کیا۔ یہ شعر ۱۹۳۷ء میں شائع ہونے والی مولانا ظفر علی خان کی کتاب ''بہارستان'' میں شامل ہے۔

☆☆☆

ایک اور شعر جو کبھی میر تقی میرؔ اور کبھی امیر مینائی سے منسوب کر دیا جاتا ہے، وہ یہ ہے۔

شکست و فتح نصیبوں سے ہے ولے اے میرؔ

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

یہ شعر نہ تو میر تقی میر کا ہے اور نہ ہی امیر مینائی کا! بلکہ زمانہ قدیم کے ایک شاعر، محمد یار خان امیر کا ہے۔ شعر کا درست متن بھی یوں ہے ۔

شکست و فتح میاں اتفاق ہے لیکن
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

☆☆

مصحفی کا یہ شعر ضرب المثل کی طرح مشہور ہے:

عجیب یہ رسم دیکھی، مجھے روزِ عید قرباں
وہی ذبح بھی کرے ہے، وہی لے ثواب الٹا

یہی شعر پہلے مصرع کی تبدیلی کے ساتھ انشا سے بھی منسوب ہے ۔

یہ عجیب ماجرا ہے کہ بروزِ عید قرباں
وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا

قاضی عبدالودود نے تحقیق کے بعد ثابت کیا ہے کہ یہ شعر مصحفی ہی کا ہے۔

مضمون کا دامن چونکہ مختصر ہے اس لیے میں تفصیل میں جائے بغیر چند اشعار کا درست متن اور ان کے خالق اصل شاعروں کے نام درج کر رہا ہوں:

اس دین کی فطرت میں قدرت نے لچک دی ہے
اتنا ہی یہ ابھرے گا جتنا کہ دبا دیں گے

(صفی لکھنوی)

اس کو ناقدریِ عالم کا صلہ کہتے ہیں
مر چکے ہم تو زمانے نے بہت یاد کیا

(برج نرائن چکبست)

افسوس بے شمار سخن ہائے گفتنی
خوفِ فسادِ خلق سے ناگفتہ رہ گئے

(آزاد انصاری)

قوانین نعمت ہیں

میں سمجھتا ہوں کہ قوانین ہی ہمیں انسان بناتے ہیں۔ اگر انسان کو محض ایک قانون سے آزاد کیا جائے، تو وہ تھوڑی حیوانی شکل میں آ جاتا ہے۔ قانون نمبر۲ سے آزاد کریں، تو تھوڑا مزید نقصان دہ حیوان بن جاتا ہے۔

اگر سبھی قوانین سے بالکل آزاد کر دیں تو وہ اژدہا سے زیادہ زہریلا ہو جاتا ہے۔ اس کے زہر سے کوئی کوئی ہی بچ پاتا ہے، اس لیے انسان کو ہمیشہ قوانین میں بندھا ہوا رہنا چاہیے۔ وہ جتنا زیادہ پابند ہو گا، اتنا کم اس کا زہر ہو گا۔ بلکہ کڑواہٹ ختم ہو کر مٹھاس میں بدل جائے گی۔ اور زہر تریاق کی صورت اختیار کر جائے گا۔ (سجاد محمود شیخ، شاہ عالمی، لاہور)

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے
جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

(ثاقب لکھنوی)

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
کسی کام میں جو نہ آ سکے میں وہ ایک مشتِ غبار ہوں

(مضطر خیر آبادی)

یہ شعر جاں نثار اختر کے والد، مضطر خیر آبادی کا ہے جسے ہمیشہ خواہ مخواہ بہادر شاہ ظفر کو سونپ دیا جاتا ہے۔ ۱۸۸۷ء میں کلیات ظفر پہلی دفعہ شائع ہوئی تھیں۔ پھر ۱۹۱۸ء میں پانچویں ایڈیشن چھپا۔ ان سب میں یہ شعر شامل نہیں۔ جاں نثار اختر نے اپنے مضمون میں باقاعدہ طور پر وضاحت بھی کی کہ ان کے والد کی غزل غلط طور پر بہادر شاہ ظفر سے منسوب کر دی گئی ہے۔

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

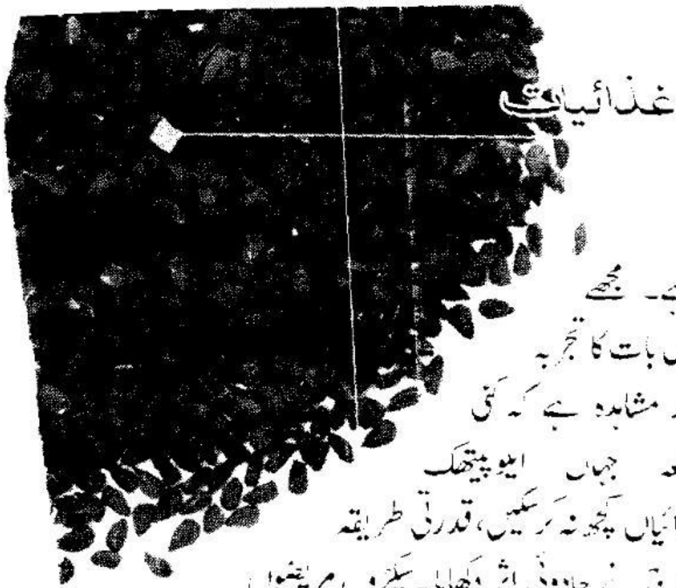

جادوئی اثر رکھنے والے

فطری علاج کے ۱۰۰ نسخے

ان کرشماتی قدرتی غذاؤں کا مفید تذکرہ
جو ادویہ کے بغیر انسان کو شفایاب کر ڈالتی ہیں

ڈاکٹر آصف محمود جاہ

اللہ تعالیٰ نے سبزیوں، پھلوں، اناج وغیرہ میں انمول طاقت رکھی ہے۔ اس لیے ان کے استعمال سے مختلف بیماریوں، ان کی علامات اور پیچیدگیوں پر قابو پانا ممکن ہے۔ ذیل میں مختلف سبزیوں اور پھلوں وغیرہ کے استعمال پر مشتمل ۱۰۰ آزمودہ نسخے دیے جا رہے ہیں۔

ایلوپیتھک ڈاکٹر ہونے کے باوجود مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ قدرتی طریقہ علاج بہت کارگر ثابت ہوتا ہے۔ مجھے اس بات کا تجربہ اور مشاہدہ ہے کہ کئی دفعہ جہاں ایلوپیتھک دوائیاں کچھ نہ کر سکیں، قدرتی طریقہ علاج نے جادوئی اثر دکھایا۔ سیکڑوں مریضوں نے ان نسخوں پر عمل کر کے فائدہ اٹھایا۔ ان آزمودہ نسخوں کے لیے طب کی مشہور کتابوں سے استفادہ کیا اور بڑی بوڑھیوں اور بزرگوں سے مشورہ لیا گیا۔ یہ نسخے کو استعمال کرنے کے ساتھ ساتھ بیماری کی مکمل تشخیص اور علاج کے

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

لیے اپنے ڈاکٹر سے ضرور مشورہ کیجیے۔

۱۔ گھیکوار کا گودا صبح شام منہ پر لگانے سے چہرے کے داغ دھبے آہستہ آہستہ دور ہو جاتے ہیں۔

۲۔ پیشاب کی جلن دور کرنے کے لیے پانی زیادہ استعمال کیجیے۔

۳۔ زیادہ پیاس لگے، تو ککڑیاں کھائیے۔ پیاس کی صورت نہ بجھے، تو دودھ کی کچی لسی بنا کر دو تین گلاس پئیں، پیاس ختم ہو جائے گی۔

۴۔ پاؤں کے تلوے جلتے ہوں، تو صبح شام گھیکوار کے گودے سے تلووں کی مالش کریں۔

۵۔ دل کی تیز دھڑکن اور پیٹ میں گیس بننے سے روکنے کی خاطر سونف اور خشک دھنیا ایک ایک چھٹانک صاف کر کے پیس لیں۔ اس آمیزے میں ڈیڑھ چھٹانک شکر ملائیں۔ صبح شام ایک ایک چمچ لیں۔

۶۔ نظر بہتر بنانے کے لیے سات بادام چھیل کر آدھا آدھا چمچ سونف و مصری کے ساتھ روزانہ لیں۔

۷۔ گرمیوں میں آنکھ کی سرخی اور جلن دور کرنے کے لیے پانچ یا سات آملے مٹی کے پیالے میں رات کو بھگو دیں۔ صبح پانی چھان کر اس سے آنکھوں پر چھینٹے ماریں۔

۸۔ بچوں میں پیٹ کے کیڑوں سے نجات کے لیے کمیلہ کا ۳ گرام سفوف صبح شام دیں۔

۹۔ پاؤں کی ایڑیاں پھٹنے اور جلن سے بچانے کے لیے ایک تولہ کچا سہاگا، ایک تولہ پھٹکری، ایک تولہ گندھک لے کر پیس لیں۔ اس میں پٹرولیم جیلی ملا کر رات کو سوتے وقت ایڑیوں پر لگائیں۔ چند دنوں میں افاقہ ہو جائے گا۔

۱۰۔ موٹاپا کم کرنے کے لیے پسی کلونجی آدھا چمچ ایک پانی میں ابال کر صبح نہار منہ اور شام کو لیں۔ ایک گلاس پانی میں کلونجی تیل کے چار پانچ قطرے اور ایک لیموں کا رس ڈال کر صبح شام متواتر ایک ماہ استعمال کرنے سے موٹاپا کم جا سکتا ہے۔

۱۱۔ زکام کے خاتمے کے لیے تھوڑی سی چینی دہکتے ہوئے کوئلوں پر ڈال کر اس کا دھواں سونگھیں۔

۱۲۔ ہرے دھنیے کا پانی نکال کر سونگھنے سے چھینکوں کو کنٹرول کیا جا سکتا ہے۔

۱۳۔ نکسیر کا خون بند کرنے کے لیے بھی ہرے دھنیے کا پانی نکال کر سونگھیں۔

۱۴۔ ناک کی بدبو دور کرنے کے لیے چٹکی بھر پھٹکری تھوڑے سے پانی میں حل کر کے ناک میں ڈالیں۔

۱۵۔ چھوٹے بچوں میں پیشاب کی جلن دور کرنے کے لیے پانی میں پیاز چھیل کر ۶۰ گرام چینی ملا لیں۔ صبح

صاحب مضمون

دنیا میں بعض خوش قسمت انسان صرف دکھی انسانیت کی خدمت کرنے آتے ہیں۔ یہ مرتبہ بلند جسے ملا، وہ دین و دنیا کی دولت پاتا ہے۔ ایسی ہی خوش نصیب ہستیوں میں ڈاکٹر آصف محمود جاہ بھی شامل ہیں۔ وطن عزیز کے طول و عرض میں کہیں بھی قدرتی آفت غریبوں کو نشانہ بنائے، آپ مع ساتھی ان کی مدد کرنے پہنچ جاتے ہیں۔ معالج ہونے کے ناتے ان کا صرف علاج ہی نہیں کرتے بلکہ ضروریات زندگی بھی مہیا کرتے ہیں۔ قلم کار بھی ہیں اور طبی کتب و سفرنامے تحریر کر چکے۔ زیر نظر مضمون آپ کی کتاب ''فیملی ہیلتھ'' سے بصد شکریہ لیا گیا۔

http://www.bookstube.net/

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

شام دو سے تین چمچ یہ آمیزہ پلائیں۔

۱۶۔ بدہضمی اور الٹیاں روکنے کے لیے ۳۰ گرام پیاز، پودینہ کے چند پتے اور سات عدد کالی مرچ اچھی طرح ملا کر کھائیے۔

۱۷۔ صبح شام سلاد کے طور پر پیاز کا استعمال بدہضمی روکتا اور جسمانی طاقت بڑھاتا ہے۔

۱۸۔ بھوک بڑھانے کی خاطر پھلوں کے سرکے میں پیاز اور ادرک کاٹ کر ملائیے۔ پھر پودینے کے پتے، لہسن کے دو چار ٹکڑے اور تھوڑی سی کشمش ملا کر کھانے میں بطور سلاد استعمال کریں۔

۱۹۔ سر کے زخم اور خارش دور کرنے کے لیے نیم کی نمولیاں پیس، پانی میں ملا، گاڑھا لیپ بنا کر رات کو بالوں میں اچھی طرح لگائیں۔

۲۰۔ سردیوں میں ہاتھ پاؤں کی انگلیوں میں سوجن دور کرنے کے لیے گھیا (لوکی) کدوکش کرا کے ہاتھ پاؤں پر اچھی طرح ملیں۔ ایک گھنٹے بعد ہاتھ پاؤں دھو لیں اور پھر پٹرولیم جیلی لگائیں۔

۲۱۔ کھانسی روکنے کے لیے صبح، دوپہر شام ملٹھی منہ میں رکھ کر چوسیں۔

۲۲۔ آنکھوں کی جلن دور کرنے کے لیے ٹھنڈے پانی کے چھینٹے ماریں اور برف سے ٹکور کریں۔

۲۳۔ زخم کی سوجن دور کرنے کے لیے پیاز جلا اس میں ہلدی ملا کر لیپ بنائیے۔ اسے پھر زخم پر لگائیں۔

۲۴۔ دائمی قبض دور کرنے کے لیے صبح شام زیتون کا تیل معتدل مقدار میں استعمال کریں۔

۲۵۔ پیٹ کے جملہ امراض روکنے کے لیے اسپغول کا چھلکا بلاناغہ استعمال کریں۔

۲۶۔ ہچکی روکنے کے لیے دیسی گھی میں سوجی کا حلوہ بنا کر کھائیے۔ یا منہ میں برف کی ڈلی رکھیں یا آہستہ آہستہ گنڈیریاں چوسیں۔

۲۷۔ بچوں کو بخار زیادہ ہو جائے، تو فوراً نہلا دیں یا ٹھنڈے پانی کی پٹیاں کریں۔

۲۸۔ دست اور قے روکنے کے لیے سونف اور پودینہ کا قہوہ بنا کر پیجیے۔

۲۹۔ پاؤں نرم و ملائم کرنے کے لیے سونے سے دس منٹ پہلے پاؤں تازہ پانی میں بھگوئیے۔ اس پانی میں چند قطرے روغن زیتون اور تھوڑا سا نمک ملا لیں۔ خشک کر کے پٹرولیم جیلی یا سرسوں کا تیل لگائیں۔ سردیوں میں نیم گرم پانی استعمال کریں۔

۳۰۔ کولیسٹرول کم کرنے کے لیے ایک ایک چمچ آملہ اور مصری ملا کر روزانہ صبح نہار منہ ایک گلاس پانی کے ساتھ لیں۔

۳۱۔ زہریلا کیڑا کاٹ لینے کی صورت میں لہسن کا تیل اور شہد ملا کر زخم والی جگہ پر لگائیں۔

۳۲۔ بچوں میں پیٹ کے کیڑے ختم کرنے کے لیے کلونجی پانی میں ابال اس کا پانی رات کو سونے سے پہلے پلائیں۔

۳۳۔ جوڑوں کا درد روکنے کے لیے نیم کے پتوں کے تیل کی مالش کریں۔

۳۴۔ کھانسی دور کرنے کے لیے ایک ایک چمچ شہد اور ادرک کا رس ملا کر روزانہ صبح، دوپہر، شام تین سے پانچ روز تک لیں۔

۳۵۔ لہسن جلا سرکے اور شہد میں ملا کر لگانے سے پھوڑے پھنسیاں اور نشان دور ہو جاتے ہیں۔

۳۶۔ ذیابیطس قابو کرنے کے لیے بغیر چھنے آٹے میں تازہ یا پسی میتھی ملا کر روٹی بنائیے اور روزانہ ناشتے میں کھائیں۔ دو سے تین ہفتوں میں شوگر کنٹرول ہو جائے گی۔

۳۷۔ دانت کا درد دور کرنے کے لیے لونگ استعمال کیجیے۔

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

۳۸۔ بلڈ پریشر قابو میں لانے کے لیے آڑو، پھلیاں، لوبیا، مٹر، ناشپاتی اور کیلا زیادہ استعمال کریں۔

۳۹۔ کولیسٹرول کی سطح کم کرنے کے لیے جئی کا آٹا اور گاجر زیادہ کھائیے۔

۴۰۔ سونف کا زیادہ استعمال آنکھوں کی بینائی تیز کرتا ہے۔

۴۱۔ شکر اور سونف ہم وزن لے کر اسے کوٹ لیں۔ سر کے چکر دور کرنے کے لیے صبح شام ایک چمچ پانی کے گلاس میں لے لیں۔

۴۲۔ صبح نہار منہ روزانہ دو سے تین گلاس پانی پئیں، نظام انہضام درست ہو جائے گا۔

۴۳۔ دانتوں کی چمک برقرار رکھنے کے لیے صبح و شام نیم کی مسواک استعمال کریں۔

۴۴۔ برص کے داغ دور کرنے کے لیے خالص شہد ایک چمچ، عرق پیاز ایک چمچ اور نمک آدھا چمچ ملا کر داغوں پر لگائیں۔

۴۵۔ حمل میں گرمی، قے اور سر درد دور کرنے کے لیے آلو بخارہ زیادہ استعمال کریں۔ آلو بخارہ کا شربت بنانے کے لیے پانچ چھے آلو بخارے رات کو پانی کے گلاس میں بھگو دیں۔ صبح تھوڑی سی چینی اور نمک ملا کر آلو بخارے مسل دیں۔ برف ڈال کر استعمال کیجیے۔

۴۶۔ موٹاپا دور کرنے کے لیے اپنی خوراک سے ہر قسم کی چکنائی، مشروبات اور مٹھائیوں کا استعمال بالکل ترک کر دیں۔

۴۷۔ تازہ پھل اور سبزیاں زیادہ سے زیادہ کھائیے۔

۴۸۔ دل کی بیماریوں سے بچنے کے لیے صبح و شام سیر کیجیے اور مرغن غذاؤں سے پرہیز کریں۔

جسم کی چربی پگھلانے کے لیے نہار منہ پانی میں شہد اور چند قطرے لیموں ڈال کر روزانہ لیں۔

۴۹۔ چھینکوں کی بھرمار سے بچنے کے لیے ایک چمچ میتھی دانہ ایک کپ پانی میں ابال لیں۔ ٹھنڈا کر اور چھان کے سونے سے پہلے دو تین ہفتے تک پئیں۔

۵۰۔ ڈکار دور کرنے کے لیے کھانے کے بعد ادرک کے باریک ٹکڑوں پر نمک چھڑک کر آہستہ آہستہ چبا کر کھائیں۔ اس کے علاوہ سالن میں ادرک اور لہسن کا استعمال زیادہ کریں۔

۵۱۔ خون کی کمی دور کرنے کے لیے انار کا رس زیادہ پئیں۔ چقندر کا استعمال بطور سلاد کریں اور سیب بھی خوب کھائیں۔

۵۲۔ ہاتھ یا پاؤں میں پسینا زیادہ آتا ہو، تو پانی میں لیموں کا رس یا سرکہ ملا کر دن میں تین بار اور سونے سے پہلے دھوئیں، افاقہ ہو گا۔

۵۳۔ پیٹ میں ہر وقت گیس رہتی ہو، تو میتھی کے بیج کھائیں۔ گردے اور مثانے کی پتھری نکالنے کے لیے روزانہ نہار منہ پانچ عدد انجیر کھائیں یا پتھر چٹ پودے کے پتے چبائیں۔

۵۴۔ آنکھوں کے گرد حلقے دور کرنے کے لیے صبح سویرے اپنے دائیں ہاتھ کی انگلی بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر رگڑیں اور گرم گرم انگلی آنکھوں کے گرد حلقے پر پھیریئے۔

۵۵۔ جسم کی چربی پگھلانے کے لیے نہار منہ پانی میں شہد اور چند قطرے لیموں ڈال کر روزانہ لیں۔

۵۶۔ مسوڑھوں سے خون بہتا ہو تو جامن کے دو تین پتے دھو کر چبائیے اور آمیزے کو مسوڑھوں پر ملیں۔

۵۷۔ بچوں میں ناک کی نکسیر روکنے کے لیے انھیں ککڑی اور کھیرا کھلائیے۔

۵۸۔ ناخن مضبوط کرنے کے لیے روزانہ چند ہفتے

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

تک ہلکے گرم زیتون کے تیل میں تھوڑی دیر ناخنوں کو ڈبو کر رکھیں۔

۵۹۔ بدہضمی اور بھاری پن سے بچنے کے لیے کھانے کے بعد تھوڑا سا گڑ بطور "سویٹ ڈش" لیں۔

۶۰۔ دانتوں میں خون آنے سے روکنے کے لیے ایک لیموں کا رس، ایک پیالی نیم گرم پانی اور آدھا چمچ نمک ملا کر صبح و شام غرارے کریں۔

۶۱۔ پھنسیوں پر فالسے کے پتے باریک پیس کر لگانے سے وہ ختم ہو جاتی ہیں۔

۶۲۔ قے روکنے کے لیے چھوٹی الائچی یا املی استعمال کریں۔

۶۳۔ چھوٹے بچے نمکول کا پانی نہ پئیں، تو دو چمچ شہد، آدھا چمچ نمک، ایک چمچ چینی اور تین چار قطرے لیموں ڈال کر دو گلاس پانی میں حل کر کے گھریلو نمکول بنا لیں۔ اسہال اور قے کی صورت میں بچوں کو دیجیے۔

۶۴۔ ہاتھ جلنے کی صورت میں متاثرہ جگہ گاجر پیس کر اس کا لیپ لگائیں۔

۶۵۔ بھاپ سے ہاتھ جل جائے، تو متاثرہ جگہ آلو کے ٹکڑے کاٹ کر ملیں۔

۶۶۔ آملہ کا مربا کھانے سے بار بار نکسیر آنا بند ہو جاتی ہے۔

۶۷۔ پیٹ میں شدید درد ہو، تو بڑی الائچی، دارچینی، سونف، پودینہ کا قہوہ بنا کر پئیں۔

۶۸۔ آواز بیٹھ جائے تو نیم گرم پانی میں ہلکا نمک ملا کر غرارے کریں یا ملٹھی چبائیں۔ ادرک کے رس میں شہد ملا کر چاٹنے سے بھی گلا ٹھیک ہو جاتا ہے۔

۶۹۔ انجیر کھانے سے منہ کی بدبو دور ہوتی ہے۔

۷۰۔ ٹیکے کی جگہ سوجنے کی صورت میں برف سے ٹکور کریں۔

۷۱۔ آنکھوں کو طراوت دینے کے لیے کچی گاجروں کا استعمال زیادہ کریں۔

۷۲۔ ہرے دھنیے کا عرق چھالوں پر لگانے سے وہ دور جاتے ہیں۔

۷۳۔ دانتوں میں درد دور کرنے کے لیے لونگ پیس لیموں کے رس میں ملا کر درد والی جگہ پر لگائیں۔

۷۴۔ خراب اور کٹے پھٹے ہونٹ ٹھیک کرنے کے لیے گلاب کا پھول آدھا پیس، اس میں ذرا سا مکھن لگا کر ایک ہفتہ تک ہونٹوں پر لیپ کریں۔

۷۵۔ زخموں میں پیپ آنے سے روکنے کے لیے دو تا تین جاپانی پھل روزانہ کھائیں۔

۷۶۔ جسمانی کمزوری دور کرنے اور وزن میں اضافے کی خاطر روزانہ دودھ کا ملک شیک لیں۔ رات کو گیارہ بادام اور ایک چمچ کشمش آدھی پیالی پانی میں بھگو لیجیے۔ صبح بادام اور کشمش کے دانے کھا کر بچا ہوا پانی پی لیں۔

۷۷۔ لیکوریا اور ٹانگوں میں مستقل درد ختم کرنے کے لیے تین ہفتے تک روزانہ صبح کے وقت سات بادام کھائیے۔

۷۸۔ آپریشن وغیرہ کے زخم اور نشان دور کرنے کے لیے گھیکوار کے گودے میں تھوڑا سا زیتون کا تیل ڈال گرم کر کے روزانہ لگائیں۔

۷۹۔ ہاتھوں میں کھجلی اور خارش روکنے کے لیے گھیا (لوکی) چھیل کر صبح شام اس کا رس ہاتھوں پر اچھی طرح ملیں۔

۸۰۔ دل کی گھبراہٹ دور کرنے اور ہائی بلڈ پریشر روکنے کے لیے ایک پیالی خالص شہد، پھلوں کا سرکہ ایک پیالی اور دیسی لہسن (آٹھ دانے) تینوں اچھی طرح پیس کر آمیزہ فریج میں رکھ دیں۔ ایک ہفتے بعد صبح و شام ایک چمچ لیں۔

۸۱۔ سر کی خشکی دور کرنے کی خاطر چقندر کے پتے ابال

http://www.booksiube.net/

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

کر روزانہ اس پانی سے سر دھوئیں۔

۸۲۔ موسم گرما میں پیشاب کی جلن اور رکاوٹ دور کرنے کے لیے "گرما" استعمال کریں۔

۸۳۔ جلنے کی صورت میں متاثرہ جگہ پر فوری طور پر کسٹر آئل لگائیں۔

۸۴۔ خارش دور کرنے کے لیے ناریل کے تیل میں کافور ملا کر متاثرہ جگہ پر لگائیں۔

۸۵۔ شہد کی مکھی یا بھڑ کے کاٹنے کی صورت میں نمک سرکہ میں ملا متاثرہ جگہ پر لگا کر ڈنگ نکال دیں۔ درد اور سوجن کم ہو جائے گی۔

۸۶۔ آدھے سر کا درد دور کرنے کے لیے لیموں کے چھلکے پیس، اس میں تیل زیتون کا ملا، سر پر لیپ کریں۔

۸۷۔ نیند نہ آتی ہو، تو سونے سے پہلے پاؤں کے تلوؤں پر خالص سرسوں کے تیل کی مالش کریں اور دو چمچ شہد کھائیں۔

۸۸۔ سخت ہاتھوں کو نرم و ملائم رکھنے کے لیے رات کو سونے سے پہلے لیموں کا عرق، گلیسرین میں ملا کر ہاتھوں میں ملیں۔

۸۹۔ منہ کی بدبو دور کرنے کے لیے دن میں دو تین بار سونف چبا کر کھائیے۔

۹۰۔ آواز بیٹھ جائے تو ایک گلاس پانی میں دو چمچ سونف ڈال کر ہلکی آنچ میں پکائیں۔ جب ایک ابال آ جائے، تو پانی ٹھنڈا کر کے پی لیجیے۔ چینی اور دار چینی بھی ڈال لیں۔ اس قہوے کو دن میں دو تین بار استعمال کریں۔

۹۱۔ جسم میں کسی جگہ کانٹا چبھ جائے، تو تھوڑا سا گڑ لے اس میں پیاز کاٹ کر ملائیں اور متاثرہ جگہ باندھ دیں، کانٹا خود بخود نکل آئے گا۔

۹۲۔ پاؤں کے چھالے دور کرنے کے لیے رات سوتے وقت آبلے پر انڈے کی سفیدی لگا لیں۔

۹۳۔ لو لگنے کی صورت میں پیاز کا رس، لیموں اور تھوڑا سا نمک ڈال کر پیجیے۔

۹۴۔ چھوٹے بچوں میں کھانسی ختم کرنے کے لیے تھوڑی سی کالی مرچ، الائچی پیس کر شہد کے آدھے چمچ میں ملا کر صبح و شام دیں۔

۹۵۔ چہرے کی جھریاں دور کرنے کے لیے سو گرام عرق گلاب، ۱۵ گرام روغن بادام اور پندرہ گرام پھٹکری لے کر چار انڈوں کی سفیدی ملا ہلکی آنچ پر پکائیں۔ جب آمیزہ یک جان ہو جائے، تو اتار لیں۔ سوتے وقت اس سے چہرے کی مالش کریں۔

۹۶۔ کیل مہاسے دور کرنے کے لیے انڈے کی سفیدی پھینٹ کر چہرے پر پندرہ بیس منٹ تک لگائیں۔ بعد میں صابن سے منہ دھو کر صاف کر لیں۔

۹۷۔ زکام سے بچنے کے لیے قہوے میں ادرک اور دار چینی ملا کر استعمال کریں۔

۹۸۔ دانتوں کے کیڑے ختم کرنے کے لیے، چنبیلی کے پتے پانی میں اُبال لیں۔ اس میں تھوڑا سا نمک ملا کر غرارے کریں۔

۹۹۔ صبح چاق چوبند اور تروتازہ رہنے کے لیے ایک پیالی گرم دودھ میں ایک چمچ شہد ڈال سونے سے پہلے روزانہ لیں۔

۱۰۰۔ بار بار پیشاب آنے سے روکنے کے لیے سونے سے پہلے اخروٹ کھائیں۔ چھوٹے بچوں کا سوتے میں پیشاب نکل جاتا ہو، تو انھیں سونے سے قبل تل کے لڈو یا باجرے کی کھچڑی کھلائیے۔

پھل و سبزیاں اپنے اپنے موسم میں بیماریوں کا بہترین علاج ہیں۔ ان کا استعمال زیادہ سے زیادہ کریں۔ رات کو بھوک رکھ کر کھانا بھی بیماریوں سے بچنے کا گر ہے۔ رات گئے شادی، بیاہ وغیرہ کے کھانے بھی بیماری بڑھنے کا سبب بنتے ہیں۔ اس لیے بے دریغ کھانے سے پرہیز کریں۔

http://www.bookstube.net/

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

ٹو، وئیر آر یو؟ (تھری ٹو کہاں ہو؟)

''تھری ''ہیں! آئی ایم ان سٹی (ہیں، میں شہر میں ہوں)

''تھری ٹو! گوٹو ائیر پورٹ وئیر پسنجر از ویٹنگ فار یو۔'' (تھری ٹو ہوائی اڈے چلے جاؤ، وہاں سواری تمھارا انتظار کر رہی ہے۔)

''راجر ہیں۔'' (پیغام مل گیا ہیں....)

ریڈیو خاموش ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد ریڈیو سے پھر آواز آئی ''تھری ٹو کہاں ہو؟''

وہ بولا ''ہوائی اڈے کے باہر۔''

ہیں نے اسے انتظار کرنے کا کہا۔ بیس منٹ بعد کچھ مسافر اپنے بھاری بھرکم سامان کے ساتھ باہر نکلے۔

تھری ٹو اپنی خمیدہ کمر اور ہشاش بشاش چہرے کے ساتھ گاڑی سے نکلا، مسافروں کا سامان ڈکی میں رکھا اور اپنی منزل کی طرف چل پڑا۔ سواریاں اتاریں، پاؤنڈ لیے، ہیں کو ''کلیئر'' (یعنی سواریاں اتر گئی ہیں اور وہ پھر سے دستیاب ہے) کا پیغام دیا اور ایک درخت کے نیچے گاڑی کھڑی کر اگلے پیغام کا انتظار کرنے لگا۔

اس نے گاڑی کی نشست پیچھے کی اور ریڈیو لگا لیا۔ مقامی اردو ریڈیو اسٹیشن پر میڈم نور جہاں کا گانا لگا تھا۔ تھری ٹو گانا سنتے سنتے سو گیا۔ اچانک، اس کا موبائل بجا، تو وہ جاگ گیا۔ فون پر نائن سیون تھا۔ اس نے کام کی صورت حال پوچھی۔ تھری ٹو نے بتایا کہ آج کام اتنا تیز نہیں۔

نائن سیون نے بتایا کہ وہ دور کی سواری اٹھانے

خاموشی کی دنیا میں جانے والا

تھری ٹو نہیں بولے گا

اس محنتی پاکستانی کا قصہ الم جو ساری زندگی دوسروں کی تمناؤں کا بار اپنے کاندھوں پہ اٹھائے گھومتا رہا

انوار ایوب راجا

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

ریلوے اسٹیشن جا رہا ہے۔ واپسی پر "کشمیر کباب ہاؤس" میں ایک تقریب میں جائے گا جہاں کسی سیاست دان کو آئندہ کی حکمت عملی پر بات کرنی ہے۔ مظلوم کشمیریوں کی مدد کے لیے ہر سال کی طرح کچھ چندہ بھی جمع کیا جائے گا۔ تھری ٹو نے نائن سیون کو بتایا کہ آج وہ تقریب میں نہیں آپائے گا کیونکہ کل اس نے اپنے گھر کی قسط جمع کرانی ہے۔ آج رات ایک بجے تک ڈبل شفٹ کرے گا۔

نائن سیون نے اسے یاد کرایا کہ اس کا گاؤں میں مقدمہ چل رہا ہے۔ اس میں مدد کے لیے ضروری ہے کہ وہ تھوڑی دیر کو آئے، وزیر صاحب کا بیان سنے، بیس یا پچاس پاؤنڈ کا چندا دے اور واپس کام پر چلا جائے۔ آخر وزیر موصوف ان کی برادری سے ہیں۔ انھیں پتا ہونا چاہیے کہ وہ یہاں برطانیہ میں تنہا نہیں۔

تھری ٹو تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔ ایک وقفے کے بعد اس نے نائن سیون سے کشمیر کباب ہاؤس میں ملنے کا وعدہ کیا اور فون کاٹ دیا۔ تھری ٹو نے پھر ریڈیو چلایا اور آنکھیں بند کیے تھوڑا سستانے کی کوشش کرنے لگا۔ تبھی بیس سے پھر پیغام آیا: "تھری ٹو کہاں ہو؟"

"بیس! میں اسٹیشن پر ہوں۔"

"تھری ٹو، سینٹرل یونیورسٹی چلے جاؤ۔ سواری تمھارا انتظار کر رہی ہے۔ دو جگہ سواریاں اتارنی ہیں۔"

"راجر بیس۔"

تھری ٹو نے گاڑی چلائی اور سیدھا یونیورسٹی پہنچ گیا۔ وہاں سے دو پروفیسروں کو بٹھایا اور گھروں کے سامنے اتارا۔ پیسے لیے اور بیس کو کلیئر کا سگنل دے کر جامع مسجد میں نماز ظہر پڑھنے چلا گیا۔ اس نے صرف فرض پڑھے اور واپس گاڑی میں بیٹھ گیا۔ تھری ٹو نے موبائل دیکھا، تو اس پر بیوی کی مس کال تھی۔ گھر کے نمبر پر کال کی گئی۔

بیوی نے فون اٹھایا اور یاد کرایا کہ ماموں برکت کے بیٹے کی شادی ہے۔ انھوں نے وہاں اگلے ہفتے جانا ہے۔ اس لیے وہ اگلے ہفتے دو سو پاؤنڈ کا بندوبست کر لے۔ کیونکہ جب تھری ٹو کی بیٹی کی شادی ہوئی تھی، تو ماموں برکت کی بیوی نے ایک جوڑا، پانچ کلو انبالہ کی مٹھائی اور سو پاؤنڈ نقد دلھن کو دیے تھے۔ اس لیے ضروری ہے کہ وہ دو جوڑے، چھے کلو مٹھائی اور ایک سو بیس پاؤنڈ دیں۔

وہ خاموش ہو گیا...... وقفے کے بعد بولا "میں کوشش کروں گا۔" فون کٹ گیا۔ تھری ٹو نے گاڑی چلائی اور ریلوے اسٹیشن چلا گیا۔ وہاں اس کی ملاقات ٹو ون سے ہوئی۔ اس نے بتایا "کونسل نے ایک نیا قانون نکالا ہے، وہ تمام گاڑیاں جو پانچ سال پرانی ہیں، انھیں دوبارہ فٹنس سرٹیفکیٹ لینا ہو گا۔ اگر کوئی ڈرائیور سرٹیفکیٹ کے بغیر پکڑا گیا، تو اسے سزا کے طور پر اپنا ٹیکسی بیج کونسل میں جمع کرانا ہو گا اور وہ کام نہیں کر پائے گا۔"

یہ سن کر تھری ٹو پریشان ہو گیا کیونکہ اس نے اپنی عمر کی طرح کبھی ٹیکسی کے شب و روز کا بھی حساب نہیں رکھا تھا۔ اسے یاد آیا، دو ماہ پہلے ایک مکینک نے بتایا تھا کہ گاڑی کے انجن سے تیل ٹپکتا ہے۔ ممکن ہے کہ کسی بڑی خرابی کی صورت اسے انجن بدلنا پڑے۔ مکینک کے مطابق یہ آٹھ سو پاؤنڈ کا خرچہ تھا جس کے لیے وہ تیار رہے۔

تھری ٹو پھر خاموش ہو گیا۔ کچھ دیر سوچوں میں گم رہا۔ پھر اپنی جیب سے چھوٹی سی ڈائری نکالی اور کچھ جمع تفریق میں لگ گیا۔ اتنے میں ایک انگریز خاتون اسٹیشن سے باہر نکلی اور بولی "کیا تم دستیاب ہو؟"

اس نے جواب دیا "جی میڈم، آپ کہاں جانا پسند کریں گی؟"

انگریز خاتون نے کہا "واٹر فرنٹ۔" تھری ٹو نے

http://www.bookstube.net/

www.pdfbooksfree.pk

خاتون کا بیگ گاڑی میں رکھا اور سواری کو منزل کی طرف لیے روانہ ہو گیا۔ جب وہ منزل پر پہنچا، تو کرایہ لیا۔ انگریز نے تھری ٹو کو تین پاؤنڈ ٹپ بھی دی۔ اس نے شکریہ ادا کیا، گاڑی میں بیٹھا اور واپس اسٹیشن کی طرف چل دیا۔

ابھی وہ شہر کی بڑی شاہراہ پر نہیں پہنچا تھا کہ اس کا موبائل فون پھر بجا۔ اب اس کا بیٹا تھا۔ بیٹے نے باپ کو بتایا کہ وہ ٹیکسی ٹوکن کے بغیر گاڑی چلاتے ہوئے پکڑا گیا ہے۔ پولیس نے اسے گاڑی سمیت بند کر دیا۔ اب اس کا انٹرویو ہو چکا۔ پولیس اسے رہا کرنے پر تیار ہے، اگر کوئی اس کی گاڑی کا روڈ ٹیکس ڈاک خانے سے خرید کر کمپاؤنڈ جائے، اضافی نوے پاؤنڈ کا جرمانہ ادا کرے اور گاڑی کے کاغذات اور رسید کے ساتھ اگلے دو گھنٹے میں پولیس اسٹیشن آئے۔

بیٹے نے تھری ٹو کو بتایا کہ ایک دوست نے روڈ ٹیکس خرید لیا ہے، مگر اس کے پاس نوے پاؤنڈ نہیں۔ اس نے تھری ٹو سے گزارش کی کہ وہ کمپاؤنڈ کے دروازے پر دوست کو پیسے پہنچا دے۔ تھری ٹو نے گاڑی کا رخ کمپاؤنڈ کی طرف کر دیا۔ کمپاؤنڈ پہنچا۔ پیسے اس نوجوان کو دیے جس نے رسید حاصل کرنی تھی اور واپس گاڑی میں بیٹھ گیا۔

تھری ٹو کے چہرے پہ تکان اور پریشانی، دونوں کے ملے جلے تاثرات نمایاں تھے۔ وہ سیدھا پولیس اسٹیشن پہنچا۔ پیچھے ہی بیٹے کا دوست آیا۔ پولیس افسر نے معمولی پڑتال کے بعد اس کے نوجوان بیٹے کو چھوڑ دیا۔ تھری ٹو کچھ نہ بولا بس خاموشی سے بیٹے کو گھورتا رہا۔ اتنے میں بیوی کا فون آیا۔ بولی ”بیٹا نوجوان ہے۔ اس سے غلطی ہوئی ہے۔ اگر تم نے اسے کچھ کہا، تو وہ گھر چھوڑ کر چلا جائے گا۔ برادری میں ناک کٹ جائے گی۔“

تھری ٹو کو پڑوسی اسلم کا قصہ یاد آ گیا۔ اس کا بیٹا باپ کے ڈانٹنے پر گھر سے چلا گیا تھا۔ ساری برادری میں اس کی بہت بدنامی ہوئی تھی۔ تھری ٹو نے بیٹے کا رشتہ بڑے بھائی کی بیٹی سے گاؤں میں کر رکھا تھا۔ اس لیے مناسب یہی تھا کہ وہ خاموش رہتا۔ وہ خاموشی سے گاڑی میں بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد اس نے گاڑی ایک ویران علاقے میں کھڑی کر دی۔

پانچ منٹ بعد بیس سے پیغام آیا کہ ایک پب سے سواریاں اٹھانی ہیں۔ تھری ٹو پب پہنچا۔ کچھ منچلے نوجوان انتظار کر رہے تھے۔ اس نے انھیں اٹھایا۔ وہ نشے میں تھے۔ انھوں نے اس کے ساتھ بدتمیزی کی، مگر تھری ٹو خاموشی سے گاڑی چلاتا رہا۔ شام ہونے کو تھی۔ نماز عصر بھی قضا ہو گئی۔ اس نے ان منچلوں کو منزل پر اتارا۔ پچھلی نشست سے شراب کے خالی ڈبے نکالے۔ ایک لفافے میں ڈال انھیں کوڑے کے ڈبے میں پھینک گاڑی میں بیٹھ گیا۔

وہ تھک چکا تھا۔ مغرب ہونے میں ابھی آدھ گھنٹا باقی تھا۔ اس نے گاڑی کا شیشہ نیچے کیا اور بوتل سے پانی کے چند گھونٹ پینے کے بعد آنکھیں بند کر لیں...... ہر طرف خاموشی تھی...... انتہائی ڈرا دینے والی خاموشی...... کبھی کبھی سڑک سے کوئی گاڑی گزرتی، تو تھوڑا شور ہوتا پھر خاموشی طاری ہو جاتی۔

بیس سے پیغام آیا: ”تھری ٹو، ویئر آر یو“ (تھری ٹو کہاں ہو؟)

اس کی طرف سے کوئی جواب نہ دیا گیا، تو پھر آپریٹر نے پوچھا ”تھری ٹو کہاں ہو؟“

تھری ٹو نے بیس کو کوئی جواب نہیں دیا۔ بیس نے تین چار بار پوچھا، اس جانب خاموشی طاری رہی۔ اب آپریٹر کو کچھ تشویش ہوئی۔ اس نے تھری ٹو کی سیٹلائٹ سسٹم پر

http://www.bookstube.net/

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

جگہ ڈھونڈی، علاقے میں موجود ٹیکسی ڈرائیوروں کو بتائی اور پتا کرنے کو کہا۔ اس علاقے میں دو ٹیکسی ڈرائیور موجود تھے۔ وہ فوراً وہاں پہنچے۔ انھوں نے گاڑی کا دروازہ کھولا، تو دیکھا کہ تھری ٹو کا جسم مکمل طور پر ٹھنڈا ہو چکا۔ اس کی گود میں انجائنا کا سپرے پڑا تھا وہ بے ہوش اور دنیا کے شور شرابے سے بےخبر خاموشی کی چادر میں چھپا ہوا تھا۔

انھوں نے اسے جگانے کی کوشش کی، مگر تھری ٹو نے کوئی جواب نہیں دیا۔ لگتا تھا وہ بہت تھک چکا اور اب سونا چاہتا ہے۔ انھوں نے بیس کو خبر دی۔ بیس نے ہنگامی نمبر پر اس جگہ ایمبولینس بھجوائی، پیرامیڈیکس نے تھری ٹو کو سٹریچر پر ڈالا اور اسے اسپتال لے گئے۔ جیسے ہی ایمبولینس اسپتال پہنچی، پیرامیڈیکس نے اسے انتہائی نگہداشت کے شعبے میں منتقل کیا۔ ڈاکٹر آیا، نبض پہ ہاتھ رکھا، دھڑکن کو محسوس کیا اور تھری ٹو کا چہرہ ڈھانپتے ہوئے نرس سے کہا کہ اس کے ورثا کو اطلاع دی جائے۔

اس وقت اسپتال میں بہت سے مریض زیرعلاج تھے..... مگر جہاں تھری ٹو لیٹا تھا وہاں مکمل خاموشی تھی..... وہ اکیلا تھا مگر خاموشی اس کے ساتھ تھی۔ بیوی کچھ دیر میں روتی بلبلاتی اسپتال پہنچی اور زور زور سے شوہر کو جگانے لگی۔ نرس نے اسے سہارا دیا اور بتایا کہ تھری ٹو اب نہیں جاگے گا کیونکہ وہ ہمیشہ کی نیند سو چکا۔ عشا کی اذانیں بلند ہو رہی تھیں۔ وہ خاموش تھا۔ بیٹی اور بیٹا باہر کھڑے رو رہے تھے۔ سب ماتم میں ڈوبے تھے۔ چہروں پر سوگ تھا.....

نرس جب تھری ٹو کا لاشا پوسٹ مارٹم کرانے لے جا رہی تھی، تو اس کی چھوٹی سی ڈائری جیب سے گر گئی جس پر وہ حساب کرتا تھا۔ اس نے وہ ڈائری تھری ٹو کی بیوی کو دی۔ بیوی نے کھولی، تو اس میں تھری ٹو کا آخری نوٹ درج تھا: ''مکان کی قسط، پاکستان میں زمین کے مقدمے کی فیس اور دیگر اخراجات کے بعد گاڑی ٹھیک کرانی ہے۔ لہٰذا اس مہینے وہ ڈبل شفٹ کرے گا۔''

تھری ٹو مر گیا..... بیس سے پیغام بھی نہیں آیا کہ تھری ٹو راجر بیس'' کا جواب دینے والا نہیں رہا۔ کسی شادی اور مقدمے کے خرچے کی مانگ نہیں رہی۔ بس خاموشی تھی، وہی ڈرا دینے والی خاموشی جو تھری ٹو کو کبھی نصیب نہ ہو سکی۔ میڈم نور جہاں کے نغموں کی آواز بھی نہیں رہی اور نہ ہی کسی کو وزیر کے جلسے میں جانے کی جلدی تھی۔

مگر اس رات کشمیر کباب ہاؤس میں تقریب منعقد ہوئی، سیاسی بیان بازی اور چندہ بھی جمع ہوا۔ سب آئے مگر تھری ٹو نہیں آیا..... آتا بھی کیسے، وہ تو دوسروں کی خواہشات پوری کرتے کرتے قربان ہو چکا تھا۔ ہفتے بعد وہ شادی بھی ہوئی جس میں ایک سو بیس پاؤنڈ پہنچائے جانے تھے۔ تھری ٹو کی بیوی نہیں گئی، مگر اس نے پاؤنڈ بھجوا دیے کیونکہ یہ برادری میں عزت کا سوال تھا۔

انشورنس کمپنی نے تھری ٹو کے ڈیتھ سرٹیفکیٹ کا اجرا ہوتے ہی تین ہفتے بعد اس کے مکان کا سارا قرض ادا کر دیا۔ سال بعد بیٹے کی شادی پاکستان میں ہوئی اور دلھن ولایت آ گئی۔ تھری ٹو کی ٹیکسی بیٹے نے بیچ دی۔ زندگی آگے چلتی رہی اور سب اسے بھول گئے۔

تھری ٹو کی یہ کہانی کسی ایک شخص کی کہانی نہیں بلکہ پچھلی آدھ صدی میں جنم لینے والے ایسے ہزارہا انسانوں کی داستان ہے جو ایک دن ایسے ہی خاموشی کی چادر اوڑھے مٹی میں دفن ہو گئے۔ کشمیر آزاد ہوا نہ انبالہ کی مٹھائی کے وزن میں کمی آئی اور نہ ہی گاؤں کے مقدمے ختم ہوئے، ختم ہوا تو بس ایک نمبر..... تھری ٹو جواب کسی کی کال پر نہیں بولے گا۔

◆●●

http://www.bookstube.net/

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

پیناّ کی تمنا ہے، ہیرا مل جائے

پریم دیوانی

وہ زندگی کو ٹوٹ کر چاہتی تھی مگر زمانے کے نشتر نے اُسے ایسے گھاؤ لگائے کہ وہ جیتے جی لاش بن گئی

نیلم احمد بشیر

میرے صدر دروازے پہ جب گھنٹی بجے، تو میں فوراً دروازہ نہیں کھولتی۔ پہلے آواز دے کر پوچھتی ہوں "کون؟" آنے والا جواب دے، تو مجھے پتا چل جاتا ہے کہ کون آیا ہے۔ مجھے اس کے لیے دروازہ کھولنا ہے یا نہیں؟ کبھی کبھار گھنٹی بجنے کے بعد مسلسل آوازیں دینے کے باوجود کوئی جواب نہیں آتا اور خاموشی رہتی ہے۔ اس پر میں لمحہ بھر کو توقف کرتی اور پھر اٹھ کھڑی ہوتی ہوں۔ جواب نہ آنے کے باوجود میں جان جاتی ہوں کہ کون آیا ہے؟

ایک پل کو مجھے تھوڑی سی خوشی ہوتی اور پھر گھبراہٹ بھی شروع ہو جاتی۔ تب کوفت سی محسوس ہوتی کیونکہ اس کے آنے سے میں رنج میں مبتلا ہو جاتی ہوں۔ میں نپے تلے قدموں سے جا کر دروازہ کھول دیتی۔ زمین پر ایک کونے میں میلے کچیلے کپڑوں کی ایک گٹھڑی سی پڑی ہوتی۔ اس گٹھڑی کے آبنوسی پرکشش چہرے میں جڑی دو سیاہ آنکھیں میری طرف دیکھتیں اور یوں چمکنے لگتیں جیسے کسی نے ان میں چاند ستارے کوٹ کر بھر دیے ہوں۔

"ہاں عظمیٰ تو آ گئی؟ کیا حال ہے تیرا۔" میں ظاہری طور پر اس کے ساتھ شفقت سے پیش آتی۔ اسے اندر آنے کا اشارہ کرتی، تو وہ اپنے مفلوج وجود کو دھیرے دھیرے گھسیٹتی کسی کیڑے کی طرح سرکتی رینگتی میرے گیراج میں بنی سیڑھی کی طرف بڑھتی اور پھر اس تک پہنچنے کے بعد ہانپنے لگ جاتی۔ میں اس کو تسلی سے بیٹھنے کا کہتی۔ شدید گرمی میں اتنی دور سے چل کر آتی ہے، یہ سوچ کر اندر جاتی اور بھاگ کر اس کے لیے ٹھنڈا پانی لاتی۔

وہ بڑی مشکل سے گلاس ہاتھوں میں تھامتی اور پانی

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

کا گھونٹ بھرتی مگر ساتھ ہی اسے اچھو لگ جاتا۔ وہ کھانستے کھانستے بے حال ہو جاتی۔ ایسا لگتا جیسے بے ہوش ہو جائے گی۔ مگر پھر وہ دھیرے دھیرے سنبھلنے لگتی۔ میں اتنے میں بھاگ کر اس کے لیے کھانا لے آتی۔ وہ پلیٹ تھام کر کھانے کی کوشش کرتی، مگر نوالہ منہ میں ڈالتے ہی کھانا حلق میں پھنسنے لگتا۔ میں اس کے ہاتھوں سے پلیٹ لے جلدی سے کھانا پلاسٹک کے لفافے میں ڈال کر کہتی "گھر جا کر کھا لینا۔"

وہ اس تمام عرصے میں میری طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھتی رہتی۔ میں اسے گھر کے اندر آنے کا نہیں کہتی کیونکہ وہ بہت گندی ہوتی۔ اس کے منہ سے رالیں گرتیں۔ وہ نہ کچھ بول سکتی اور نہ سن سکتی ہے۔ میں پھر بھاگ کے اندر جاتی۔ اس کے لیے کپڑے، جوتے، چادریں، تولیے، غرض کام کی ہر شے ایک بڑے سے تھیلے میں بھرتی اور اسے یوں تھما دیتی جیسے اپنے کسی احساس جرم کو مٹانے کی کوشش کرنا میرا مقصود ہو۔ حالانکہ میں نے کچھ بھی نہیں کیا..... عظمیٰ ہی اپنے جرم کی ذمے دار ہے اور وہی سزاوار!

یہ سب کرنے کے بعد بھی وہ میرا منہ تکے جاتی، تو مجھے پتا چل جاتا کہ وہ کیا چاہتی ہے۔ میں اسے ہزار روپے کا نوٹ تھماتی تو وہ اسے کس کے مٹھی میں جکڑ لیتی اور پھر بھیں بھیں کر زور زور سے رونے لگتی۔ میرا بھی دل پانی ہونے لگتا۔ مگر جی چاہتا کہ بس اب وہ میرے دروازے سے چلی جائے اور پھر نظر نہ آئے۔ مجھے اس کی خبر تک نہ ملے۔ میں اسے کبھی نہ دیکھوں۔

وہ اپنے ٹیڑھے میڑھے پاؤں مروڑتی اٹھتی، پھر دھیرے دھیرے سارا مال متاع سنبھال باہر جانے لگتی۔ میری نظر بلا ارادہ ہر دفعہ دروازے کے جنگلے پر لگے سبز

مصنّفہ سے ملیے

ادیب والد، احمد بشیر کی سب سے بڑی صاحبزادی ہونے کے ناتے نیلم احمد بشیر کا افسانہ نگاری و شاعری کی طرف آنا انہونی بات نہیں۔ آپ کئی برس سے ادب کے میدان میں اپنے جوہر قلم دکھلا رہی ہیں۔ حقیقت نگاری آپ کی تحریروں کا وصف ہے۔ شر کے بجائے خیر ابھارنے کو ترجیح دیتی ہیں۔ افسانہ "پریم دیوانی" آپ نے بطور خاص اردو ڈائجسٹ کے لیے بھجوایا ہے۔

نائیلون سے بنے ترپال پہ جا ٹکتی۔ پانچ سال قبل جب میں اپنے اس گھر میں آئی تھی، تو نوکیلے بلموں جیسے تیر کی شکل کے آہنی جنگلے پر یہ ترپال عظمیٰ ہی نے لگائی تھی۔ تب وہ ایسی تھوڑا تھی، بندر کی سی پھرتی کے ساتھ اس نے جنگلے کے سوراخوں پہ قدم جمائے اور ترپال تان دی۔ یوں کہ میرے گھر کے اندر سایہ رہے اور دروازے کی درزوں سے اندر کچھ نظر بھی نہ آتے۔

وہ میری نئی ملازمہ تھی، مگر اس سترہ اٹھارہ سالہ دبلی پتلی، تیز طراز، شوخ و شنگ لڑکی نے اپنے خلوص، محبت اور کام سے لگن کے باعث میرے دل اور گھر میں یوں جگہ بنا لی جیسے وہ ملازمہ نہیں میری بیٹی ہو۔ ہر وقت اچھلتی کودتی ناچتی گاتی، پھرکی کی طرح گھومتی اور خوشی خوشی ہر کام کے لیے رضامند رہتی، دیکھنے والے کہتے، میں نے اسے کافی سر چڑھا رکھا ہے۔

وہ جو چاہے کھاتی پیتی، میں اس کی کھانے پینے کی کسی

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

فرمائش رد نہ کرتی۔ کبھی کہتی ''باجی آج چاول کھانے کو جی چاہ رہا ہے۔'' میں کہتی، چل پکا لے۔ کبھی کہتی ''باجی بڑے دنوں سے بھنڈی نہیں کھائی۔'' میں اگلے روز بازار سے بھنڈی لیتی آتی۔ اس کی طبیعت بگولے کے مانند تھی، کبھی ٹک کے ایک جگہ نہ بیٹھتی۔ میں اسے اس بات پہ سرزنش ضرور کرتی کیونکہ مجھے پتا تھا، وہ دل کی مریضہ ہے۔ اس کے دل کی اوپن ہارٹ سرجری بھی ہو چکی تھی جس کا چیرا وہ اکثر فخریہ طور پر مجھے دکھا کر ہنس دیا کرتی۔ اسے ادویہ بھی پابندی سے لینا ہوتی۔ اسی لیے اسے رقم کی بھی ضرورت رہتی، مگر عظمیٰ کو کسی بات کی کوئی فکر ہی نہ تھی۔

اس کے لیے ہر بات بے معنی تھی، بس جینا اہم تھا اور جینے سے زیادہ محبت کرنا۔ اس کا کوئی نہ کوئی چاہنے والا ضرور ہوتا جس کا نام وہ مزے سے لیتی، مجھے اس کے بارے میں بتاتی اور ڈانٹ بھی کھاتی۔ اسے پرانے گانے بہت پسند تھے۔ اکثر اپنے ہاتھوں میں کیسٹ تھامے آتی جو ظاہر ہے اس کے کسی عاشق ہی نے دی ہوتی۔ جھٹ سے میرے کیسٹ پلیئر میں جڑ کر بٹن دبا دیتی۔ گانوں کی آواز کے ساتھ ہی جھوم جھوم کر سر ہلانے لگتی اور فٹافٹ سارے گھر کا کام نپٹا دیتی۔ کہتی تھی ''باجی گانے لگے ہوں، تو وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلتا اور منٹوں میں سارا کام ہو جاتا ہے۔'' اس کی منطق سے ایسے مجھے بھی کافی حد تک اتفاق تھا۔

ایک گانا اسے بے حد پسند تھا جسے وہ بار بار چلاتی اور ساتھ ساتھ خود بھی آواز ملا کر گاتی۔ دیو آنند اور زینت امان کی پرانی فلم ''ہیرا پنا'' کا یہ گانا اکثر میرے گھر میں بجتا سنائی دیتا: ''پنا کی تمنا ہے کہ ہیرا اسے مل جائے۔ چاہے میری جان جائے، چاہے میرا دل جائے۔''

گانا ختم ہوتا، تو اس پر اپنا فصیح و بلیغ تبصرہ کرنے سے بھی باز نہ آتی۔ کہتی ''باجی زندگی میں انسان کو ایک نہ ایک ہیرا تو ضرور ملنا چاہیے۔ اور آپ دیکھنا میں اپنا ہیرا ڈھونڈ کر رہوں گی۔'' تب میں ہونقوں کی طرح اس کا منہ دیکھنے لگتی اور سوچتی، کیا اس کا فلسفہ حیات درست ہے یا مجھ جیسے ڈرپوک مڈل کلاسیوں کا؟ کہ بس جیسی تیسی زندگی ہے، گزرتے چلے جاؤ...... اس کے حقائق زندگی بہتے پانی کی طرح شفاف تھے اور میں مصلحتوں، منافقتوں کے کیچڑ میں پاؤں دھنسائے دلدل میں کھڑی تھی۔

اس کے حقائق زندگی بہتے پانی کی طرح شفاف تھے اور میں مصلحتوں، منافقتوں کے کیچڑ میں پاؤں دھنسائے دلدل میں کھڑی تھی۔

شہزاد نامی لڑکا اسے دل و جان سے پسند تھا۔ اس کا فون آنے پر وہ جھوم جھوم جاتی، قہقہے چشموں کے میٹھے بلبلوں کی طرح ابلتے اور باہر جا کر آوارہ گردی کے پروگرام بننے لگتے۔

شہزاد کے پاس موٹر سائیکل تھی جس کی پچھلی نشست پر بیٹھی اکثر مجھے نظر آتی۔ میں پل بھر کو حیران ہو جاتی۔ اس کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا ہوتا۔ منہ میں آئسکریم ہوتی۔ وہ مجھے فخریہ انداز میں ٹاٹا کرتی گزر جاتی۔ کبھی کبھی میں پوچھتی ''عظمیٰ، تو کیا چیز ہے؟ تجھے اپنے گھر والوں سے بالکل ڈر نہیں لگتا؟'' میرا اشارہ اس کے بڑے بڑے غنڈے نما بھائیوں کی طرف ہوتا۔

''باجی میں چیز بڑی ہوں مست مست۔'' وہ قہقہہ لگا کر کہتی۔ ''اپنے بھائیوں سے کئی بار پٹ چکی، مگر مجھے بتائیں، اس میں حرج ہی کیا ہے؟ میں اور شہزاد بس ریس کورس پارک جا کر بیٹھتے ہی تو ہیں۔'' وہ بڑے آرام سے صفائی پیش کرتی۔

http://www.bookstube.net

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

''کمال کی لڑکی ہے۔'' میں دل ہی دل میں اس کی بہادری پہ رشک کرتی۔ نہ کوئی ڈر نہ خوف، کیا دھڑلے سے اپنی مرضی کی زندگی جی رہی تھی، کسی احساس جرم کے بغیر اپنے سچ اور جذبوں کی طاقت کے ساتھ۔ ایک ہم چار جماعتیں پڑھے مڈل کلاسیے ہیں۔ خوف سے کوڑھی بن کر رہ جاتے ہیں کہ کہیں یہ نہ ہو جائے، کہیں وہ نہ ہو جائے۔

اصل زندگی تو عظمیٰ جی رہی تھی، اپنے طریقے اور خواہش سے۔ بھنورا زندگی کے پھول سے رس کا ہر قطرہ پی جانا چاہتا تھا۔ اس کی آوارگی میں کوئی کمی نہیں آئی بلکہ نئے عاشق بنانے لگی۔ مگر وہ بڑی جلد اکتا جاتی تھی۔ اسے ہر وقت کوئی تھرل، کوئی ایکشن درکار تھا۔ اس کے لیے زندگی رنگین و دلچسپ فلم تھی جس کے ہر سین میں وہ خود کو سمونا چاہتی تھی۔

> اسے ہروقت کوئی سنسنی خیز لمحہ، کوئی ایکشن درکار تھا۔ اس کے لیے زندگی رنگین و دلچسپ فلم تھی جس کے ہر سین میں وہ خود کو سمونا چاہتی تھی۔

ایک بار اس کی ماں میرے پاس آئی۔ روتی پیٹتی کہنے لگی ''اسے سمجھائیں، یہ ہماری ناک کٹوا رہی ہے۔ باپ نے اس کی وجہ سے مجھے کئی بار مارا ہے، طعنے دیے ہیں۔'' میں نے عظمیٰ کو احساس دلانے کی کوشش کی مگر وہ بے نیازی سے سنتی، مسکراتی رہی۔ لگتا تھا اس پر کسی بات کا کوئی اثر ہی نہیں ہوتا۔

ایک روز عظمیٰ کو کسی لڑکے سے سچ مچ کی محبت ہوگئی۔ اب وہ اس سے شادی کرنا چاہتی تھی مگر درمیان میں ظالم سماج نے آنا ہی تھا۔ عظمیٰ کی ماں اس رشتے پر رضامند نہیں تھی کیونکہ لڑکا نکھٹو تھا۔ نکھٹو کی ماں کو اعتراض تھا کہ لڑکی دل کی مریضہ ہے۔ گھر کا خیال نہیں رکھ سکتی اور نہ ہی بچہ پیدا کر سکے گی۔ سب پریشان تھے مگر عظمیٰ خوش تھی۔ دونوں نے اپنے اپنے گھر الٹی میٹم دے دیا کہ اگر ان کی شادی نہیں ہوئی، تو وہ بھاگ جائیں گے۔ ڈر کے مارے گھر والوں کو ہاں کرنی ہی پڑی۔ عظمیٰ خوشی سے پھولی نہ سمائی۔

شادی سے ایک روز قبل عظمیٰ میرے پاس آئی۔ اسے شادی کا جوڑا، جوتی، زیور درکار تھا جو اسے کہیں سے دستیاب نہ ہو سکا۔ چار و چار میں نے اسے ساتھ لیا اور بازار روانہ ہوگئی۔ راستے میں اسے خوب ڈانٹا اور کوسا کہ یہ کیسا خاوند اور سسرال ہے جو تجھے شادی کا جوڑا، زیور بھی خرید کے نہیں دے سکتے۔

''بس باجی مجھے پیار ہوگیا ہے۔'' اس نے ہولے سے کہا تو میں لاجواب ہوگئی۔ سرخ ریشمی جوڑا، پراندہ، چپل، بٹوہ اور نقلی طلائی زیورات لیے جب وہ گھر جارہی تھی تو اس کی خوشی دیدنی تھی۔ بعد میں اس نے مجھے بتایا کہ وہ جوڑا اس نے کئی دن نہیں اتارا۔ ادھر میں سوچتی رہی، کیا یہ سچ ہے کہ لال عروسی جوڑا، زیور اور محبت کا سراب کبھی کبھار واقعی کسی لڑکی کی زندگی کی معراج اور منزل بن جاتے ہیں؟ وہ ایک پل ہی سہی، خود کو خوابوں کی سرزمین کی شہزادی سمجھ کر اڑی اڑی پھرتی ہے۔ چیزوں کا لفافہ تھام کر جب وہ رخصت ہوئی تو اس کی کالی سیاہ آنکھوں میں چمکتے جگنو مجھے رشک میں مبتلا کر رہے تھے...... ہر پنا کی تمنا ہوتی ہے کہ اسے اس کا ہیرا مل جائے! عظمیٰ کو میں نے اپنی دعائیں اور تھپکی دے کر رخصت کر دیا۔

کئی مہینے گزر گئے۔ وہ مجھے نہ ملنے آئی، نہ دکھائی دی۔ اس نے بتایا تھا کہ سسرال کافی دور ہے۔ سوچا، آنے جانے میں دقت کے باعث ملنے نہ آسکی، تو کوئی بات نہیں۔ ہاں البتہ مجھے اس کے تازہ بتازہ عشق محبت کے قصے سننے کو نہ ملتے جن سے میں خود زندگی کے بہت سے انمول سبق حاصل کرتی۔

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

ایک روز دروازے پہ گھنٹی بجی۔ کھول کر دیکھا، تو وہ میرے سامنے کھڑی تھی۔ کیا یہ عظمیٰ ہی تھی؟ اسے دیکھ کر میں بھونچکی رہ گئی۔ پچکے ہوئے گال، مٹی سے اٹے بال، میلے پھٹے پرانے کپڑے، ٹوٹی ہوئی چپل پہنے، پیٹ دوپٹے سے چھپاتی لڑکی تو کسی موری کا کیڑا لگی جو اندھیروں سے باہر کی دنیا میں نکل آیا تھا۔

”یہ تو نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے؟“ میں نے تنزیاً اسے ڈانٹتے اور اندر بلاتے ہوئے پوچھا۔

عظمیٰ نے حسب معمول مسکرانا چاہا، مگر اس کی پھیکی پھیکی مسکراہٹ لبوں پر ہی دم توڑ گئی۔ وہ نظریں جھکائے شرمندہ سی کھڑی تھی۔

”باجی وہ ایک گلاس پانی چاہیے، میرا میاں ساتھ آیا ہے، اسے پلانا ہے۔“ اس نے باہر گلی کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے لپک کر دروازے سے باہر جھانکا۔ بنا کا ہیرا دیکھنے کی مجھے بھی بڑی تمنا تھی۔ ایک میلا کچیلا، گندا نوجوان کونے میں چپ چاپ کھڑا تھا۔

”یہ ہے تیرا میاں؟ اور یہ تو......؟“ میں نے اس کے پیٹ کی طرف دیکھا۔ ”اتنی جلد بچہ پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟“

”باجی وہ میری ساس مجھے مارتی اور کہتی ہے کہ تو بچہ پیدا نہیں کر سکتی۔ اس لیے میں نے......“ عظمیٰ نے وضاحت کی۔

”اچھا یہ تیرا میاں کچھ کام وام بھی کرتا ہے؟“ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ حالات کچھ اچھے نہیں۔ جینے کی امنگ سے بھرپور دیوانی لڑکی کی زندگی کی ٹیپ کا فیتہ الجھ چکا تھا اور اسے شاید اس کا ادراک بھی نہ تھا۔

”نہیں باجی، یہ کام تو نہیں کرتا۔ اسی لیے تو آپ کے پاس آئی ہوں کہ کچھ مدد کر دیں۔“ اس کی آواز میں التجا تھی مگر مجھے رحم کے بجائے غصہ آ رہا تھا۔

”میاں کماتا نہیں تو تجھے اور اس بچے کو کیسے کھلائے گا؟ اور پھر تو بیمار بھی ہے؟“ میں حسب عادت ماہر اقتصادیات بن گئی۔

”جی باجی! ڈاکٹر بھی ناراض ہو رہا تھا۔ کہتا ہے مجھے بچہ پیدا نہیں کرنا چاہیے، مگر وہ میری ساس...... بڑے طعنے دیتی ہے۔ اسے خوش کرنے کے لیے......“ اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

”چلو جی تم ساس کو خوش کر لو، چاہے تمھاری جان ہی چلی جائے۔“ میں نے قریب کھڑے، بے پروا سے ناکارہ جاہل جوان کو سناتے ہوئے کہا جو بے وقوفی سے میرا منہ تک رہا تھا۔ ان لوگوں کو کبھی سمجھ نہیں آئے گی کہ زندگی کی حقیقتیں کیا ہیں؟ میں نے تاسف سے سوچا اور عظمیٰ کو کچھ پیسے دے کر رخصت کر دیا۔

عظمیٰ پھر تقریباً ایک سال تک مجھے دکھائی نہیں دی۔ کبھی کبھار اس کا خیال آتا، تو میں غصے سے سوچتی، اپنے نکمے خاوند کے ساتھ رہ رہی ہو گی۔ کھا رہی ہو گی اپنی ساس کی ماریں، بچے کو غربت کی کٹیا میں پال رہی ہو گی۔ یہ غریب، ان پڑھ لوگ نجانے پیدا کیوں ہوتے ہیں؟ دھرتی کا بوجھ بنتے اور بے مصرف زندگیاں گزار کر یونہی ختم ہو جاتے ہیں جیسے کبھی تھے ہی نہیں۔ اس ملک کی بے تحاشا بڑھتی ہوئی آبادی میں ایسے انسانوں کی کاکروچوں سے بڑھ کر حیثیت ہی کیا ہے؟

ایک روز عظمیٰ کی ماں چلی آئی...... وہ مسلسل روئے جا رہی تھی۔ ”کیا ہوا؟ عظمیٰ کہاں ہے، مجھے عرصے سے نظر نہیں آئی۔“ میں نے پانی پلانے کے بعد شفقت سے پوچھا۔

”باجی عظمیٰ بیمار ہے، چارپائی سے لگی ہے۔“ اس نے

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk

ہچکیاں لیتے ہوئے بتایا۔

''اس کا تو بچہ ہونے والا تھا، کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''باجی! اس کے ہاں لڑکی ہوئی تھی، مگر زچگی کے دوران اسے دل کا دورہ پڑا اور پھر فالج ہو گیا۔ وہ ایک سال سے بستر پہ ہے۔'' اس نے بتایا۔

''اور اس کا میاں؟'' میں نے سوال کیا۔

''وہ نکما سا لڑکا تھا۔ جیسے ہی عظمٰی کو فالج ہوا، ماں بیٹا اسپتال ہی سے گھر بھاگ گئے۔ عظمٰی اور بچی، دونوں ہمارے حوالے کر کے کہا، ہم ان کا خیال نہیں رکھ سکتے۔ ویسے بھی تمھاری بیٹی ہے، تم ہی لوگ انھیں سنبھالو۔ اب بتائیں باجی، میں خود غریب عورت ہوں۔ لوگوں کے گھروں میں کام کرتی ہوں۔ اب اسے بھی سنبھالنا پڑ گیا۔ وہ بستر پہ پڑی رہتی ہے۔ میں ہی اسے کھانا کھلاتی، کپڑے تبدیل کراتی اور سارے کام کرتی ہوں۔ وہ بس اپنی آنکھوں سے ٹُر ٹُر دیکھتی رہتی ہے۔'' عظمٰی کی بپتا سن کر دل بہت دکھا۔ میں اس کی ماں سے بیٹھی افسوس کرتی رہی۔

''باجی آپ میری ایک بات مانیں گی؟'' عظمٰی کی ماں نے میری طرف پرامید نظروں سے دیکھا۔

''کیا؟''

''باجی! آپ ایک دفعہ ہمارے گھر آ کر اس سے مل لیں۔ وہ آپ سے ملنے کو تڑپتی ہے۔ ماں ہوں، اس کی آنکھ کا اشارہ سمجھتی ہوں۔ آپ کا نام لوں، تو مچھلی کی طرح بے چین ہو کر بستر پہ لوٹنے لگتی ہے۔ آپ تو جانتی ہیں کئی سال وہ آپ کی آنکھوں کا تارا بنی رہی۔ آپ سے ملے بغیر اسے چین نہیں آتا تھا۔ اسے یہ دکھ کھائے جا رہا ہے کہ وہ آپ کے گھر نہیں جا سکتی۔ اگر صرف ایک بار آپ ہمارے گھر آ کر اسے دیکھ لیں، تو وہ خوش ہو جائے گی۔''

ایک ماں اپنی بچی کے لیے مسرتیں خریدنے نکلی تھی اور کسی صورت گھر خالی ہاتھ نہ لوٹنا چاہتی تھی۔ میں عظمٰی کی ماں کے ساتھ چل پڑی۔ ہم تنگ، بدبودار ڈھیروں، میلے کچیلے بچوں سے بھری غریب بستی کی بھول بھلیوں جیسی گلیوں میں پیدل چلتے گئے۔ ایک چھوٹے سے مکان پہ پڑا ٹاٹ کا پردہ اٹھا کر اندر داخل ہوئے۔ موسم خوشگوار تھا، نہ زیادہ سردی نہ زیادہ گرمی۔ مختلف عمروں کے بچے گھر میں کھڑے، بیٹھے، چلتے، دکھائی دیے۔ صحن کے ایک کونے پہ بچھی چارپائی پہ وہ بے جان سی پڑی تھی۔

''عظمٰی! دیکھ تیری باجی آئی ہے؟'' ماں نے اسے آواز دی مگر وہ کہاں سن سکتی تھی، بس خلا میں ٹکر ٹکر دیکھتی چلی گئی۔ فالج نے اس کی حسِ سماعت کو بھی متاثر کر دیا تھا۔ اچانک اس کی نظر مجھ پہ پڑی۔ عظمٰی کی آنکھیں چمک اٹھیں اور رنگ رنگ سے مسرت پھوٹنے لگی۔ اس کی ماں روہانسی ہو کر بولی ''سال میں یہ پہلی بار اس طرح خوش ہوئی ہے۔'' میں نے اس کے ماتھے پر پیار سے ہاتھ رکھا، اسے اپنے ساتھ لائے کپڑے جوتے دکھائے، پیسے دیے، تو وہ ہلنے جلنے کی کوشش کرنے لگی مگر اس کا جسم تو پتھر ہو چکا تھا۔ ٹس سے مس نہ ہوا۔

میرے دل سے ہوک سی نکلی۔ کیا یہ وہی جی دار، زندگی سے پیار کرنے والی لڑکی ہے جو آج لاشے کی طرح پڑی تھی۔ اب شاید وہ کبھی بستر سے اٹھ کر ان گلیوں میں نہ چل پھر سکے جہاں وہ بھنبھیری کی طرح گھومتی پھرتی، ہرنی کی طرح کلانچیں بھرتی نظر آتی تھی۔

عظمٰی مجھے دیکھ کر اپنی آنکھوں اور ہاتھوں سے

میرے دل سے ہوک سی نکلی۔ کیا یہ وہی جی دار، زندگی سے پیار کرنے والی لڑکی ہے جو آج لاشے کی طرح پڑی تھی۔

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

باتیں اور چہرے کے تاثرات سے محبّت کا اظہار کرتی رہی۔ شاید اس کے لیے یہ خیال قرین از قیاس تھا کہ میں خود چل کر گھر آؤں اور اس کا حال پوچھوں گی۔ میں بوجھل قدموں سے گھر لوٹ گئی۔ یہی سوچتی رہی کہ کیسے یہ چلبلی، پھڑکتی شوخ لڑکی اب تمام عمر مفلوج ہو کر بستر سے لگی رہے گی اور محتاجی کی زندگی گزارے گی۔ میں کار جہاں میں مصروف ہو کر رفتہ رفتہ اسے بھول بھال گئی۔ یقین تھا کہ اب یہ قصہ ختم ہو گیا۔

ایک روز میں کسی ٹی وی ٹاک شو میں ایک وڈیرن ایم این اے صاحبہ کے ساتھ مدعو تھی۔ باتوں باتوں میں پتا چلا کہ محترمہ معذور غریب افراد کی بحالی کے لیے بھی کام کرتی ہیں۔ میں نے عظمی کی مدد کے خیال سے ان کا کارڈ لیا۔ ادارے کے متعلق معلومات حاصل کر کے ان سے مدد کرنے کی استدعا کی۔ لیکن پھر مہنگے، امپورٹڈ پرفیوم کی خوشبو میں مہکتے جوڑے میں ملبوس خاتون کی انگوٹھیوں کے دمکتے ہیروں کی چکا چوند سے گھبرا کر ان کا کارڈ وہیں ایک طرف ڈال دیا۔ عوام کی خادمہ کے انداز گفتگو اور رئیسانہ انداز تغافل سے انسان دوستی کی مہک کہیں سے نہ آتی۔ سوچا، بیکار ہے، یہ کچھ نہیں کرے گی اور اس سے رابطہ ہی نہیں کیا۔

دو سال پھر گزر گئے۔ میں عظمی کو تقریباً بھول گئی کہ یکا یک ایک روز میرے دروازے پہ گھنٹی بجی۔ میں نے آوازیں دے دے کر پوچھا ''کون؟'' تو کوئی جواب نہیں آیا۔ باہر جا کر دیکھا، تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی، عظمی مٹی کی ڈھیری کے مانند دروازے پر پڑی تھی۔

''عظمی تو یہاں کیسے آئی؟ تو چل سکتی ہے؟ تو بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی؟'' میں نے تابڑ توڑ سوالات داغنے شروع کر دیے۔ اس نے مجھے کوئی جواب نہ دیا۔ دیتی بھی کیسے؟ وہ تو بول اور سن ہی نہیں سکتی تھی۔ بس مجھے محبت پاش نظروں سے دیکھتی رہی۔ صاف ستھرے کپڑے پہننے والی خوبصورت، نوجوان چنچل لڑکی اب میلے کچیلے کپڑوں کا ڈھیر بنی زمین پہ گھسٹ گھسٹ کر چل رہی تھی۔ میرا دل پاش پاش ہو گیا۔ یا اللہ! اب اس بدقسمت لڑکی کی پہاڑ جیسی زندگی کیا یونہی گزرے گی؟ کاش ڈاکٹروں کی ہدایت کے مطابق وہ بچہ پیدا نہ کرتی۔

☆☆

عظمی اب بھی آتی ہے۔ مجھے اس کے آنے سے خوشی ہوتی ہے اور غم بھی۔ کبھی کبھی سوچتی ہوں کہ وہ نہ آیا کرے، خوامخواہ مجھے آزار میں مبتلا کر دیتی ہے۔ وہ آئے تو چیخیں مار مار کر روتی اور پھر لوٹ جاتی ہے۔۔۔۔ ہاتھ میں میری دی ہوئی چیزوں سے بھرا تھیلا لیے وہ گھسیٹ گھسیٹ کر واپس چلی جاتی ہے۔ میں نجانے کیوں عظمی سے شرمندہ ہوتی ہوں کہ اس کے لیے کسی ادارہ بحالی معذوراں سے کوئی مدد نہ لے سکی۔

کبھی کبھی ڈر لگتا ہے کہ اگر میں نے اپنا کرائے کا مکان تبدیل کر لیا۔ پھر وہ آئی اور مجھے یہاں نہ پایا، تو کیا کرے گی؟ طویل سفر طے کر کے کس کے لیے میرے گھر آنا ویسے بھی کافی مشکل ہوتا تھا۔ پھر سوچتی ہوں، میں نے اس کا عمر بھر کے لیے ٹھیکہ تو نہیں لے رکھا۔ ایک نہ ایک دن تو وہ ضرور ناامید لوٹے گی۔ ایک نہ ایک دن تو اسے میرا گھر بھی بند ملے گا۔ میں کہیں اور بس جاؤں گی۔ کسی اور مدار میں گھوم رہی ہوں گی۔

لیکن مجھے قوی یقین ہے، یہ جوان، تیئس سالہ گونگی بہری، لنگڑی مفلوج لڑکی کسی صورت ہار نہیں مانے گی۔ وہ زندگی کو سدا نہیں گھسیٹے گی بلکہ کسی نہ کسی طور اپنے بل بوتے اور قوت ارادی پہ جینے کے قابل بنا لے گی۔۔۔۔ ایسا ہم میں سے کتنے لوگ کر سکتے ہیں؟ ہم تو ہیرے تلاش کرتے کرتے خود پتھر کے بن جاتے ہیں۔

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

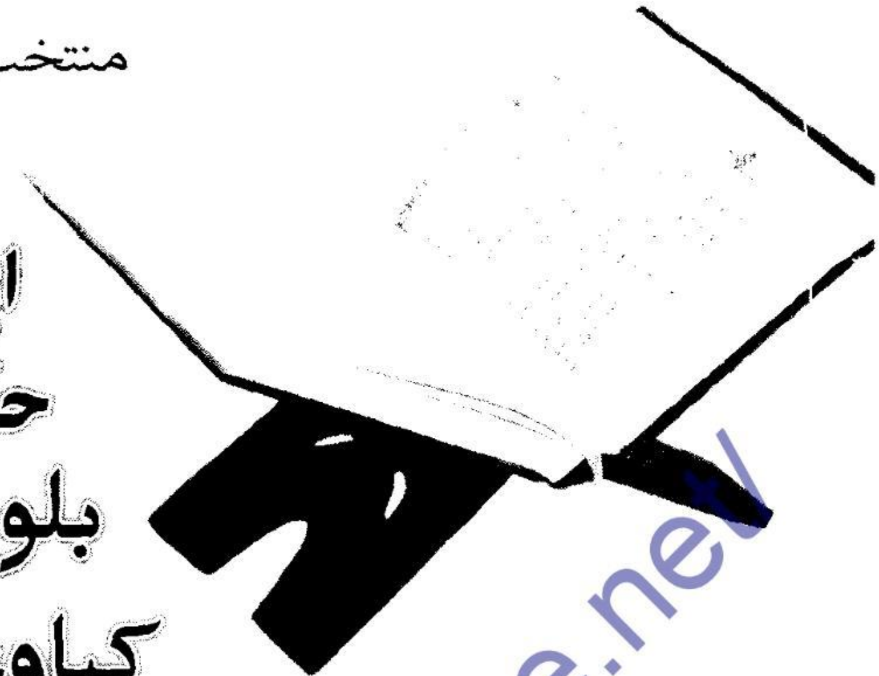

قرآن پاک پہ حلف اٹھا کر

ایوب خانی حکومت نے بلوچ سردار سے کیا وعدہ توڑ ڈالا

حکمرانوں کی انہی بداعمالیوں نے بلوچستان کے عوام میں غم و غصے کو جنم دیا

محسن فارانی

نوروز خان

http://www.bookstube.net
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

آج سے تقریباً ۴۴ برس قبل میں نے بلوچستان کے مسائل اور دیگر موضوعات پر کتاب ''اجنبی اپنے دیس میں'' لکھی۔ میں نے جو لکھا آج حرف بحرف درست ثابت ہو رہا ہے۔ جن مسائل کی نشاندہی کی، ان میں اضافہ ہوا۔ انتظامیہ کی جس بے حسی اور نااہلی کا ذکر کیا، وہ ہنوز قائم ہے۔ اس زمانے میں مغربی پاکستان کے چیف سیکرٹری کو اس بات کا علم تک نہ تھا کہ ضلع مکران کا ہیڈکوارٹر تربت ہے۔ اسی نالائقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے سیکرٹریٹ والوں نے پوچھا کہ تربت مکران سے کتنا دور ہے؟ اس پر ڈی سی صاحب کی رگِ ظرافت پھڑکی۔ انھوں نے لکھا ''جتنا لاہور پنجاب سے دور ہے۔'' یہ جرأت رندانہ مزاجِ خسروی سے براہِ راست ٹکرائی اور انھوں نے سارے ضلع کو طاقِ نسیان میں ڈال دیا۔

افسر شاہی کی رعونت کا یہ عالم تھا کہ جب میں نے ''اجنبی اپنے دیس میں'' منظوری کے لیے بھیجی، تو حکومت نے بیک جنبش قلم پابندی لگا دی۔ وجہ یہ لکھی: ''یہ کتاب انتظامیہ کے لیے پریشانی کا باعث بنے گی۔'' میں نے پابندی کی پروا نہ کرتے ہوئے کتاب چھاپ دی جس کو بفضل ربی تعالیٰ پذیرائی ملی۔ (''اجنبی اپنے دیس میں'' ادارہ اردو ڈائجسٹ کے زیر اہتمام شائع ہوئی تھی۔)

یہ بلوچستان پر اس اعتبار سے مستند کتاب تھی کہ میں وہاں تین سال مقیم رہا۔ بلوچوں کے مسائل کو سمجھا۔ اس کسک کو محسوس کیا جو وہاں ہر دل میں ایک ہوک کی صورت موجود تھی۔ ان کا دکھ درد بانٹا۔ خوشیوں میں شریک ہوا۔ سب سے بڑھ کر خود احتسابی کی منزل سے گزرا۔ مسئلہ تو پہلے سے موجود تھا۔ سول سروس کے لوگوں نے اس کی گمبھیرتا میں اضافہ کیا۔ میں نے ان کی کوتاہ نظری کا برملا ذکر کیا اور ایسی پالیسیوں کو بے نقاب کیا جن کی وجہ سے نفرت اور بد اعتمادی کی خلیج وسیع تر ہوتی چلی گئی۔

میرا تعلق صوبائی سول سروس سے ہے۔ ۱۹۶۷ء میں میرا پہلا تقرر مکران ہوا۔ مجھ پر بڑی گھبراہٹ طاری ہوئی۔ مکران کو میں مورخ بلاذری کے حوالے سے جانتا تھا۔ صاحب ''فتوح البلدان'' لکھتا ہے: ''فتح مکران سے قبل خلیفہ سوم حضرت عثمانؓ نے حکم بن جبلہ کو حالات جاننے کے لیے مکران بھیجا۔ واپسی پر اس نے جو رپورٹ دی وہ خاصی حوصلہ شکن تھی۔ بولا: ''پانی بہت کم ہے، پھل سخت کڑوا ہے اور چور زیادہ ہیں۔ زیادہ فوج بھیجی، تو بھوک سے مر جائے گی، تھوڑی کو چور ڈاکو مار دیں گے۔''

حکم کو یقیناً بتایا گیا ہوگا کہ قبل ازیں سائرس اعظم، زرکسیز، سکندر اعظم کی فوجیں مکران میں نیست و نابود ہو گئی تھیں۔ اس تاریخی تناظر میں جب میں نے والد صاحب سے ذکر کیا، تو ایک لمحے کے توقف کے بغیر بولے: ''بہت اچھا ہوا۔ آدمی شروع ہی سے مشکل مقامات میں نوکری کرے، تو پھر اسے زندگی بھر تکلیف نہیں ہوتی۔''

میں گیارہ دن میں مکران پہنچا۔ تلہ گنگ سے کوئٹہ پہنچنے میں دو دن لگ گئے۔ وہاں جا کر پتا چلا کہ ہفتے میں ایک دن بس جاتی ہے جو نکل چکی۔ جب بس چلی تو قلات جا کر رک گئی۔ بتایا گیا کہ صبح قافلہ چلے گا۔ مسلح دستے پہاڑوں پر پکٹنگ کریں گے، تو وہ حرکت میں آئے گا۔ دوسری رات سوراب میں آ گئی۔ کریدنے پر

http://www.bookstube.net/

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

معلوم ہوا کہ خضدار سے جو قافلہ آئے گا، اس کی حفاظت میں سفر کرنا ہے۔ تیسری رات بسمہ میں گزارنی پڑی۔ اب کے خاران کے قافلے کی معیت میں آگے بڑھنا ہوگا۔

براستہ ناگ جب پنجگور پہنچے، تو معلوم ہوا زمین سوختنی تھی۔ میلوں تک پینے کا پانی نہ ملتا۔ کوئی ویرانی سی ویرانی تھی۔ کھیت کھلیان، بستیاں اور مکان، مساجد اور عمارت...... کچھ بھی نظر نہ آیا۔

مزید پوچھ پڑتال سے معلوم ہوا کہ ۱۹۵۹ء میں

میں یہ عام تاثر قائم ہوگیا۔ (''حرمتِ حرف''، شوکت علی شاہ۔ ''نوائے وقت''، ۱۰ ستمبر ۲۰۱۴ء)

خضر حیات ٹوانہ اور میاں منظر بشیر

عمر حیات خان ٹوانہ ایک بار اپنے گاؤں کی ایک لڑکی کو برطانیہ لے گئے جو بہت خوبصورت تھی۔ وہاں وہ مقابلہ حسن میں ملکہ قرار پائی۔ برطانیہ کی حسین خواتین نے اس سے پوچھا کہ تمھارا قد اتنا سیدھا کیسے ہوگیا؟ اس نے کہا: ''میں اپنے سر پر پانی کی بھری ہو تین تین چار چار گاگریں (گھڑے) لاتی تھی۔'' برطانیہ کی کئی

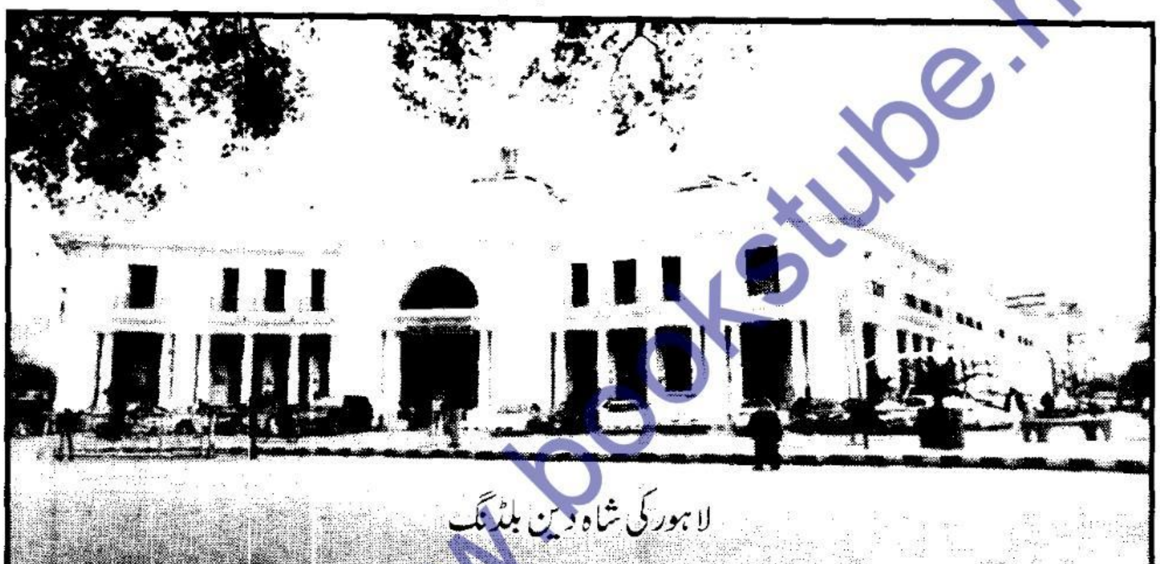

لاہور کی شاہ دین بلڈنگ

جھالاوان کے نواب نوروز خاں نے مسلح بغاوت کی تھی۔ فوجی ایکشن ہوا، بمباری ہوئی۔ بالآخر سردار دودا خاں زرکزئی (حکومت کی طرف سے) قرآن شریف لے کر اس کے پاس گیا اور اسے یقین دلایا کہ حکومت صلح کرنا چاہتی ہے۔ اس نے گرفتاری دے دی۔

لیکن ایوب خان کی حکومت نے بدعہدی کی۔ نواب نوروز خاں اور اس کے ساتھیوں پر مقدمہ چلا اور انھیں سزائے موت ہوئی۔ اس پر سارے بلوچستان میں آگ لگ گئی۔ ''یہ حکومت جھوٹی ہے ......'' بلوچوں

میمیں اس کی پیروی میں سر پر گاگریں رکھ کر چلنے لگیں۔

احمد یار خان ٹوانہ کے جانشین خضر حیات خاں ٹوانہ تھے جو متحدہ پنجاب کے آخری وزیراعظم رہے۔ انھوں نے آخری عمر میں ایک اور شادی کر لی۔ وہ فوت ہوئے، تو اس کے بچے نابالغ تھے۔ اس لیے ان کی جائداد کا انتظام کورٹ آف وارڈ (نابالغ بچوں کے عدالتی سرپرست) نے سنبھالا۔ نابالغ لڑکے کا نام ثمر ٹوانہ تھا۔ اس کا اکاؤنٹ وائی ایم سی اے کے سامنے الائیڈز بینک میں تھا جس کے اوپر لاہور

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

امپرووومنٹ ٹرسٹ کا دفتر تھا۔

جب میں اگست ۱۹۵۰ء میں "وی برادرز" میں شامل ہوا، تو میرا اکاؤنٹ بھی الائیڈز بینک میں تھا۔ اس بینک کا منیجر انگریز تھا۔ بینک میں ایک بہت ہی پُراسرار قسم کا فراڈ ہوا۔ ملزم این ٹائپ (سمن آباد) میں ۹۰۰ والی لائن میں رہتا تھا۔ میں نے اس کے پکڑے جانے میں بہت مدد کی تھی جس پر بینک کے ہیڈ آفس (برطانیہ) سے میرے نام تعریفی خط آیا۔

بچارہ ثمر ٹوانہ اس وقت ساتویں یا آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا۔ کئی روز چکر لگاتا اور معلوم کرتا کہ اس کے ماہانہ پیسے عدالت کی طرف سے آئے ہیں یا نہیں۔ پھر وہ جوان ہوگیا، لیکن دو شادیاں کرنے کے بعد قتل ہوا۔ اس کی چالیس پینتالیس کنال اراضی لاہور چھاؤنی میں واقع ہے۔ کچھ روز قبل میرے دوست جہانگیر جھجھہ ایڈووکیٹ نے بتایا کہ اس اراضی کا مقدمہ ثمر حیات کی بیوہ ٹمی ٹوانہ ان کے پاس لائی ہے..... فَاعتَبِرُو ایا اُولی الاَبصَار "اگر بصیرت ہو تو ایسے واقعات سے عبرت حاصل کرو۔" ("مقامِ عبرت" نذر الرحمٰن رانا۔ "پاکستان" ۲/اگست ۲۰۱۴ء)

ایسا ہی ہمیں ایک اور واقعہ یاد آگیا۔ مال روڈ پر واقع مشہور عمارت، شاہ دین بلڈنگ جسٹس شاہ دین ہمایوں (جج متحدہ پنجاب ہائیکورٹ) سے منسوب ہے۔ ان کے صاحبزادے میاں بشیر احمد ادبی جریدہ "ہمایوں" نکالتے رہے۔ انہی میاں بشیر احمد نے مسلم لیگ کے تاریخ ساز اجلاس (منٹو پارک، مارچ ۱۹۴۰ء) میں نظم پڑھی تھی: "ملت کا پاسبان ہے محمد علی جناحؒ۔" قیامِ پاکستان کے بعد وہ ترکی میں سفیر رہے۔

میاں بشیر احمد کے بیٹے تھے، میاں منظر بشیر۔ ان کی لارنس روڈ پر واقع ایک ایکڑ کے لگ بھگ کوٹھی میں ۱۹۷۰ء کی ایک انتخابی میٹنگ میں ہم بھی شریک ہوئے۔ میاں منظر بشیر نے آخری عمر میں ایک شادی کر لی تھی۔ ان کی اہلیہ کے بھائی برطانیہ میں تھے۔ بیوی نے اکسایا کہ یہاں کیا رکھا ہے، ہم لندن چلتے ہیں، چناں چہ لارنس روڈ والی کوٹھی اور شاہ دین بلڈنگ کروڑوں روپے کی جائداد بیچ کر لندن چل دیے۔ وہاں ہیتھرو ائیر پورٹ پر ان کے سامان سے ہیروئن نکلی جو یقیناً ان کے کسی برادرِ نسبتی کی حرکت تھی۔ لیکن پکڑے گئے میاں منظر بشیر اور پھر وہاں انھیں سات آٹھ سال قید کاٹنی پڑی۔

ان کے پاس جو روپیہ موجود تھا، سارا عدالتوں اور وکیلوں کی نذر ہوگیا۔ جب رہا ہو کر لاہور آئے، تو علامہ اقبال ٹاؤن میں سعید بدر کی اقامت گاہ کے کوارٹر میں مقیم ہوئے اور وہیں وفات پائی۔ جبکہ ماضی میں سعید بدر کی تعلیم و تربیت کے اخراجات میاں بشیر احمد برداشت کرتے رہے تھے۔

لانگ مارچ جو صدر اور وزیراعظم کو لے ڈوبا

میاں نواز شریف کے دورِ حکومت کا وہ لانگ مارچ (جولائی ۱۹۹۳ء) تاریخی حیثیت رکھتا ہے جس کا اعلان حزبِ اختلاف کی قائد محترمہ بے نظیر بھٹو نے کیا تھا۔ اس کا اہتمام پی ڈی اے میں شامل جماعتوں کی آل پارٹیز کانفرنس میں کیا گیا جس کے سربراہ نوابزادہ نصراللہ خاں تھے۔ اس وقت تین صوبوں میں پی ڈی اے (پاکستان ڈیموکریٹک الائنس) اتحاد کی مخلوط حکومتیں تھیں۔ سندھ میں سید مظفر شاہ، سرحد میں میر افضل خان، اور پنجاب میں منظور وٹو وزیراعلیٰ ہوا کرتے تھے جبکہ صدر غلام اسحٰق خاں کے معتمد خاص، چودھری الطاف حسین (پی پی پی)

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

کو خاص طور پر صوبہ پنجاب کا گورنر بنایا گیا۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب ملک میں اسمبلی، اسمبلی کا کھیل عروج پر تھا۔ پہلے پنجاب اسمبلی کو توڑا گیا۔ جب لاہور ہائیکورٹ نے اسمبلی بحال کر دی (اواخر جون ۱۹۹۳ء میں) تو سات منٹ بعد صدر کے حکم پر گورنر الطاف حسین نے صرف دوبارہ توڑ کر منظور وٹو کی حکمرانی کو برقرار رکھا۔ قومی اسمبلی نے پنجاب کا نظم و نسق سنبھالنے کے لیے قرارداد منظور کی، تو اس کا نوٹیفکیشن جبراً روک دیا گیا۔

اس سے پہلے (۱۸/اپریل ۱۹۹۳ء کو) صدر غلام اسحٰق خاں نے نواز شریف حکومت ختم کر کے قومی اسمبلی توڑ دی۔ میاں نواز شریف نے صدارتی حکومت کو سپریم کورٹ میں چیلنج کر دیا۔ چیف جسٹس سید نسیم حسن شاہ کی سربراہی میں فل بنچ (گیارہ رکنی بنچ) نے جب (اواخر مئی میں) نواز حکومت اور قومی اسمبلی بحال کر دی، تو فیصلہ تسلیم کرنے کے بجائے ایوان صدر سازشوں کا گڑھ بن گیا۔ اس وقت اپوزیشن جماعتوں کی جانب سے ازسرِ نو انتخابات کا مطالبہ سامنے آیا۔

آل پارٹیز کانفرنس میں کہا گیا کہ اگر وزیراعظم نے ان کا مطالبہ تسلیم نہ کیا، تو لاہور سے اسلام آباد کی جانب لانگ مارچ ہوگا اور اسلام آباد میں دھرنا دیا جائے گا۔ بے نظیر بھٹو نے تاریخ ۴/جولائی ۱۹۹۳ء وزیراعظم کو ایک طویل مراسلہ ارسال کیا جس میں قومی حکومت قائم کرنے اور آئینی اصلاحات کا مطالبہ کیا گیا۔ اس حوالے سے مذاکرات کی پیش کش کی گئی جبکہ وزیراعظم نے ۸/جولائی کو ملاقات کی دعوت دی۔ مگر ۸/جولائی ۱۹۹۳ء کو لاہور میں نوابزادہ نصراللہ خاں کی زیرِصدارت اے پی سی کے لانگ مارچ کی حکمت عملی اور اخراجات کا تخمینہ مرتب ہوا۔ لانگ مارچ کا دورانیہ تین یا چار دن رکھا گیا۔

۱۶/مارچ کو لانگ مارچ کا اعلان کر دیا گیا۔ بے نظیر بھٹو نے لاہور میں گورنر الطاف حسین اور وزیراعلیٰ پنجاب میاں منظور وٹو سے طویل مذاکرات کیے اور لانگ مارچ کے لیے لائحہ عمل کو حتمی شکل دی۔ اے پی سی کے سربراہ نوابزادہ نصراللہ خاں نے پریس کانفرنس کی کہ اسلام آباد کا تین روز تک گھیراؤ کیا جائے گا۔ تب آرمی چیف جنرل عبدالوحید کاکڑ نے محترمہ بے نظیر بھٹو سے رابطہ کر کے انھیں اسلام آباد لے جانے کے لیے فوجی طیارہ بھیجا اور ان سے کہا کہ لانگ مارچ ملتوی کر دیں۔ بے نظیر بھٹو نے روانگی سے قبل ایسا ہی کیا۔

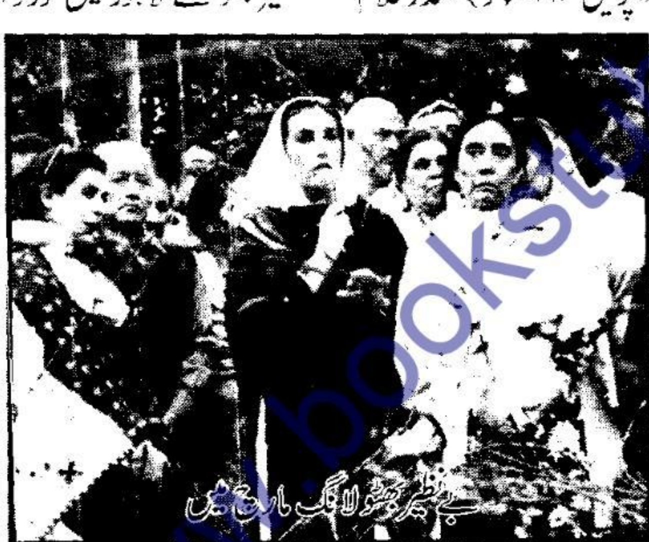
بے نظیر بھٹو لانگ مارچ میں

ادھر وزیراعظم پر دباؤ ڈالا گیا کہ اسمبلی توڑ کر استعفا دے دیں۔ میاں نواز شریف نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا اور یہ شرط عائد کی کہ صدر غلام اسحٰق خاں استعفا دے دیں، تو وہ بھی تیار ہیں۔ اور پھر ایسا ہی ہوا۔

http://www.bookstube.net
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

۱۸؍جولائی کو صدر، سربراہ حکومت یعنی وزیراعظم، چاروں گورنروں اور وزرائے اعلیٰ کو عہدوں سے ہٹانے کا ٹرائیکا (غلام اسحاق، نواز شریف اور عبدالوحید) کے اجلاس میں کیا گیا۔ ایوان صدر کے دربار ہال میں نصف شب کے قریب ایک ساتھ بڑوں نے استعفے دیے اور حلف برادری کی دو تقریبات منعقد ہوئیں۔ صدارتی فرمان جاری ہوا اور قومی و صوبائی اسمبلیاں توڑ دی گئیں۔

سب سے پہلے معین قریشی نے نگران وزیراعظم کے عہدے کا حلف لیا جو طویل خصوصی پرواز کے ذریعے سنگاپور سے اسلام آباد پہنچے تھے۔ اس کے بعد صدر اسحق خاں نے اپنے استعفا کی تحریر پڑھی جو وہ پیشگی جنرل کاکڑ کے حوالے کر چکے تھے۔ جبکہ ۸۷ سالہ بیوروکریٹ صدر سے ایک گھنٹا قبل وزیراعظم نواز شریف نے ریڈیو اور ٹی وی پر قوم سے خطاب کرتے ہوئے ''میں نے کرسی چھوڑ دی'' کا اعلان کیا۔ سینٹ کے چیئرمین وسیم سجاد نے قائم مقام صدر کا حلف لیا۔ اس طرح بے نظیر بھٹو کا (دوسرا) لانگ مارچ اپنے منطقی نتیجے تک جا پہنچا۔ (''قلم کی آواز'' سید انور قدوائی۔ ''جنگ'' ۴؍اگست ۲۰۱۴ء)

سربرینیکا کے مسلمانوں کے سرب اور ڈچ قاتل

ایک ولندیزی (ڈچ) عدالت نے فیصلہ دیا ہے کہ ہالینڈ ۱۹۹۵ء میں بوسنیا و ہرزیگووینا میں ۳۰۰ سے زیادہ بوسنوی مسلمان مردوں اور لڑکوں کی ہلاکت کا ذمے دار ہے۔ یہ مرد اور لڑکے ان ۵ ہزار بوسنوی شہریوں میں شامل تھے جنھوں نے پوٹو کاری کے ولندیزی امن مشن میں پناہ لی تھی۔ عدالت نے کہا کہ جب ولندیزی فوج نے ان افراد کو سربوں کے حوالے کیا، تو اسے معلوم ہونا چاہیے تھا کہ انھیں قتل کر دیا جائے گا۔ اس قتل عام میں ۷ ہزار سے زیادہ مردوں اور لڑکوں کو شہید کر دیا گیا تھا۔ (مناظرِ عالم۔ ''فیملی میگزین'' ۲۷؍جولائی تا ۲؍اگست ۲۰۱۴ء)

حقیقت یہ ہے کہ ۱۱؍جولائی ۱۹۹۵ء کی رات محصور شہر سربرینیکا سے تقریباً ۸؍ہزار مسلمان پناہ کی تلاش میں نکلے مگر خونخوار سرب عیسائیوں نے نھیں گھیر کر انتہائی سفاکی سے شہید کر دیا۔ اس قتل عام میں ولندیزی فوجی دستہ برابر کا شریک تھا۔ حالانکہ اقوام متحدہ نے سربرینیکا کو Safe Haven (محفوظ پناہ گاہ) قرار دے کر اسے وہاں تعینات کیا تھا۔ مگر اس ولندیزی دستے نے ان مجبور مسلمانوں کو ظالم سربوں کے حوالے کر ڈالا۔ اس خونیں رات ڈچ فوجی دستے کا کمانڈر سرب کمانڈر سے مل کر شراب پیتا رہا اور ان مسلمانوں پر قیامت گزر گئی۔

میں نے پرنسپل کی ''وفات'' کی خبر اُڑا دی

میں کالج میں مجلس نمود اردو کا سیکرٹری تھا جسے یار لوگ ''مجلس نمرود اردو'' کہتے تھے۔ میں نے ایک بہت بڑے مشاعرے کا اہتمام کیا۔ عین مشاعرے والے روز پرنسپل دلاور حسین مرحوم نے مجھے بلایا اور کہا: ''برخوردار! اگر کوئی میرے بیٹے کو قتل کر دے، تو میں اسے معاف کر دوں گا مگر مشاعرہ کرانے والے کو معاف نہیں کروں گا۔ یہ کیا بکواس ہے کہ ایک شاعر آتا اور کہتا ہے: عرض کیا ہے۔ دوسرا آتا ہے، کہتا ہے: عرض کیا ہے۔ میں نے بھی عرض کیا ہے کہ مشاعرہ نہیں ہوگا۔''

اب صورت حال یہ پیدا ہوئی کہ رات کو کالج کے مین گیٹ پر جسے میں نے تالا لگوا دیا تھا، مشاعرے کے

http://www.bookstube.net/

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

ہزروں دلدادہ جمع ہو گئے۔ اس پر میں نے کالج کی دیوار پر کھڑے ہو کر اس جمِ غفیر کی مخاطب کیا اور لہجے میں پورا درد پیدا کرتے ہوئے کہا: ''میں یہ خبر انتہائی دکھ اور درد کے ساتھ سنا رہا ہوں کہ کالج کے پرنسپل پروفیسر دلاور حسین قضائے الٰہی سے انتقال فرما گئے ہیں، چناں چہ ان کے سوگ میں مشاعرہ ملتوی کر دیا گیا ہے۔''

اگلے روز میری پیشی ہوئی۔ میں نے کہا: ''سر! اگر میں آپ کے جرم کی پاداش میں انتقال کی جھوٹی خبر نشر نہ کرتا، تو آپ مشتعل ہجوم کے ہاتھوں میرے انتقال کی سچی خبر سن رہے ہوتے۔'' بہرحال جھوٹی خبر سنانے پہ مجھے کالج سے دو سال کے لیے نکال دیا گیا۔ میں ایک ہفتہ گزرنے کے بعد اپنے مشفق اور دانشور مگر بذلہ سنج پرنسپل کی خدمت میں معافی کی درخواست لیے حاضر ہوا۔ بولے:

''اچھا، تھانہ پرانی انارکلی کے ایس ایچ او، تھانیدار، حوالدار یا کسی سپاہی کی سفارش کرا سکتے ہو؟''

میں نے کہا: ''سر، ان میں سے کوئی بھی میرا واقف نہیں۔''

بولے: ''برخوردار، جیسی تمھاری حرکتیں ہیں، سارا تھانہ تمھارا واقف ہونا چاہیے۔'' پھر بولے: ''باہر اسٹول پر معراج دین بیٹھا ہے۔ اس کی سفارش کرا سکتے ہو؟''

میں نے جواب دیا: ''جی سر!'' اور بالآخر معراج دین کی سفارش پر مجھے معاف کر دیا گیا۔ (''روزن دیوار سے'' عطاالحق قاسمی۔ ''جنگ'' ۲۶ رمئی ۲۰۱۴ء)

ایک بوسنیائی خاتون بیٹے کی قبر پر

ایٹمی و میزائل پروگرام کے ۸ سرپرست

۱۹۸۴ء میں ہم نے ایٹمی دھماکا کرنے کی صلاحیت حاصل کر لی تھی۔ یہ تاریخ ۱۰ ردسمبر ۱۹۸۴ء میں نے جنرل ضیاالحق صدرِ وقت کو تحریری طور پر اس سے آگاہ کر دیا۔ اس کی تصدیق جنرل خالد محمود عارف نے Deception نامی کتاب کے مصنف ایڈریان لیوی کو دیے ہوئے ایک انٹرویو میں کر دی۔ ایٹمی دھماکوں سے پیشتر ۶ راپریل ۱۹۹۸ء کو کے آر ایل (کہوٹہ ریسرچ لیبارٹریز) نے لمبی مار والے بیلسٹک میزائل ''غوری'' کا کامیاب تجربہ کیا۔ اس میں ۱۲۰۰ کلومیٹر دور ہدف کو صحیح نشانہ بنا دیا۔ اس سے بھارت کی ہوا نکل گئی۔ ان کو یقین ہو گیا تھا کہ اب وہ نہ پاکستان کو دھمکیاں دے، نہ بلیک میل کر سکتا ہے۔

اس تمام کام میں مرحوم ذوالفقار علی بھٹو، مرحوم جنرل ضیاالحق، مرحوم جناب غلام اسحٰق خاں، مرحوم آغا شاہی، بے نظیر بھٹو، نواز شریف، جنرل مرزا اسلم بیگ اور جنرل عبدالوحید کاکڑ نے نہایت کلیدی کردار ادا کیا۔ اس سلسلے میں سب سے مصدقہ بیان غلام اسحٰق خاں کا ہے جو انھوں نے ایک خط میں جناب زاہد ملک کو تحریری طور پر دیا کیونکہ وہ اس پروگرام کے سربراہ اور ۱۹۷۶ء سے ۱۹۹۳ء تک ہر سرگرمی سے واقف تھے۔

(۲۸ رمئی، تاریخ ساز دن'' ڈاکٹر عبدالقدیر خان۔

http://www.bookstube.net/

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

''جنگ'' ۲۶رمئی ۲۰۱۴ء)

امریکی تباہ کن جہاز کی رسوائی

حال ہی میں بحیرۂ اسود میں امریکی تباہ کن بحری جہاز، ڈونلڈ کک کے ساتھ ایک عجب حادثہ پیش آیا جو کریمیا پر روس کے الحاق قبضے (مارچ ۲۰۱۴ء) کے بعد امریکا نے اپنی طاقت کا اظہار کرنے وہاں بھیجا تھا۔ ڈونالڈ کک چوتھی نسل کا تباہ کن جہاز ہے۔ اس پر کروز میزائل نصب ہیں جو ۲۵۰۰ کلومیٹر تک اپنے ہدف کو نشانہ بنا سکتے ہیں۔ نیز اس میں آیجس (Ageis) اینٹی بیلسٹک میزائل بھی لگے ہیں۔ یہ ایئر ڈیفنس سسٹم سے بھی آراستہ ہے جس میں ۴ ریڈار نصب ہیں۔

اس جدید ترین جہاز کے تمام آلات کو ۲ر روسی سخوئی ۲۴ طیاروں نے قریب سے پرواز کر کے جامد کر دیا۔ نتیجے میں یہ جہاز صرف لوہے کا پہاڑ بن گیا۔ یہ اطلاع ۵؍ارمئی ۲۰۱۴ء کو روسی لکھاری انتون ولاگن نے ''روسیا اےکایا گزیتا'' نامی اخبار میں لکھ کر دی۔ امریکی تباہ کن جہاز اس رسوائی کے بعد رومانیہ کی طرف روانہ ہو گیا جہاں عملہ جہاز کے ۲۷ر افراد نے استعفا دے دیا کہ ایسی بے بسی کی موت سے گھر بیٹھنا بہتر۔ (''زاویۂ نگاہ'' نصرت مرزا۔ ''جنگ'' ۲۶رمئی ۲۰۱۴ء)

حسن بن صباح اور ہٹلر کا فدائی کینیڈین مُلّا

علامہ احمد علی قصوری یونیورسٹی کے دنوں سے طاہرالقادری صاحب کے ساتھی رہے۔ علامہ صاحب کہتے ہیں کہ انہی دنوں جب قادری صاحب ایل ایل بی کر رہے تھے، تو ان کے ذہن میں مستقبل کا ایک نقشہ تھا، ایک خواب سا رچا بسا تھا۔ اس کے لیے پانچ مرحلے درکار تھے، آخری مرحلے پر انقلاب کا بگل بجانا تھا جو انھوں نے آخر بجا دیا مگر کامیاب نہیں ہو پائے گا۔ علامہ صاحب نے اپنے سابق لیڈر کی صرف برائیاں نہیں گنوائیں، ان کی ساری صفات پر بھی روشنی ڈالی۔ کہتے ہیں کہ وہ بلا کے ذہین ہیں۔ ان کی یادداشت لاجواب ہے۔ وہ اپنے خطاب سے سامعین کو مسحور کر دیتے ہیں۔ میں بھی اس زمانے میں کہا کرتا تھا کہ کاش! میری عمر انھیں لگ جائے۔

ان کی محبوب ترین ہستیوں میں تین نام نمایاں ہیں: ایک حسن بن صباح جس کے ایک اشارے پر اس کے فدائی پہاڑ کی چوٹی سے چھلانگ لگا دیا کرتے تھے۔ دوسرا ہٹلر جس نے ایک دنیا تسخیر کرنے کی ٹھانی اور اپنے مقاصد کے لیے قتلِ عام کیا۔ تیسرے امام خمینی جو کامیاب انقلاب برپا کرنے کی شہرت رکھتے ہیں۔ قادری صاحب میں ایک خامی بھی ہے کہ وہ اچھے انسان نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ساتھ کسی ساتھی کا مستقل نباہ نہیں ہو سکا۔ (''انداز جہاں'' اسد اللہ غالب۔ ''نوائے وقت'' ۱۱راگست ۲۰۱۴ء)

ادھر کنواں، اُدھر کھائی

انگریزی کا ایک محاورہ ہے کہ ''شیطان اور گہرے سمندر کے درمیان'' (Between the devil and the deep blue sea)۔

ایک بار جب بیروت سے اطالیہ (اٹلی) جانے والا سمندری جہاز سسلی کے جزیرے اور اطالیہ کے درمیان ایک تنگ آبنائے (مسینا) میں سے گزر رہا تھا، تو کپتان نے ہمیں بتایا: ''یونانی دیومالا میں آیا ہے کہ سسلی کی چٹانوں میں ایک چڑیل رہائش پذیر تھی جو یہاں سے گزرنے والے ملاحوں کو اچک لیتی اور کھا جاتی۔ جب وہ اپنی جان بچانے کی خاطر اطالیہ کے

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

ساحل کے قریب ہوتے، تو وہاں سمندر میں ایک بھنور ان کو نگل جاتا۔ یوں اس محاورے ''شیطان اور گہرے سمندر کے درمیان'' کی ابتدا ہوئی۔

اس محاورے کے معنی ہیں ''گومگو کی حالت میں'' یا ''اُدھر کنواں، اِدھر کھائی۔'' (''ہزار داستان'' مستنصر حسین تارڑ۔ ''نئی بات'' ۱۷/اگست ۲۰۱۴ء)

طرزِ حکمرانی کا شاطرانہ استعمال

مطمئن اور پُرسکون رعایا ہر حکمران کی سب سے مضبوط دفاعی لائن سمجھی جاتی ہے۔ دوسرا اگر طرزِ حکمرانی کا شاطرانہ استعمال تھا۔ اس کی مثال سپارٹا (یونان) کے حکمران نے سمجھائی جس کے پاس دیگر ریاستوں کے باشندے اپنے بچوں کو حکمرانی کے گُر سکھانے بھیجتے تھے۔ وہ جاتے ہوئے انھیں مکئی کے ایک کھیت سے گزارتا جہاں تمام پودے تقریباً ایک سائز کے ہوتے لیکن چند ایک سر اٹھائے ہوتے، انھیں تلوار سے کاٹ کر برابر کر دیتا۔ جس حکمران کو اپنی رعایا میں اقتدار کے خواہش مند سر اٹھاتے لوگوں کا علم نہ ہوتا، اس کا زوال یقینی تھا۔

امریکی جہاز، ڈونالڈ کک

(حجاج بن یوسف کی کامیابی کا راز یہی تھا!)

صادق قریشی، ٹاپسی، شہباز اور توقیر شاہ

سرکاری ملازم کو سرکاری ملازم ہی رہنا چاہیے، سیاستدانوں سے دوستیاں نہیں نبھانی چاہئیں۔ نواب صاحب حسین قریشی جب وزیراعلیٰ (پنجاب) بنے، تو بھٹو صاحب کا شکریہ ادا کرنے گئے۔ بھٹو صاحب کہنے لگے: ''تم ہر شام ایک سی ایس پی آفیسر جاوید اکرم ٹاپسی کے ساتھ ہوٹل انٹرنیشنل میں شراب پیتے ہو۔ یہ غلط بات ہے۔ تم ان سرکاری افسروں کو نہیں جانتے، انھیں بلیک میل کرنے کا ڈھنگ آتا ہے۔ یہ کسی بھی وقت تمھیں غچہ دے سکتا ہے۔''

میاں شہباز شریف صوم وصلوٰۃ کے پابند ہیں۔ ان کے پرنسپل سیکرٹری، توقیر شاہ (ماڈل ٹاؤن فائرنگ فیم) کا تعلق سول سروس سے ہے۔ یہ لوگ حکمرانوں کو شیشے میں اتارنے کا فن جانتے ہیں۔ میں اسے اس وقت سے جانتا ہوں جب یہ سی ایم سیکرٹریٹ میں ڈپٹی

http://www.bookstube.net/

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

سیکرٹری تھا۔ ہر ملاقاتی کو مشکوک نظروں سے گھورتا۔ وقت سے پہلے ہی آن ٹپکتا کہ ملاقات کا وقت ختم ہو گیا ہے۔ ہر کوئی اس سے نالاں تھا لیکن یہ میاں صاحب کی آنکھ کا تارا تھا۔

جب میاں صاحبان جلاوطن ہوئے، تو اسے بطور سزا رورل ورکس پروگرام میں بہاولپور بھیج دیا گیا۔ میں وہاں کمشنر تھا۔ اکثر میرے پاس آ جاتا، مایوس، پشیمان اور افسردہ۔ میں اسے خندہ پیشانی سے ملتا۔ گزشتہ کئی برسوں سے میں اس سے نہیں ملا نہ اسے ''سلام'' کی حاجت رہی۔ عملیت پسند انسان اسی قسم کے ہوتے ہیں۔

(حرف حرف'' شوکت علی شاہ۔ ''نوائے وقت'' ۲۳ راگست ۲۰۱۴ء)

میاں طفیل محمد کا جنرل ضیا سے بات کرنے سے انکار

ایک دفعہ جنرل ضیا الحق کا فون آیا، تو میاں طفیل محمد (امیر جماعت اسلامی) کے سیکرٹری ابرار صاحب نے ان سے رابطہ کیا۔ جواباً میاں صاحب نے فرمایا: ''اس جھوٹے سے کہو کہ میں اس سے بات نہیں کرنا چاہتا۔''

غالباً یہ آواز جنرل صاحب کے کانوں میں بھی پڑ گئی۔ انھوں نے پی اے سے کہا: ''اچھا، کوئی بات نہیں۔ میں ان سے پھر بات کر لوں گا۔''

(''روشنی کا سفر'' محمد فاروق شیخ۔ ''ایشیا'' ۴ تا ۱۰ ردسمبر ۲۰۱۴ء)

پاکستانی وزیرِ دفاع کی مونچھیں لندن میں

صدر جنرل ضیا الحق کے دور میں میر علی احمد خاں تالپور وزیر دفاع تھے۔ جنرل صاحب انھیں برطانیہ کے دورے پر لے گئے۔ صدر صاحب کی پریس کانفرنس کے دوران ایک صحافی نے میر علی احمد خاں تالپور سے کہا: ''آپ پاکستانی کے وزیر دفاع ہیں، کچھ آپ بھی بولیے۔''

اس پر وزیر دفاع نے کہا: ''جو کچھ پوچھنا ہے صدر صاحب سے پوچھو۔ مجھے تو یہ اس لیے، ساتھ لائے ہیں کہ میری بڑی بڑی مونچھیں ہیں۔''

(سیاست نامہ'' اثر چوہان۔ ''نوائے وقت'' ۲۶ ستمبر ۲۰۱۴ء)

میر علی احمد خاں تالپور

صدر ضیا الحق بھانجے میاں طفیل کے؟

جماعت اسلامی کے سابق سیکرٹری اطلاعات صفدر چودھری ایک انٹرویو میں کہتے ہیں: میں نے ایک بار میاں طفیل محمد سے کہا ''لوگ صدر ضیا سے آپ کا ماموں بھانجے کا رشتہ جوڑتے ہیں۔ اگر کہیے تو میں اخبارات میں آپ کی طرف سے تردید چھپوا دوں؟

میاں صاحب کہنے لگے ''اس کی ضرورت نہیں۔ صدر ضیا کی والدہ ہمارے گاؤں (رائے پور ریاست کپورتھلہ) سے بیاہ کر گئی تھیں۔ گاؤں کی بیٹی سب کی بیٹی یا بہن ہوا کرتی تھی، اس لحاظ سے ضیا الحق ہمارے بھانجے کہلا سکتے ہیں۔ لوگ کہتے رہیں، اس میں حرج کیا ہے۔''

(انٹرویو صفدر چودھری از قلم فرزانہ چودھری۔ نوائے وقت'' سنڈے میگزین ۲۰۱۴ء۔)

http://www.booksstube.net

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

جب اُسے دکھائی پڑ گئی

لچک

اپنی تشنہ خواہشوں اور دوسرے کی مجبوریوں
کے تانے بانے سے بُنی
ایک ڈرامائی معاشرتی کتھا

سلمیٰ اعوان

سچی بات ہے، لڑاؤ اور حکمرانی کرو کبھی میری پالیسی نہیں رہی۔ ایک بڑے تعلیمی ادارے میں گزشتہ پندرہ سال سے بطور پرنسپل کام کر رہی ہوں۔ سو کے قریب اساتذہ میری زیرِ نگرانی کام کرتے ہیں۔ میں نے اپنے آپ کو ان کی خوشیوں اور غموں میں ہمیشہ شامل رکھا ہے۔ کسی نے میرے پاس آکر آنسو بہائے، تو میں نے اس کی اشک شوئی کی، دلاسا دیا، حوصلہ بڑھایا۔ اگر کوئی خوشی کی خبر سنانے آیا، تو میں نے بھی مسکراہٹیں بکھیریں۔ اساتذہ کے جھگڑوں کو پیار اور محبت بھری ڈانٹ سے نپٹایا۔ یقیناً یہ میرا طرزِ عمل ہے کہ ٹیچریں مجھ سے اپنے دُکھ سکھ کہنے میں کوئی عار نہیں سمجھتیں۔

یہ بڑی گرم دوپہر تھی۔ لُو کے تھپیڑوں نے میرا چہرہ جُھلسا دیا تھا۔ میں آخری راؤنڈ سے فارغ ہو کر دفتر میں آ بیٹھی۔ سوچ رہی تھی کہ ذرا اس فائل کو دیکھوں جس میں انتظامیہ کے ساتھ ہونے والی میٹنگ کی رپورٹ نتھی تھی۔ ابھی رپورٹ پڑھنی شروع کی ہی تھی کہ مس تہمینہ دفتر میں داخل ہوئی۔

تہمینہ مخلص، ہمدرد، عام سے نقش و نگار والی لڑکی

www.pdfbooksfree.pk

ہے۔ایم اے بی ایڈ تک تعلیم ہے۔گھریلو پس منظر اچھا ہے۔ چھوٹا سا خاندان جس میں دو بہنیں، ایک بھائی' ماں اور باپ شامل ہیں۔باپ نے ریٹائرمنٹ کے بعد اپنا گھر خریدا۔معاشی حالات بس عام سے ہیں۔ زندگی سکون سے گزر رہی ہے۔بس اگر پریشانی ہے' تو تہمینہ کے لیے موزوں رشتے کی! عمر تیس کے قریب ہے' مگر نک سک سے آراستہ رہنے اور اپنا خیال رکھنے کی وجہ سے کم عمر لگتی ہے۔

وہ میرے سامنے آ کر بیٹھ گئی۔آج صبح سے میں نے اسے نہیں دیکھا تھا۔اب بغور دیکھا' تو کچھ پریشان سی نظر آئی۔

''کوئی بات؟ پریشان لگتی ہو۔'' میں نے نرمی سے پوچھا۔

''میڈم مجھے کچھ رقم کی ضرورت ہے۔''

''کتنی چاہیے؟''

''یہی کوئی پچاس ہزار روپے۔بس دو تین ماہ میں لوٹا دوں گی۔''

پچاس ہزار اچھی معقول رقم تھی۔میں نے ذرا گہرائی میں اترنا مناسب خیال کیا۔''کہاں ضرورت ہے؟''

اس کے تفصیلی جائزے سے مجھے محسوس ہوا کہ وہ کچھ گومگو کی کیفیت میں ڈوبی ہوئی ہے۔''کھل کر بات کرو۔ میں تمہاری باس ہی نہیں بہن بھی ہوں۔ٹھیک مشورہ دوں گی۔''

اس نے بتانا شروع کیا: ''ہمارے پڑوسی شیخ اقبال احمد کے دو بچے ہیں: توصیف اور نجمہ۔ توصیف میڈیکل کے تیسرے سال میں ہے۔ نجمہ فائن آرٹس میں ایم اے کر رہی ہے۔ بہت گھلنے ملنے والے نہیں، بس کبھی کبھار آنا جانا ہوتا ہے یا آتے جاتے آمنا سامنا ہو' تو ہیلو ہائے ہوجاتی ہے۔

تین دن پہلے اماں ماموں کے گھر گئی ہوئی تھیں۔ بھائی ٹیوشن پڑھنے چلا گیا اور میں گھر میں اکیلی تھی۔کبھی کبھی اکیلا پن بھی کیسی اُداسی پیدا کر دیتا ہے؟انسان ڈپریشن کا شکار ہوجاتا ہے۔میں نے کچھ وقت برآمدے میں پودوں کی کانٹ چھانٹ پر صرف کیا۔کچھ وقت گھر ہی میں ادھر اُدھر گھومنے پھرنے میں کاٹا اور بالآخر نجمہ کے گھر کی طرف قدم اٹھا دیے۔میں اپنی بوریت کم کرنا چاہتی تھی۔''

''میں گھر سے نکل کر ان کے دروازے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔دروازہ بند تھا۔ہاتھ گھنٹی پر جانے ہی والا تھا جب ایک سائیکل سوار لڑکے نے میرے پاس آ کر پوچھا :''توصیف احمد شیخ کا گھر یہی ہے؟''

''میں نے گھنٹی بجانے کے بجائے رخ پھیر کر اسے دیکھا۔۲۱،۲۲ برس کا کمزور سا لڑکا سامنے کھڑا تھا۔زرد چہرہ ،گال پچکے ہوئے، آنکھیں موٹی موٹی مگر اُداسی میں ڈوبی ہوئیں۔بے ترتیب سے بال۔لباس بھی عام سا تھا۔''یہی گھر ہے۔تمہیں کیا توصیف سے ملنا ہے؟'' یہ کہہ میں نے اُس کے جواب کا انتظار کیے بغیر گھنٹی پر انگلی رکھ دی۔ساز بجا اور دروازہ کھل گیا۔سامنے ملازمہ کھڑی تھی۔نجمہ اور توصیف کے بارے میں پوچھا۔دونوں گھر پر تھے ۔میں نے اندر جاتے ہوئے ملازمہ سے کہا۔''توصیف کو بتادو کہ اُسے کوئی ملنے آیا ہے؟''

''نجمہ اپنے کمرے میں تھی۔میں کچھ سوچ کر وہیں چلی گئی۔وہ غالباً چائے پینے لگی تھی۔ٹرالی سامنے رکھی تھی۔کمرا ٹھنڈا تھا اور ماحول بہت خوشگوار سا۔میں نے ڈھیٹ بن کر کہا:''میرا خیال ہے میں ٹھیک وقت پر آئی ہوں۔''

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

دیرینہ ساتھی

ناول نگار، افسانہ نگار اور سفرنامہ نگار سلمیٰ اعوان ۱۳ر ستمبر ۱۹۴۳ء کو ضلع جالندھر (ہندوستان) میں پیدا ہوئیں۔ قیام پاکستان کے بعد مع والدین لاہور چلی آئیں۔ داتا کی نگری کے علاوہ شہر مساجد، ڈھاکہ سے بھی تعلیم پائی۔ لکھنے پڑھنے کا شوق بچپن سے تھا۔ پہلا ناول "صاحبہ" ۱۹۶۴ء میں شائع ہوا۔ اب تک چار ناول، دو افسانوی مجموعے اور سات سفرنامے شائع ہو چکے۔ لکھنے پڑھنے کے علاوہ ایک اسکول کا انتظام بھی سنبھال رکھا ہے۔ معاشرتی مسائل آپ کی تخلیقات کا بنیادی موضوع ہیں۔ تحریر روانی اور جاذبیت ہے۔ لکھتے وقت مقصدیت اور سچائی کو مدنظر رکھتی ہیں۔ اردو ڈائجسٹ سے دیرینہ تعلق ہے جو ان شاء اللہ آئندہ بھی برقرار رہے گا۔

"آئیے آئیے۔"، نجمہ نے خاصی خوش دلی سے کہا۔

"بھئی گھر میں بور ہو رہی تھی۔ تھوڑے سے وقت کو خوش گوار بنانے آئی ہوں۔ اُمید ہے محسوس نہیں کرو گی۔"

"نجمہ نے جواباً خاصی فراخدلی سے کہا "ارے نہیں کیسی بات کرتی ہیں آپ۔ اکٹھے چائے پیتے اور تھوڑی سی گپ شپ بھی لگاتے ہیں۔"

"چائے پی اور گپ شپ کی۔ نجمہ نے یونیورسٹی کے لطیفے سنائے اور میں نے بھی اسے اسکول کی باتیں۔ تھوڑی سی بات چیت فلم اور ٹی وی پر ہوئی اور گھنٹا گزر گیا۔ میں نے وقت دیکھا اور کھڑی ہو گئی۔ نجمہ نے کچھ دیر اور بیٹھنے کا کہا، مگر میں نے معذرت کرتے ہوئے بتایا "گھر میں کوئی نہیں، نوکر بھی نہیں، ایسے ہی کھلا چھوڑ آئی ہوں۔ اماں آ گئیں تو بولیں گی۔"

"جب میں دروازے سے نکلی اور اپنے گھر کی جانب دو چار قدم ہی اٹھائے تھے تو وہی لڑکا میرے سامنے آ گیا۔ میں نے قدرے حیرت سے اسے دیکھا۔ اس وقت سورج ڈوب چکا تھا اور ہلکا ہلکا اندھیرا چھیلا ہوا تھا۔ ہماری گلی میں مرکری ٹیوبیں نہ ہونے کی وجہ سے اندھیرا وقت سے پہلے ہی چھانے لگتا ہے۔ "میں آپ سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"مجھ سے۔" حیرت میری آنکھوں میں نمایاں تھی۔

"جی میں، توصیف کا ہم جماعت ہوں۔" گویا وہ میڈیکل کا اسٹوڈنٹ تھا۔ اس سے بات کرنے میں قطعی ہرج نہیں۔ میں نے سوچا۔

"بات لمبی ہے، تو گھر آ جاؤ۔" میں نے گھر کی طرف قدم بڑھا دیے۔ وہ سائیکل دروازے کے پاس کھڑا کرنے لگا، تو میں نے کہا "اسے اندر لے آؤ، کوئی اٹھا سکتا ہے۔" سیاہ دروازے کا ایک پٹ میں نے کھول دیا۔ اس نے سائیکل دیوار کے ساتھ لگائی۔ جب تک وہ فارغ نہ ہوا، میں اس کے قریب کھڑی رہی۔

"حلیے سے وہ کسی غریب کا لگتا تھا۔ ڈرائنگ روم میں صوفے پر بیٹھ کر میں نے بغور اسے دیکھا اور پوچھا۔ "کہو کیا بات ہے؟"

"مجھے میٹرک یا ایف ایس سی کی کوئی ٹیوشن دلانے میں آپ کچھ مدد کر سکتی ہیں؟"

"توصیف کے پاس تم اسی کام سے آئے تھے؟" میں نے پوچھا۔ "جی نہیں، اس کے پاس میں کسی اور کام سے آیا تھا۔"

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

"کیا کام تھا وہ؟" میں جاننا چاہتی تھی۔ تب مجھے احساس ہوا جیسے وہ تذبذب میں پھنس گیا ہے کہ کہے یا نہ کہے۔ میں خاموش بیٹھی اسے دیکھ رہی تھی۔ تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد وہ بولا: "غریبی بھی بہت بڑی لعنت ہے۔ میں اپنی دو سالہ بیاہی بیوہ ماں کا اکلوتا بیٹا ہوں۔ پڑھنے میں بہت لائق ہوں۔ ہمیشہ وظیفہ لیا۔ میڈیکل کرنا میری بہت بڑی تمنا ہے۔ ٹیوشنوں اور وظیفوں کے بل پر ڈاکٹری کی لائن میں تو آ گیا، مگر اس کے بیشمار اخراجات برداشت کرنا اب میرے لیے بہت مشکل ہو رہا ہے۔ بیس ہزار روپے کسی واقف کار سے پکڑے تھے، کتابوں کی ضرورت تھی۔ دوسرے سال میں نے ٹیوشنیں نہیں لیں۔ پہلے سال وقت بہت ضائع ہو گیا اور اپنی پوزیشن قائم نہیں رکھ سکا۔ چناں چہ ان پیسوں سے ضروریات پوری کرتا رہا۔ اب اس نے ناک میں دم کر دیا ہے کہ میرے پیسے واپس کرو۔ میں توصیف کے پاس رقم لینے آیا تھا مگر اس نے معذرت کر دی۔"

تہمینہ نے پھر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور کہا "یہ روپے مجھے متین کو دینے ہیں۔ ایک ہفتہ کا وعدہ کیا تھا میں نے۔ میرے خیال میں متین جیسے ہونہار نوجوان کی مالی اعانت کرنا نیکی ہی نہیں اس ملک کی بھی خدمت ہے۔"

مجھے تہمینہ کے نظریے سے بالکل اتفاق تھا، مگر میں اُسے دیکھنا چاہتی تھی۔ اپنی اس خواہش کا اظہار کیا، تو وہ بولی۔ "میں کہہ دوں گی وہ آپ سے مل لے۔"

اگلے دن میں نے رقم بینک سے نکلوا کر اُسے دے دی۔ تہمینہ اور متین کے درمیان طے پا گیا تھا کہ وہ اسے رقم دینے میڈیکل کالج سے متصل اسپتال آئے گی۔

گیارہ بجے وہ اسکول سے چھٹی لے کر چلی گئی۔ متین اسی جگہ اس کا منتظر تھا۔ اسے دیکھتے ہی کھل اٹھا۔ دونوں ایک دوسرے کے سامنے خاموش کھڑے تھے۔ تہمینہ نے پرس سے رقم کا لفافہ نکالا۔ اس کی طرف بڑھایا اور آہستہ سے کہا "اسے قرض مت سمجھنا۔ یہ مدد ہے ایک انسان کی دوسرے انسان کو، آئندہ بھی جہاں تک ممکن ہو سکا میں تمہارے لیے کچھ کرتی رہوں گی۔ ٹیوشنوں کے چکر چھوڑ کر اپنی تعلیم کی طرف توجہ دو۔"

معلوم نہیں یہ جذبہ ممنونیت کی انتہا تھی یا وہ صورت حال سے اس درجہ متاثر تھا کہ اس سے ایک لفظ بھی نہ بولا گیا۔ تہمینہ کو اس کی آنکھوں میں نمی سی محسوس ہوئی۔ ہونٹ بھی پھڑپھڑانے لگے تھے۔ وہ ایک ٹک تہمینہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے گھبرا کر اسے دیکھا اور بولی "کیا بات ہے متین؟"

"مجھے یقین نہیں آ رہا،" اس نے بے بسی سے کہا۔

"یقین نہ آنے والی کون سی بات ہے؟ آخر انسان ہی ایک دوسرے کا دُکھ بانٹتے ہیں۔ جانور تو آ کر احوال پُرسی کرنے سے رہے۔"

وہ اسے کینٹین لے گیا جہاں اس نے تہمینہ کو چائے پلائی اور یہ پوچھا کہ ضرورت پڑنے پر وہ اسے کہاں مل سکتا ہے؟ تہمینہ نے اسے اسکول کا پتا بتایا اور مجھ سے ملنے کو بھی کہا۔

یہ اکتوبر کے خوشگوار دن تھے۔ دفتر کے سامنے چھوٹے سے باغیچے میں گلاب کے پھول مسکرا رہے تھے۔ میری نظریں دیر سے ان پر جمی ہوئی تھیں۔ ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکوں سے وہ دائیں بائیں لہرتے خوبصورت لگ رہے تھے۔ میری محویت "میں اندر آ سکتا ہوں؟" کے جملے سے ٹوٹ گئی۔ ایک نوجوان سا لڑکا میرے سر کو اثبات میں ہلتے دیکھ کر اندر آ گیا۔ آتے ہی اس نے سر کو قدرے

http://www.bookstube.net/

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

جھکایا اور بولا ''میں متین احمد ہوں۔ مس تہمینہ نے شاید میرا ذکر آپ سے کیا ہو۔''

میں نے یکدم خوش ہوکر کہا ''اچھا اچھا' تو آپ متین ہیں بیٹھیے۔''

وہ کرسی کھینچ کر میرے سامنے بیٹھ گیا۔ میں نے گہری تنقیدی نگاہ اس پر ڈالی۔ اس کی آنکھیں موٹی موٹی سی تھیں' مگر معلوم نہیں مجھے عجیب سی لگیں۔ چہرہ معصومیت بھرا نہیں تھا۔ میں کچھ پریشان سی ہوگئی۔ یہ حقیقت ہے کہ کسی انسان کے بارے میں اتنی جلد فیصلے نہیں کرنے چاہئیں۔ انسانی ذات کی اتنی تہیں ہیں کہ بعض اوقات برسوں ساتھ رہ کر بھی اصلیت کا پتا نہیں چلتا۔ پھر بھی میں جو عمر کی درمیانی منزل میں ہوں' چہرے سے شخصیت کے متعلق تھوڑا بہت جاننے کا دعویٰ ضرور رکھتی ہوں۔ اس کے چہرے نے مجھے متاثر نہیں کیا۔ یہ اور بات ہے کہ اس کی باتیں حقیقت پسندانہ تھیں۔ ان میں غم کی جھلک تھی اور حوادث سے نپٹنے کا عزم بھی۔

میں نے تہمینہ کو بلوا لیا۔ میرا خیال اسے چائے پلانے کا تھا' مگر تہمینہ کی موجودگی میں! تہمینہ جوں ہی کمرے میں داخل ہوئی' متین کو دیکھتے ہی اس کے ہونٹوں اور رخساروں پر گلاب سے کھل اٹھے۔ جس انداز میں اس نے متین کو دیکھا' وہ مجھے یہ سمجھانے اور بتانے کو کافی تھا کہ تہمینہ ہمدردی سے آگے بڑھ چکی۔ میں نے متین کے چہرے پر جو کچھ بکھرا دیکھا' اُس سے صرف یہی جان سکی کہ وہاں مسکراہٹ ضرور تھی مگر سنجیدہ سی۔

تھوڑی دیر بعد اُس نے رخصت چاہی۔ تہمینہ اس کے ساتھ ہی باہر نکل گئی۔ میں نے کھڑکی کے شفاف شیشے میں سے دیکھا' دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ خاموش سا یہ انداز دید محبت کی چغلی کھاتا تھا۔ مجھے قدرے حیرت بھی تھی کہ تہمینہ اچھی بھلی سمجھ دار لڑکی کیسے بیوقوف بن گئی؟ اسے اپنی اور اس کی عمروں کے درمیان فرق کا احساس نہیں۔ یہ اسے مالی لحاظ سے اسپورٹ کرتی رہے گی اور وہ اسے بیوقوف بناتا رہے گا۔ ڈاکٹر بن کر کسی خوبصورت لڑکی سے بیاہ رچالے گا اور یہ بیٹھی قسمت کو روئے گی۔

اسے رخصت کرنے کے بعد تہمینہ میرے پاس ہی آ گئی اور آتے ہی پوچھا ''کیسا لگا آپ کو متین؟''

''اچھا ہے۔'' میں نے قدرے توقف سے کہا۔ اور پھر اُسے اپنی جانب متوجہ کرتے ہوئے کہا ''تہمینہ دیکھو' میں ایک بات تم سے ضرور کہنا چاہتی ہوں۔ انسانی فطرت مطلب برآری کے لیے گدھے کو بھی باپ بنانے سے نہیں چوکتی۔ ایسا نہ ہو کہ تم ہمدردی کی لپیٹ میں اپنا آپ لٹاتی رہو اور وہ ایک دن احسان فراموشی کی داستان بن کر تمہارے سامنے آ جائے۔ تب تم دکھ اور کرب کی جس منزل سے گزرو گی' اس کا اندازہ مجھے ابھی سے ہو رہا ہے۔''

> آخر انسان ہی ایک دوسرے کا دُکھ بانٹتے ہیں۔ جانور تو آ کر احوال پرسی کرنے سے رہے۔''

اس نے میرے ان خدشات کے جواب میں کچھ نہ کہا' بس سر جھکائے چپ چاپ میری باتیں سنتی رہی۔ جب بریک کی گھنٹی بجی' تو وہ اٹھ کر چلی گئی۔

خاصے عرصے تک مجھے کچھ پتا نہ چل سکا' مگر ایک بات میں نے ضرور محسوس کی تھی کہ تہمینہ کمزور ہوتی جا رہی ہے۔ اس کے چہرے کا رنگ زرد تھا۔ حالانکہ مجھ سے قرض لی ہوئی رقم تہمینہ وعدے کے مطابق لوٹا چکی تھی۔ ایک دو بار میں نے اس سے وجہ پوچھنی چاہی' مگر وہ ٹال گئی۔ ایک دن اتفاق سے جب میں ٹیچروں کے پاس

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

بیٹھی تھی کہ تہمینہ زیر بحث آ گئی۔ بیگم رحمان نے تنگ کر میرے اس اندیشے کی تصدیق کر دی ''تین ٹیوشنیں تو وہ اسکول ختم ہونے کے بعد پڑھاتی ہے۔ تین چار بچوں کے گھر بھی جاتی ہے۔''

یہ سن کر جیسے میرے دل پر گھونسہ پڑا۔ میں سمجھ گئی کہ وہ اس مشقت کی چکی میں کس لیے پس رہی ہے؟ میں خاموش رہی۔ بیگم رحمان غالباً منتظر تھی کہ میں اظہار حیرت کروں، تو وہ حقیقت سے پردہ اٹھائے۔ میں اپنی سوچ میں گم تھی جب اس نے کہا ''کسی ڈاکٹر کے پیچھے لگی ہے۔ اُسے پڑھا رہی ہے۔'' ساتھ ہی طنزیہ سا قہقہہ فضا میں اُچھال دیا۔

''احمق! جب وہ غچہ دے گا، تو بیٹھی قسمت کو روئے گی۔''

میں خاموش رہی، تبصرے کرنا مجھے قطعی پسند نہیں۔

ایک دن میں نے مسکراتے ہوئے ٹوہ لینے کی خاطر تہمینہ سے کہا ''میرا خیال ہے تم محبت کر بیٹھی ہو۔'' میں نے موضوع کی تلخی کو مسکراہٹ کی آڑ دی۔

اس نے شرمانے یا سر جھکانے کے بجائے سکون سے کہا ''شاید اسی کا نام محبت ہے۔ مجھے متین اچھا لگنے لگا ہے۔''

''مگر وہ تم سے شادی کر لے گا؟''

''بیگم محسن! شادی بیاہ تو مقدر کی بات ہے۔ میں نے اگر اسے مالی اعانت دی یا دے رہی ہوں تو یہ عوض نہیں۔ مجھے اس کی مدد کر کے خوشی ہوتی ہے۔ اس بار متین نے ٹاپ کیا ہے۔''

میں نے دل میں سوچا۔ کتنا بڑا دل رکھنے والی لڑکی ہے۔ خدا کرے خوش رہے۔

متین کے ساتھ اس کی دوستی اب ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ سب لوگ جان گئے تھے۔ بیشتر کا نظریہ مجھ سے ملتا جلتا تھا۔

جس دن متین ڈاکٹر بنا، تہمینہ نے بہت شاندار پارٹی دی۔ سبھی ٹیچروں کا اصرار تھا کہ وہ متین کو بھی بلائے، چناں چہ وہ آیا۔ اس نے پنجاب کے میڈیکل کالجوں میں نمایاں پوزیشن حاصل کی تھی۔ میں نے کافی مدت بعد اُسے دیکھا، وہ خاصا صحت مند اور اچھا لگ رہا تھا۔

بیگم رحمان نے اس سے پوچھا ''شادی کب کرو گے؟''

''ابھی تو کوئی پروگرام نہیں جی۔ پہلے ہاؤس جاب کرنا ہے۔ پھر باہر جانے کے لیے وظیفہ متوقع ہے۔''

سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ تہمینہ نہایت سکون سے پیالیوں میں چائے ڈالنے اور مہمانوں کو پیش کرنے میں مصروف تھی۔ اس کے اندر کوئی طوفان برپا تھا یا وہ پرسکون تھی، کوئی نہیں جانتا تھا۔

متین چلا گیا، تو ایک دو استانیاں یہ کہے بغیر نہ رہ سکیں کہ ''تہمینہ ریت سے گھر بنانے کی کوشش کر رہی ہو۔''

وہ ہنستے ہوئے بولی ''میں نے تو گھر بنانے کا سوچا ہی نہیں، تم بلاوجہ پریشان ہو۔ گھر اوپر والا بناتا ہے۔ چاہے گا، تو جو بنیاد میں نے رکھی، اس پر بن جائے گا۔ اگر نہیں، تو میں بجری، سیمنٹ اور سریا لے کر بھی نہیں بنا پاؤں گی۔''

☆☆

بہار کی ایک رنگوں سے بھری صبح وہ بہار کی طرح کلائی اور بازوؤں تک مہندی کے پھول پتیوں سے سجی قیمتی زرتار جوڑا پہنے اور پھولوں کے زیورات سے لدی پھندی اسکول میں آئی اور متین سے اپنے نکاح کی دھماکا خیز خبر سنائی۔ ہم سب کے چیخنے اور چلانے پر اس نے معذرت بھرا اظہار کیا کہ بس سادگی سے نکاح ہوا ہے باہر سے تو کوئی مدعو ہی نہیں تھا۔

بہرحال یہ خوشی کی بات تھی۔ اس کی بے کیف سی

http://www.bookstube.net

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

زندگی میں خوشیوں کے رنگ تو کھل گئے۔ ایک سال بعد بچہ آ گیا۔ وہ واقعی بہت خوش تھی، مسرور و مطمئن اور سرشار سی۔ اس کے بعد متین مزید پڑھنے انگلینڈ چلا گیا۔ پانچ سال بعد واپس آ کر اُس نے گلبرگ میں ایک شاندار اسپتال اور گھر بنایا۔ تہمینہ نے ملازمت چھوڑ دی اور اسپتال کی منتظمِ اعلیٰ کی ڈیوٹی سنبھال لی۔

انسانوں کو پرکھنے، پڑھنے اور انھیں جانچنے کے میرے سارے دعوے غلط نکلے۔ ہم سب کا خیال تھا کہ تہمینہ بختاور اور قسمت کی دھنی ہے۔ مقدر نے اُس کا بہت ساتھ دیا۔

☆☆

یہ جاتی سردیوں کے دن تھے۔ میرے بچے چینی کھانے کے لیے ضد کر رہے تھے۔ میں انھیں لیے ایک چینی ریستوران میں چلی گئی۔ بڑا خوابناک سا ماحول تھا۔ بہت زیادہ لوگ نہیں تھے۔ میں میزوں کے گرد بیٹھے لوگوں کا جائزہ لے رہی تھی۔ ذرا فاصلے پر کونے میں ایک نوجوان چہرے نے مجھے فی الفور اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ لڑکی کا حسن نیم اندھیرے میں لشکارے مار رہا تھا۔ بار بار میری نظریں اس کی طرف اُٹھتیں۔ مجھے تجسس سا تھا کہ ساتھ بیٹھا مرد کیسا ہے؟

دونوں جب اٹھے، تو میں ششدر رہ گئی۔ وہ متین تھا۔ بہت وجیہہ لگ رہا تھا۔ دُبلا پتلا جسم اب بھر گیا تھا۔ باہر کی تعلیم و تربیت نے اُسے بنا سنوار دیا تھا۔ دونوں اپنی ترنگ میں میرے قریب سے گزرتے چلے گئے۔ تو میرے خدشات درست تھے! انسانوں کے بارے میں میری جانچ کچھ ایسی بھی غلط نہ تھی۔

اگلے دن میں نے تہمینہ کو فون کیا۔ ایک دُکھ بھری جھجک آمیز تشویش میرے لب و لہجے سے ہویدا تھی۔ لیکن تہمینہ کی باتیں سن کر میں حیران رہ گئی۔

''بیگم محسن!'' اُس کی آواز میں طمانیت سے لبریز محبت بھرا رچاؤ تھا۔ ''وہ ثمرہ تھی۔ متین کے بچپن والے انتہائی بُرے دنوں کی ساتھی۔ اُس کی محبت، اُس کی بیوی!''

میں سناٹے کی سی کیفیت میں آ گئی۔ وہ چند لمحوں کے لیے رکی، پھر سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے بولی ''ثمرہ کے متعلق تو اُس نے پہلی چند ملاقاتوں میں ہی بتا دیا تھا۔ بیگم محسن! جب تیس سال کی ایک سمجھ دار، پختہ عمر کی، اپنے مستقبل سے مایوس لڑکی نو سال چھوٹے لڑکے سے اس کی مجبوریوں اور اپنی تشنہ خواہشوں کے تانے بانوں سے رشتہ بننے لگے، تو سمجھوتے کی لچک بھی ساتھ رکھتی ہے۔ متین کی بیوہ ماں ثمرہ کے گھر ملازمہ تھی۔ اُن کی جھوٹن سے اپنا اور بچے کا پیٹ بھرتی۔ ثمرہ کا گھر ماں کی وہ پناہ گاہ تھی جہاں اُس نے اپنا وقت عزت و آبرو سے کاٹا۔ دونوں ہم عمر تھے اور جلد ایک دوسرے کو چاہنے لگے۔ لیکن متین میرے خلوص اور قربانیوں سے بھی متاثر تھا اور میری زندگی میں خوشیاں بکھیرنے کا آرزومند...... مگر وہ ثمرہ کی محبت کی ڈوریوں میں بندھا ہوا تھا۔ میں سوچتی رہی اور بالآخر ایک نتیجے پر پہنچ گئی۔

''متین دو کشتیوں میں پیر رکھ بیٹھا تھا، مگر میری دانش مندی نے اُسے ڈوبنے نہیں دیا۔ برطانیہ جانے سے قبل میں نے ثمرہ سے اس کا نکاح کروا دیا۔ پانچ سال وہ میرے زیرِ سایہ رہی۔ بہت اچھی لڑکی ہے۔''

میں ہونقوں کی طرح منہ کھولے اور آنکھیں پھاڑے سب سنتی رہی۔ آخر میں یہ کہے بغیر نہ رہ سکی ''تمھیں کچھ محسوس نہیں ہوتا؟''

وہ کھلکھلا کر ہنسی اور بولی ''ارے بیگم محسن، میں تو اُس کے سارے نظام کی 'خالق' ہوں۔ مجھے تسکین دینے کو یہی بات کافی ہے۔''

◆◆◆

http://www.bookstube.net/

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

زندگی کی بیلنس شیٹ سے نکلے

ایک سو اکیاون روپے

ایک قانع مزاج شخص کا روح پرور فسانہ'

وہ خود کو تہی دست کر کے ساری عمر دوسروں میں خوشیاں بانٹتا رہا

محمد حامد سراج

کمرے کے شمال مغربی کونے میں ابا جان کا پلنگ بچھا تھا اور سرہانے کی سمت دیوار پر تیل کا نشان! وقت کی دھول سے اس کا رنگ مٹیالا ہو چلا تھا۔ ابا جان اخبار اور رسائل پڑھتے ہوئے اپنا سرخ کڑھائی والا عربی رومال سر کے نیچے رکھ لیتے۔ باقاعدگی سے بالوں میں تیل لگانے کے باعث دیوار پہ سر کی پشت کا نشان پڑ گیا تھا۔ ایک دن انھوں نے پلنگ کی جگہ بدلی تو بہت نرمی اور آہستگی سے اس نشان کو چھو کر دیکھا۔ ان کی آنکھیں نم ناک ہو گئیں۔ بیٹی قریب ہی کھڑی تھی۔ پوچھنے لگی ''ابو! آپ کیوں رو رہے ہیں؟''

''بیٹا...... یہ دیکھو، دادا ابو کی نشانی۔ ان کا پلنگ ہمیشہ اسی کونے میں رہتا تھا۔ وہ چیزوں کی ترتیب بار بار بدلنے کے قائل نہیں تھے۔''

''ابو! آپ کو بھی دادا جان اسی طرح اچھے لگتے ہوں گے جیسے آپ ہمیں؟'' بیٹی نے معصومیت سے پوچھا۔

''جی بیٹا......!''

انھوں نے پھر نشان کو اسی محبت، عقیدت اور احترام سے چوما جیسے باپ کی پیشانی

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

کو سفرِ آخرت کے وقت بوسہ دیا تھا۔ آنکھ کے کونے پر ٹھہرے آنسو شہادت کی انگلی سے سمیٹتے ہوئے بولے، ''بیٹا! تمھارے دادا بہت عظیم تھے۔''

''ابو! آپ نے اسی لیے دادا کی جوتی، جرابیں، پرفیوم، عطر، گھڑی، کپڑے، قراقلی ٹوپی، سگریٹ لائیٹر، سگریٹ کیس اور بندوق سنبھال رکھی ہے؟''

''بیٹا! اس خزانے میں اب بندوق نہیں۔''

''کیوں ابو......؟''

''جب تمھارے دادو کو جگر کا سرطان ہوا تھا نا، اس وقت مالی مسائل کی وجہ سے اسے چودہ ہزار روپے میں بیچ دیا۔ اتنی قیمتی متاع میں نے کوڑیوں کے مول بیچ دی...... صرف چودہ ہزار۔''

''ابو! وہ ہماری دادو سے زیادہ قیمتی تو نہیں تھی نا؟'' بیٹی نے کہا۔

''بیٹا! ماں باپ کی ہر چیز، باتیں، یادیں، دوست احباب، ان کی استعمال شدہ چیزیں، گھر اور قبریں تک انمول ہوتی ہیں۔''

اس کی بیٹی ماں کے آواز دینے پر باہر چلی گئی۔

بیٹی پوچھ رہی تھی، ابو جب یہ کمرا پینٹ ہوا، تو یہ نشان مٹ جائے گا؟ ''بیٹی ٹھیک ہی تو کہتی ہے۔ یہ نشان باقی رکھنے کے لیے کمرا پینٹ ہی نہ کرایا جائے۔'' انھوں نے سوچا۔

ان کے والد جس عجلت سے زندگی کے مسائل نمٹاتے تھے، اسی تیزی سے انھوں نے آخرت کا سفر اختیار کر لیا۔ حیران کن بات یہ تھی کہ والد خوابوں میں انھیں تواتر سے ملتے رہے۔ کوئی ایک بھی ایسا نہیں تھا جسے خواب کہا جا سکے، سب پر حقیقت کا گماں گزرتا۔ وہی اجلا لباس، قراقلی ٹوپی، واسکٹ، جوتیوں کی چمک۔ زمینوں کی دیکھ بھال کے لیے ایک کھال پر کبھی دوسرے کھال پر، کبھی سنبل اور شیشم کے درختوں کے درمیان، بیٹے سے سوال کرتے ہوئے ''میرے جانے کے بعد تمھیں کوئی تکلیف تو نہیں......؟'' کیا ماں باپ مر جانے کے بعد بھی زندہ ہوتے ہیں، خبرگیری کرتے ہیں......!

اعجاز صاحب کا تعلق سفید پوش اور متوسط گھرانے سے تھا۔ والد کی طرح سادگی کا بے مثال نمونہ تھے۔ گھر میں تہبند باندھتے، کرتہ اور سر پر سرخ کڑھائی والا رومال لپیٹ لیتے۔ ۱۲۰ ایکڑ زمین تھی۔ گھر میں خوش حالی تو نہ تھی لیکن عسرت نے بھی ڈیرے نہیں ڈالے۔ صبح موٹر سائیکل پر قریبی شہر اپنے کاموں سے نکلتے تو اجلے کپڑے پہن کر، سر پر قراقلی ٹوپی لیتے اور چشمہ لگاتے۔ مزاج انتہائی نفیس۔ صحت قابلِ رشک تھی۔ عمر کے پچاسویں سال بھی جوان نظر آتے۔

زندگی میں نہ کبھی کسی کے سامنے مسائل کا رونا رویا اور نہ ہی ہاتھ پھیلایا۔ قناعت کے بہت اونچے منصب پر فائز تھے جو کم ہی کسی کے نصیب میں آتا ہے۔ ماں یا بیوی کھانے کے دوران جو بھی سامنے لا کر رکھ دیتی، چپکے سے کھا لیتے۔ کبھی مین میخ نہیں نکالی۔ زندگی میں ایک بھی دن ایسا نہیں تھا جب انھوں نے کھانے پر اعتراض کیا۔ معترض ہونا ان کی فطرت میں تھا ہی نہیں۔ لگتا تھا، ان کا خمیر قناعت اور صبر کی مٹی سے گندھا ہے۔ سالن میں اگر مرچ نمک ذرا تیز ہوتی یا ذائقہ ان کے مزاج سے مطابقت نہ رکھتا، تو بیگم کو آواز دے کر بس اتنا کہتے، ''بی بی! دودھ کا گلاس لا دو۔''

گرمیوں میں باقاعدگی سے صبح ناشتے میں آم نچوڑ لیتے۔ اس میں چینی اور دیسی گھی ملاتے اور اسی سے ناشتا کرتے۔ یہ ان کا معمول تھا۔ گرمیوں کی دوپہر لسی اور مکھن

http://www.bookstube.net/

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

ضرور لیتے۔ کبھی کبھی مکھن میں شکر ملا لیتے۔ سردیوں میں بچوں کے لیے میوہ جات باقاعدگی سے لاتے۔

انھوں نے ٹریکٹر خریدا تو وہ عہد تھا جب علاقے میں کسی کے پاس یہ سہولت موجود نہ تھی۔ لوگ دور دور سے ٹریکٹر دیکھنے آئے۔ پہلا سائیکل اور موٹر سائیکل خریدنا بھی علاقے میں ان ہی کا مقدر ٹھہرا۔ ٹریکٹر کے آ جانے سے گھر میں خوش حالی آ گئی۔ زمین کی بجائی میں بھی آسانی ہوئی۔ بیوی رقم پس انداز کر بیٹیوں کے جہیز کے لیے چیزیں جوڑ جوڑ رکھنے لگی۔ ابو کے لباس، انداز اور طرزِ زندگی میں سرِموفرق نہ آیا۔ لوگ چہ مگوئیاں کرنے لگے کہ ٹریکٹر آنے سے ان کے گھر ہُن برسنے لگا ہے۔ غلے کے ڈھیر دیکھ کر حاسد حسد کی آگ میں جلتے۔ انھوں نے تعویذ گنڈے کا سہارا لے کر اس گھر کو برباد کرنے کی اپنی سی کوشش کر دیکھی۔ لیکن اللہ حفاظت کرے تو سانچ کو آنچ نہیں۔

ایک دن بیوی نے پوچھا ''ٹریکٹر آنے سے بہت زیادہ آمدن ہونے لگی ہے؟''

''نہیں بی بی، لوگوں کی باتوں پر کان نہ دھرا کرو۔ اللہ نے دال روٹی دے رکھی ہے۔ صبر شکر کیا کرو، سفید پوشی کا بھرم قائم ہے۔''

سفید پوشی کا بھرم قائم رکھنے کے لیے ہی بیٹیوں کی شادی پر ۱۵ ایکڑ زمین بک گئی تاکہ وہ اپنے سسرال میں آسودہ رہیں۔ چنیوٹ سے فرنیچر بنوایا۔ جس نے دیکھا، انگشت بدنداں رہ گیا۔ بیٹیوں کی رخصتی آن بان اور شان سے ہوئی۔

ان کی کل کائنات لکڑی کی ایک الماری اور چمڑے کا خاکستری رنگت والا صندوق تھا جس میں کبھی چار سے پانچ جوڑے کپڑے نہ ہوئے۔ واسکٹ کی تعداد ہمیشہ دو ہی رہی۔ بوسکی کا ایک کرتہ، تین چار عدد بنیان جن میں جیب لگے تھے، جن کو وہ ''پھتوئی'' کہا کرتے اور دو رومال۔

ایک دن بیوی نے پوچھا ''بیٹیاں تو اپنے گھر کو سدھاریں، بیٹے کے لیے کچھ پس انداز کیا ہے؟''

''تربیت اور تعلیم کے لیے جو مجھ سے بن پڑا، میں نے کمی نہیں کی۔ آگے اللہ مالک ہے۔''

''آپ اپنی آمدن مجھ سے چھپا کر رکھتے ہیں؟''

''نہیں بی بی، میں نے کبھی کچھ نہیں چھپایا۔ پہلے بھی کہا تھا، لوگوں کی باتوں پر کان نہ دھرا کرو۔ اب اب تو ہاتھ تنگ ہونے لگا ہے۔''

''ایک دوست کے ساتھ آپ نے اسی ہزار روپے کی رقم کاروبار میں لگا رکھی تھی، وہ کیوں نکلوا رہے ہیں؟''

''قرض بہت چڑھ گیا ہے۔''

''قرض اور آپ پر......؟''

''بی بی... تم نے دیکھا نہیں، ٹریکٹر بکا، ٹرالی، ہل، بلیڈ، تھریشر بھی بک چکے۔''

''رقم کہاں گئی......؟''

''تمھاری ضد کی بھینٹ چڑھ گئی۔ تمھارا اصرار تھا کہ بیٹیوں کا جہیز کسی پہلو سے کم نہ ہو۔''

مگر بیگم کو یقین تھا کہ تمام مسائل کے باوجود یقیناً کچھ نہ کچھ تو پس انداز کیا ہوگا۔ آخر لوگوں کی باتوں میں کچھ نہ کچھ تو صداقت ہو گی۔ گھر میں بھی کسی چیز کی کمی نہیں۔ بیوی نے سوچا ''یہ مجھ سے چھپا رہے ہیں۔''

اچانک ایک صبح قیامت گزر گئی۔ خون پیتی شاہراہوں پر وہ حادثے میں اپنی جان ہار گئے۔ پھر وہی مسائل کا سلسلہ...... معاشی تنگی...... قرض...... تفکرات......

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

الجھنیں......سوچیں......!

گھر میں بچوں کی طرح ان کی چوبی الماری اور چمڑے کا خاکستری صندوق بھی تنہا رہ گئے۔ وہی صندوق جس میں کبھی چار سے پانچ جوڑے نہ ہوئے۔

ان کی الماری ہمیشہ مقفل رہتی تھی۔ کسی کو بھی معلوم نہیں تھا اس میں کیا ہے......؟ موت کا پروانہ (ڈیتھ سرٹیفکیٹ) بنوانے کے لیے شناختی کارڈ کی ضرورت پڑی، تو بیوہ نے پہلی بار مقفل الماری کھولی۔

اس میں کیا تھا......؟ حساب کتاب کی ڈائری، زمینوں کے بہی کھاتے، عطر، پالش، برش، ٹریکٹر کی مرمت کے اوزار، پلاس، رنچ، چابیاں، پانے، ٹریکٹر کی بیٹری چارج کرنے والا آلہ، جوارش جالینوس، قراقلی ٹوپی، خاندانی خطوط، تصاویر اور کبھی مایوسی در آنے پر ڈائری میں لکھے چند اشعار...... سٹیمپ پیڈ، مہر اور...... تین بینکوں کی کیش بکس......

شناختی کارڈ اٹھا کر الماری پھر مقفل کر دی۔ کئی دن گزر گئے۔ گھر میں مالی مسائل ابھرنے لگے۔ ماں نے بیٹے کی پریشانیاں دیکھ کر ایک دن اسے اپنے پاس بلایا، پیار کیا، سمجھایا اور کہا ”بیٹا! تمھارے ابو بہت زیرک اور دانا انسان تھے۔ ایک نہیں تین بینکوں میں ان کا اکاؤنٹ ہے۔ یہ لو اکاؤنٹ نمبر اور جا کر بیلنس معلوم کر آؤ۔“

بیٹے نے ماں کی تسلی آمیز گفتگو اور چیک بکس دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا اور بینک کی راہ لی۔ تینوں بینکوں کی بیلنس شیٹ لیے واپس وہ گھر پہنچا۔ ماں منتظر تھی۔ ”بیٹا! کتنی رقم ہے بینکوں میں......؟“ اس نے پوچھا

”ماں! ایک سو اکیاون روپے......!“ بیٹے نے رکھائی سے جواب دیا اور اپنے کمرے کی سمت چل پڑا۔ ◆◆◆

میں اُس کی نظر میں ہوں

پکارا ہے سمندر نے کہ میں اُس کی نظر میں ہوں
فلک بھی دوبدو اس کے کہ میں اُس کی نظر میں ہوں
وہی خالق، وہی رازق، وہی ہادی، میرا اللہ
کروں نہ کیوں بھروسا میں کہ میں اُس کی نظر میں ہوں
غموں کی دھوپ میں جو زندگی ہم نے گزاری ہے
تسلی ہو گئی اپنی کہ میں اُس کی نظر میں ہوں
وفاؤں کے چمن میں، میں اکیلا ہی کھڑا تھا
دکھوں کو جھیل لوں گا میں کہ میں اُس کی نظر میں ہوں
میرے ماضی کے اندھیروں میں چھپا ہے سب کچھ
انھیں بھی میں بھلا دوں گا کہ میں اُس کی نظر میں ہوں
زمیں و آسماں کو بھی میرے قدموں میں رکھ بھی دو
مجھے حاجت نہیں اُس کی کہ میں اُس کی نظر میں ہوں
میری پیاسی طبیعت کو فکر تھی آبِ کوثر کی
زہر میں پی نہیں سکتا کہ میں اُس کی نظر میں ہوں
نمازیں ترک کر دی ہیں، تلاوت ہو نہیں پاتی
توقع باندھ لی سب نے کہ میں اُس کی نظر میں ہوں
اگر ابلیس کے ہاتھوں شکستوں پہ شکست کھا کر
سہارا تھام لیتے تم کہ میں اُس کی نظر میں ہوں
خدایا تو بہشت کو بھی میری تقدیر میں لکھ دے
کروں نہ کیوں تمنا میں کہ میں اُس کی نظر میں ہوں
حسینی! سزائیں جو ملیں مجھ کو، کچھ یاد آیا تھا
توجہ کیوں ہٹی میری کہ میں اُس کی نظر میں ہوں

سید محمد خلیل اللہ حسینی (زبیر)

http://www.bookstube.net

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

ایک دوسرے سے بالکل برعکس

دو فیصلے

گھریلو مسائل سے نمٹنے کی خاطر آقا و چپراسی نے یکساں حل نکالا مگر ان میں زمین و آسمان کا فرق بھی تھا

آفاق اللہ خان

میں نے جب ہوش سنبھالا، تو میری عمر پانچ برس کے لگ بھگ تھی۔ تب مجھے پتا چلا کہ والد میری پیدائش کے ایک سال بعد ہی انتقال کر گئے تھے۔ مجھ سے بڑا ایک بھائی اور ایک بہن تھی۔ میری والدہ کی شادی کم عمری میں ہوئی تھی۔ جب وہ بیوہ ہوئیں، تو ان کی عمر ستائیں سال تھی۔ صورت شکل کی اچھی تھیں۔ لیکن انھوں نے بچوں کی دیکھ بھال اور مناسب پرورش کی خاطر دوسری شادی نہ کی۔ حالانکہ میرے رنڈوے تایا چاہتے تھے کہ ان کی شادی بھاوج سے ہو جائے کیونکہ ان کے بچے بھی چھوٹے تھے۔ لیکن والدہ نے کہا کہ سوتیلا باپ اچھا برتاؤ نہیں کرتا خواہ اس کا رشتہ بچوں سے کتنا ہی قریبی ہو۔

http://www.bookstube.net/

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

میرے والد نے اپنا مکان بڑے شوق سے بنوایا تھا۔ یہ انھوں نے اپنی زندگی ہی میں والدہ کے نام کر ڈالا تھا۔ اس کا ایک حصہ والدہ نے کرایہ پر اٹھا دیا۔ نیز گھر پر عورتوں اور بچوں کے کپڑے سینے لگیں۔ انسان ہمت کرے، تو اللہ تعالیٰ بھی مدد کرتا ہے۔ اس طرح ہمارے گھر کی گاڑی چل پڑی۔ دیکھتے ہی دیکھتے دس برس بیت گئے۔

بڑا بھائی بیس برس کا ہو گیا۔ اس نے انٹر پاس کیا، تو گھریلو حالات کے پیش نظر ملازمت کر لی تاکہ والدہ کو کچھ آرام مل سکے۔ اس طرح ہمارے حالات بہتر ہونے لگے۔ والدہ بڑی سگھڑ تھیں۔ انھیں اپنے سے زیادہ بچوں کی فکر تھی۔ انھوں نے گھر کو بڑے نپے تلے انداز میں چلایا اور دو سال بعد بڑے بھائی اور بہن کی شادی کر دی۔ شادی کے بعد بہن رخصت ہو کر اپنے گھر چلی گئی۔ والدہ بہت زیادہ اداس ہوئیں۔ ماں بیٹی دوست اور ایک دوسرے کے دکھ سکھ کی ساجھی ہوتی ہیں۔

بہن کے رخصت ہونے اور بھابی کے گھر آنے سے ہمارا گھریلو ماحول تبدیل ہو گیا۔ بھابی ہم لوگوں کے ساتھ گھل مل نہ سکیں اور اجنبیت کا احساس ہوتا۔ میں نے بھی اب انٹر پاس کر لیا، لیکن والدہ نے مجھے نوکری کرنے سے منع کیا تاکہ میں اپنی تعلیم جاری رکھ سکوں۔ ایک سال بعد بڑے بھائی کا تبادلہ دوسرے شہر ہوا اور وہ بھابی کو لے کر چلے گئے۔ گھر میں سناٹا رہنے لگا۔ لیکن اب ہمارے مالی حالات کافی بہتر ہو گئے تھے۔ میں نے ایک جگہ جز وقتی ملازمت کر لی۔ میں فارغ وقت والدہ کے ساتھ ہی گزارتا۔

وہ میری زندگی کے سنہرے دن تھے۔ والدہ سے خوب گپ شپ رہتی۔ ویسے بھی چھوٹا ہونے کے باعث وہ مجھ سے بے حد پیار کرتی تھیں۔ میں بھی چاہتا تھا کہ وہ جس اذیت ناک دور سے گزری ہیں، اس کی کچھ تلافی ہو جائے۔ کبھی کبھی بہن ہمارے گھر آ جاتی۔ ایک سال بعد اس کے ہاں بچی کی ولادت ہوئی۔ اس طرح میں ماموں بن گیا اور والدہ نانی۔ بھائی جب سے گئے تھے صرف ایک دفعہ ہم سے ملنے آئے۔

میری تعلیم مکمل ہو چکی تھی۔ اب میں ملازمت کے لیے بھاگ دوڑ کرنے لگا۔ میرا تعلیمی ریکارڈ اچھا تھا۔ کئی جگہ درخواستیں دیں۔ دو محکموں میں انٹرویو بھی دے آیا۔ ایک جگہ سے پیش کش آئی۔ یہ گریڈ ۱۷ کی ملازمت تھی، میں نے فوراً ہاں کر دی۔ والدہ کی خوشی کا ٹھکانا نہیں رہا۔ انھوں نے میلاد شریف کرایا، کافی رشتہ داروں اور جاننے والوں کو بلایا اور خاص کھانے کا اہتمام کیا۔

اب وہی ہوا جو ہونا تھا، والدہ نے فیصلہ سنا دیا کہ عنقریب وہ میری شادی کرنے والی ہیں۔ بے شک یہ خوشی کی خبر تھی۔ لیکن میں ابھی مزید چند سال شادی نہیں کرنا چاہتا تھا، مگر والدہ کی ضد کے آگے میری ایک نہ چلی۔ انھوں نے لڑکی تلاش کر میرا بیاہ کر ڈالا۔

رفعت سے شادی کے بعد میرے معمولات میں کافی تبدیلیاں آ گئیں۔ آئے دن سسرال جانا ہوتا۔ اکثر کھانا ہم باہر کھاتے۔ ان دنوں ہمارا ہر روز عید کی طرح اور ہر شب شب برات کی طرح گزرتی۔ قریباً چھے ماہ تک یہی سلسلہ رہا پھر ہم آہستہ آہستہ اپنے معمول کی طرف لوٹنے لگے۔

دفتر میں مجھے جو چپراسی ملا اس کا نام خدا بخش تھا۔ گاؤں کا رہنے والا نوجوان تھا۔ سیدھا سادہ، سچا، انتہائی ایماندار اور محنتی۔ اس کی باتوں میں بڑی کشش تھی، شاید اس لیے کہ وہ ہمیشہ سچ بولنے کی کوشش کرتا۔ اس کا دنیا میں ماں کے سوا کوئی نہ تھا۔ باپ کا بیس سال قبل انتقال ہو چکا

http://www.bookstube.net
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

تھا۔ وہ والدین کی اکلوتی اولاد تھا۔ والد فوت ہوئے، تو ماں کو بہت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

خدا بخش ابھی آٹھ سال ہی کا تھا کہ وڈیرے نے اسے کام پر لگا دیا۔ کھیلنے کودنے اور اسکول جانے کے دن تھے لیکن اس سے کھیتوں میں کام کرایا جاتا۔ کبھی وڈیرا گھر پر بھینسوں کی دیکھ بھال اور برتن وغیرہ دھونے پر لگا دیتا۔ اس شدید محنت کے عوض اسے دو وقت کی روٹی اور اتنے پیسے مل جاتے کہ ان کا کسی طرح گزارا ہو جائے۔ ماں بھی گھروں میں کام کر کے کچھ پیسے کما لیتی۔ اس طرح تقریباً دس بارہ برس گزر گئے۔

اب خدا بخش جوان ہو چکا تھا۔ ماں ہمیشہ دعا مانگتی کہ بیٹے کو کوئی باعزت روزگار مل جائے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی سن لی۔ خدا بخش کے ایک رشتے دار کو اس پر رحم آ گیا۔ اس نے اسے ہمارے سرکاری دفتر میں بطور چپراسی ملازم رکھوا دیا۔ ملازمت ملتے ہی خدا بخش نے گاؤں کو خیرباد کہا اور ماں کو لیے شہر آ گیا۔ دفتر کے قریب ہی ایک مکان کچی آبادی میں کرایہ پر لیا اور محنت و لگن سے اپنی ڈیوٹی انجام دینے لگا۔

میں نے جب خدا بخش کے حالات پر غور کیا، تو مجھے اس کی اور اپنی کہانی میں مماثلت محسوس ہوئی۔ چناں چہ چپراسی ہونے کے باوجود میری اس سے خوب گھٹنے لگی۔ لوگ اس کو میرا خاص آدمی کہنے لگے۔ ایک دن خدا بخش نے بتایا کہ ماں اس کی شادی کرنا چاہتی ہے۔ میں نے کہا ''یار ساری مائیں ایک سی ہوتی ہیں۔ نہ وہ خود چین سے بیٹھتی نہ دوسروں کو بیٹھنے دیتی ہیں۔ اپنی ماں سے کہو کہ وہ ایک دو سال رک جائے۔'' لیکن صاحب، وہ کہاں ماننے والی تھی۔ اس نے لڑکی کی تلاش شروع کر دی۔

جلد ہی گاؤں کی ایک لڑکی پسند کر خدا بخش کی شادی طے کر دی۔ اس نے ولیمے میں مجھے اور چند خاص ساتھیوں کو بلایا۔ خاصا پیسہ خرچ کیا۔ شادی دھوم دھام سے انجام پائی۔ شادی کے بعد وہ بہت خوش تھا۔ اکثر مجھ سے اپنی بیوی کا ذکر کرتا۔ زینب ایسی ہے، ویسی ہے۔ اس نے یہ کہا، وہ کہا، کہتی ہے تمھاری ماں کی بڑی خدمت کروں گی۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ یہ قصے کم ہوتے گئے۔ ایک وقت ایسا آیا کہ، ہم دونوں بھول گئے کہ ہمارے گھر والے بھی ہیں۔

ایک دن خدا بخش نے بتایا، اس کے گھریلو حالات آہستہ آہستہ خراب ہو رہے ہیں اور ساس بہو میں سرد جنگ شروع ہو چکی۔ ''زینب اکثر میری ماں کا کہنا نہیں مانتی۔ اس پر ماں سبکی محسوس کرتی اور مشتعل ہو جاتی ہے۔ زینب جب سے کھانا پکانے لگی ہے، وہ ماں سے نہیں پوچھتی کہ آج کیا پکایا جائے۔ اپنی مرضی سے ایسا سالن یا سبزی وغیرہ پکا لیتی ہے جو ماں کو پسند نہیں۔

''غرض ہر بات پر اختلاف کی وجہ سے گھر کا ماحول خراب ہو چکا۔ دونوں خواتین مجھ سے شکایت کرتی ہیں۔ میں زینب کو سمجھاتا ہوں کہ ماں کا درجہ بڑا ہے، وہ بوڑھی ہے، جیسا وہ کہے، ویسا ہی کرو۔ وہ خوش ہو کر ہمیں دعائیں دے گی۔ لیکن زینب ہرگز ماننے کو تیار نہیں۔''

ایک دن خدا بخش گھر گیا، تو معلوم ہوا، دونوں ساس بہو میں خاصی لڑائی ہوئی ہے۔ اس کی عادت تھی کہ وہ گھر جاتے ہی پہلے ماں کو سلام کرتا تھا اور خیریت پوچھتا۔ اس دن جب وہ اپنی ماں کے پاس جانے لگا تو زینب نے اسے راستے میں روک لیا۔ کہنے لگی ''آج اماں نے میرے ساتھ بڑی زیادتی کی ہے۔ کہتی ہے کہ شادی کو ایک سال ہونے والا ہے، لیکن تیرے یہاں بال بچہ ہونے کے کوئی آثار نہیں۔ میں تو کچھ دن اور دیکھوں گی پھر خدا بخش کی

http://www.bookstube.net/

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

دوسری شادی کر دوں گی۔ کیوں کہ میرا تو ایک ہی بچہ ہے۔ اس کے اولاد پیدا نہ ہوئی، تو نسل آگے کیسے چلے گی۔"

اس پر دونوں میں خاصی تُو تُو میں میں ہوئی۔ زینب کے چہرے سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کافی دیر تک روتی رہی ہے۔ خدا بخش کو ماں کی بات بری لگی۔ ماں سے پوچھا تو وہ بولی "بھئی میں نے بات تو صحیح کی ہے۔ لیکن یہ بھی تو کہا ہے کہ ابھی انتظار کروں گی۔ میں کون سا فوری طور پر تمھاری دوسری شادی کر رہی ہوں۔ میں نے یہ بات وقت سے پہلے کہہ دی اس لیے تمھیں بری لگی۔ بہرحال میری دعا ہے، اللہ تعالیٰ تمھیں اولاد سے نوازے۔"

خدا بخش نے ماں سے ناراضگی کا اظہار کیا اور اسے منع کر دیا کہ آئندہ وہ اس موضوع پر اپنی بہو سے کوئی بات نہ کرے۔ یہ صرف اس کا ہی نہیں پورے گھر کا معاملہ تھا۔

میں زینب کو سمجھاتا ہوں کہ ماں کا درجہ بڑا ہے، وہ بوڑھی ہے، جیسا وہ کہے، ویسا ہی کرو۔ وہ خوش ہو کر ہمیں دعائیں دے گی۔

خدا بخش روز مجھے نئی نئی کہانیاں سناتا۔ سرد جنگ آہستہ آہستہ بڑھتی گئی اور اس کا گھر پانی پت کا میدان بن گیا۔ اب محلے والے بھی یہ لڑائی سنتے اور دیکھتے۔ خدا بخش کی ہنسی اب غائب رہنے لگی۔ دلچسپ باتیں اب آہوں میں تبدیل ہو گئی تھیں۔ روز روز دانتا کلکل سے اس کی صحت بھی خراب ہو گئی۔

ایک دن خدا بخش نے مجھے ایسی خوشخبری سنائی جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے اور صحرا میں پھول کھلنے لگیں۔ معلوم ہوا، زینب امید سے ہو گئی ہے۔ چناں چہ لڑائی جھگڑے کافی حد تک کم ہو گئے۔ گھر کا کام کاج ماں نے سنبھالا اور بہو کی خدمت کرنے کو اپنا شعار بنا لیا۔ وقت کا پہیہ چلتا رہا۔ خدا بخش پھر دلچسپ باتیں کرنے لگا۔ اس کی باتوں میں دوبارہ قہقہے شامل ہو گئے۔ ایک دن خدا بخش نے مجھے بتایا، وہ ایک عدد صحت مند اور خوبصورت بچے کا باپ بن چکا۔ اس کی ماں نے گھر پہ ناچ گانے کا انتظام کیا اور خدا بخش نے دفتر میں مٹھائی بانٹی۔

کہتے ہیں خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ چند دن بعد رفعت نے مجھے بھی خوشخبری سنائی کہ وہ امید سے ہے۔ یہ معلوم ہوتے ہی والدہ نے اسے پلنگ تک محدود کر دیا اور ہر طرح سے اس کی خدمت کرنے لگیں۔ حالانکہ اب ہمارے گھر میں بھی سرد جنگ کا آغاز ہو چکا تھا۔ لیکن ایک روایت کے مطابق بہو تو پرائی ہوتی ہے، مگر اس کی اولاد اپنا خون ہوتا ہے۔ اسی لیے سسرال والے بہو کی خدمت کرتے ہیں کہ نسل آگے بڑھ سکے۔

بہرحال والدہ نے اپنی بساط سے زیادہ بہو کی خدمت کی اور اسے ہتھیلی کا چھالا بنا کر رکھا۔ حالانکہ رفعت کی دو چھوٹی بہنیں کنواری تھیں، وہ بھی بہن کی خدمت کرنے آ سکتی تھی۔ لیکن ہم نے انھیں نہیں بلایا کیونکہ یہ ہماری ذمے داری تھی۔ میری بہن بھی ایک ہفتہ کے لیے آ گئی جس سے والدہ کو کچھ آرام مل گیا۔ ایک دن رفعت اسپتال داخل ہوئی اور سب لوگ انتظار کرنے لگے۔ انتظار کے یہ لمحات بڑے پُرکیف تھے۔ آخر کار پتا چلا، میں ایک چاند سی بیٹی کا باپ اور والدہ ایک عدد پوتی کی دادی بن گئیں۔ ساتھ ہی رفعت کو ماں بننے کا شرف حاصل ہوا جس کے پاؤں نیچے جنت ہوتی ہے۔

بچی کا نام نیلوفر رکھا گیا۔ وہ جلد اپنے والدین اور دادی کی آنکھ کا تارا بن گئی۔ اب ہماری زندگی نیلوفر کے گرد گھومنے لگی...... وہ یوں روتی، ہنستی، دودھ پیتی، سوتی اور ایسے جاگتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ غرض وہ ایک عجوبہ تھی

http://www.bookstube.net
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

اور ہم تماشائی!

انسانی زندگی کا نظام کچھ ایسا ہے کہ اس میں ہر لمحہ ماضی بنتا جاتا ہے اور ہر نئی چیز پرانی ہو جاتی ہے۔ باپ بننے کا تجربہ بھی پرانا ہو گیا۔ اب ہر چیز پھر معمولات زندگی میں شامل ہو گئی۔ نئے مسائل سامنے آنے لگے۔ نیلوفر کا وقت بے وقت رونا دادی کو برا لگتا۔ وہ اگر بیمار ہو جاتی، تو والدہ رفعت سے کہتیں "دلھن تم نے کہیں کوئی بد پرہیزی تو نہیں کر لی کیوں کہ دودھ پلانے کے زمانے میں ماں کی خوراک کا اثر بچے پر پڑتا ہے۔" ادھر رفعت نے کہنا شروع کیا کہ وہ نیلوفر کو بڑے کا دودھ پلانا چاہتی ہے کیوں کہ اس کی صحت اچھی نہیں۔

ہمارے گھر میں بھی خدا بخش کے گھرانے کی طرح ماحول خراب ہونے لگا۔ بات بات پر لڑائی جھگڑا ہوتا۔ دفتر سے گھر پہنچتے ہی شکایتوں کا پنڈروا بکس کھل جاتا۔ اندازہ ہوا کہ رفعت کو شہ دینے میں اس کی ماں کا ہاتھ ہے۔ چاہتی تھی کہ میں والدہ کو بڑے بھائی کے یہاں بھیج دوں تا کہ رفعت کو مکمل آزادی مل جائے اور اس کے میکے والے گھر میں آنے جانے لگیں۔

ایک مشکل یہ آن پڑی کہ والدہ کی طبیعت بہت خراب رہنے لگی تھی۔ اب انھیں مکمل دیکھ بھال کی ضرورت تھی۔ دفتر سے آنے کے بعد میں مستقل طور پر والدہ کے ساتھ رہتا۔ رات کو بھی ان کی خدمت کرتا۔ لیکن بہت سے معاملات ایسے ہیں جہاں عورت ہی عورت کی خدمت کر سکتی ہے۔

میں نے رفعت سے اس سلسلے میں بات کی، تو اس نے کہا کہ وہ بچی کی دیکھ بھال اور گھر کے کاج میں مصروف رہتی ہے۔ لہٰذا بہتر ہو گا کہ میں اپنی ہمشیر کو بلا لوں یا پھر بڑے بھائی سے بات کر کے بھابی کچھ دن کے لیے آ جائیں۔ بظاہر ایسا ممکن تھا لیکن مشترکہ خاندانی نظام ٹوٹنے کے بعد اس قسم کی روایت اب دیکھنے میں نہیں آتی۔ میں ہمشیر کو بار بار بلا کر ان کا گھریلو ماحول خراب کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اور رہا بھائی سے بات کرنے کا سوال، تو بطور تمام حجت انھیں فون کیا۔

انھوں نے کہا، "تم خود سمجھ دار ہو، ماحول اگر خراب کرانا چاہتے ہو تو ٹھیک ہے۔ تمھاری بھابی ایسی کڑوی گولی ہے جسے نگلنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔" بھائی کے اس دوران دو بچے بھی ہو چکے تھے۔ اس وقت صورت حال یہ تھی کہ والدہ سخت تکلیف میں تھیں اور کوئی ان کی مدد کرنے والا نہ تھا۔ میں نے جب گھر والوں کو لاچار پایا تو ایک پرائیویٹ نرس کا بندوبست کرا لیا۔ یہ نرس چوبیس گھنٹے ہمارے ہاں ڈیوٹی پر رہتی۔ اس سے والدہ کو کافی آرام مل گیا، لیکن نرس کے کچھ مسائل بھی تھے۔

> **انسانی زندگی کا نظام کچھ ایسا ہے کہ اس میں ہر لمحہ ماضی بنتا جاتا ہے اور ہر نئی چیز پرانی ہو جاتی ہے۔ باپ بننے کا تجربہ بھی پرانا ہو گیا۔**

رفعت کہتا تھا کہ نرس کو ملازم رکھنے پر بے تحاشا رقم صرف ہو رہی ہے جو پیسے کا زیاں ہے۔ جب کہ والدہ اتنی بیمار نہیں جتنا ظاہر کرتی ہیں۔ وہ مزید کہتی کہ میرے بھائی کو بھی نرس کا خرچ برداشت کرنا چاہیے۔ وہ تو والدہ کی ذمے داری سے بالکل بری الذمہ ہو گیا۔ لیکن مجھے معلوم تھا، وہ اتنی مالی استطاعت نہیں رکھتا۔ ادھر خدا بخش کے گھر کا ماحول بھی روز بہ روز خراب ہو رہا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ میرے گھریلو حالات لوگوں کو معلوم نہیں تھے۔ جبکہ خدا بخش کے محلے اور دفتر والوں کو بھی ان کے گھریلو لڑائی جھگڑوں کا علم ہو چکا تھا۔

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

خدا بخش کی بیوی نے اسے کہہ دیا کہ وہ اپنی ماں کو گاؤں چھوڑ آئے ورنہ وہ خود میکے چلی جائے گی۔ خدا بخش جب مجھے یہ سب کچھ بتاتا، تو میں اپنے بارے میں سوچنے لگتا۔ میرے یہاں بھی اسی قسم کی صورت حال تھی۔ رفعت کا کہنا تھا کہ اسے والدہ کا وجود کھٹکتا ہے۔ حالانکہ شوہر یا بیوی کے والدین بھی اپنے ماں باپ کی طرح ہوتے ہیں۔ لیکن شاید اس زمانے میں یہ تصور ختم ہو چکا۔

ایک دن دفتر سے گھر جاتے ہوئے مجھے کالج کے زمانے کا پرانا دوست، شیری مل گیا۔ انٹر کے بعد اس نے پڑھائی چھوڑ دی تھی اور بطور الیکٹریشن کام کر کے روزی کماتا تھا۔ ہم لوگ ایک کیفے ٹیریا میں جا بیٹھے۔ کالج کے زمانے میں ہم وہاں چائے پینے آیا کرتے تھے۔ وہاں بالائی والی چائے ملتی تھی جو بڑے مزے کی ہوتی۔ پیالی میں چائے ڈالنے کے بعد اوپر سے موٹی بالائی ڈال دی جاتی۔ یوں چائے کا لطف سوا ہو جاتا۔

ادھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد میں نے اپنے گھریلو حالات کا ذکر چھیڑ دیا۔ شیری کو یہاں لانے کا مقصد یہی تھا۔ شیری بڑے غور سے میری گفتگو سنتا رہا۔ اس کے بعد بولا ”یار یہی فرق ہے ہمارے معاشرے اور یورپ کے کلچر میں! ہم جس بات کو دیر سے سمجھتے ہیں، وہ لوگ اس کا پہلے سے اندازہ کر لیتے ہیں۔“

”دیکھو شیری، میں تمھیں یہاں پہیلیاں بجھوانے نہیں لایا۔ جو بھی کہنا ہے سیدھی طرح کہو۔“

”اچھا تو پھر سنو!“ شیری نظریں جھکاتے ہوئے بولا ”یار یورپ والوں نے تو اس کا حل نکال لیا ہے اور اولڈ ہاؤسز بنا لیے۔“

یہ سنتے ہی میں آگ بگولہ ہو گیا۔ ”شیری اگر تو میرا پرانا دوست نہ ہوتا، تو قسم خدا کی ایسا تھپڑ تیرے منہ پر رسید

قارئین متوجہ ہوں

ہمیں ہر ماہ بغرض اشاعت تحریریں موصول ہوتی ہیں۔ لکھاریوں سے التماس ہے کہ وہ اپنا تعارف بھی نتھی کیا کریں تاکہ قارئین ان کی بابت جان سکیں۔ لکھاری خواتین و حضرات اپنی تصویر بھی برائے اشاعت بجھوا سکتے ہیں۔

(ادارہ اُردو ڈائجسٹ)

کرتا کہ پانچوں انگلیوں کے نشان چہرے پر ابھر آتے۔“ میں نے غصے سے شیری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”یار میں تو پہلے ہی کہہ رہا تھا کہ...... اچھا میں چلتا ہوں۔“ شیری نے شرمندہ ہوتے ہوئے کہا۔

”جاؤ دفع ہو جاؤ۔“ میں نے نفرت سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

☆☆

دوسرے دن جب میں دفتر گیا، تو خدا بخش نے خوشی خوشی مجھے بتایا، اس نے اپنے گھر مسئلہ حل کر لیا ہے۔ میں یہ سن کر گھبرا گیا کیونکہ خدا بخش اکثر اپنی ماں پر برہم ہوتا رہتا تھا۔ ”ارے کہیں تو نے اپنی ماں کو......“ میں نے مشکوک نظروں سے خدا بخش کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”نہیں صاحب، ایسا بالکل نہیں جیسا آپ سوچ رہے ہیں۔ میں نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی اور گاؤں اس کے میکے چھوڑ آیا ہوں۔ بچے ابھی اس کے پاس ہے۔ اس کا فیصلہ بعد میں ہو گا کیونکہ بچہ ابھی بہت چھوٹا ہے۔“

یہ بات سن کر میں اپنے فیصلے کے متعلق سوچنے لگا...... میں کل رات ہی والدہ کو ایدھی والوں کے اولڈ ہاؤس چھوڑ آیا تھا۔

◆◆◆

http://www.bookstube.net/

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

آج بھی ہمارے سرحدی قبائلی علاقوں میں جرگہ نظام رائج ہے۔ کسی میں اتنی جرأت نہیں ہوتی کہ جرگے کے فیصلے رد کر سکے۔ بڑے بڑے سورما اور سرکش سردار جرگہ کے سامنے بھیگی بلی بن جاتے ہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ جرگے کے اکثر فیصلے انصاف، حکمت اور شریعت کے مطابق ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صدیوں سے یہ نظام آج بھی اُسی شان و شوکت کے ساتھ مروج ہے۔
جرگہ اُسی وقت بیٹھتا ہے جب ایک علاقے میں

”میری زمین زیادہ ہے!“

مال و دولت پر گھمنڈ کرنے والے سردار کی عبرت انگیز داستان

سراج دین

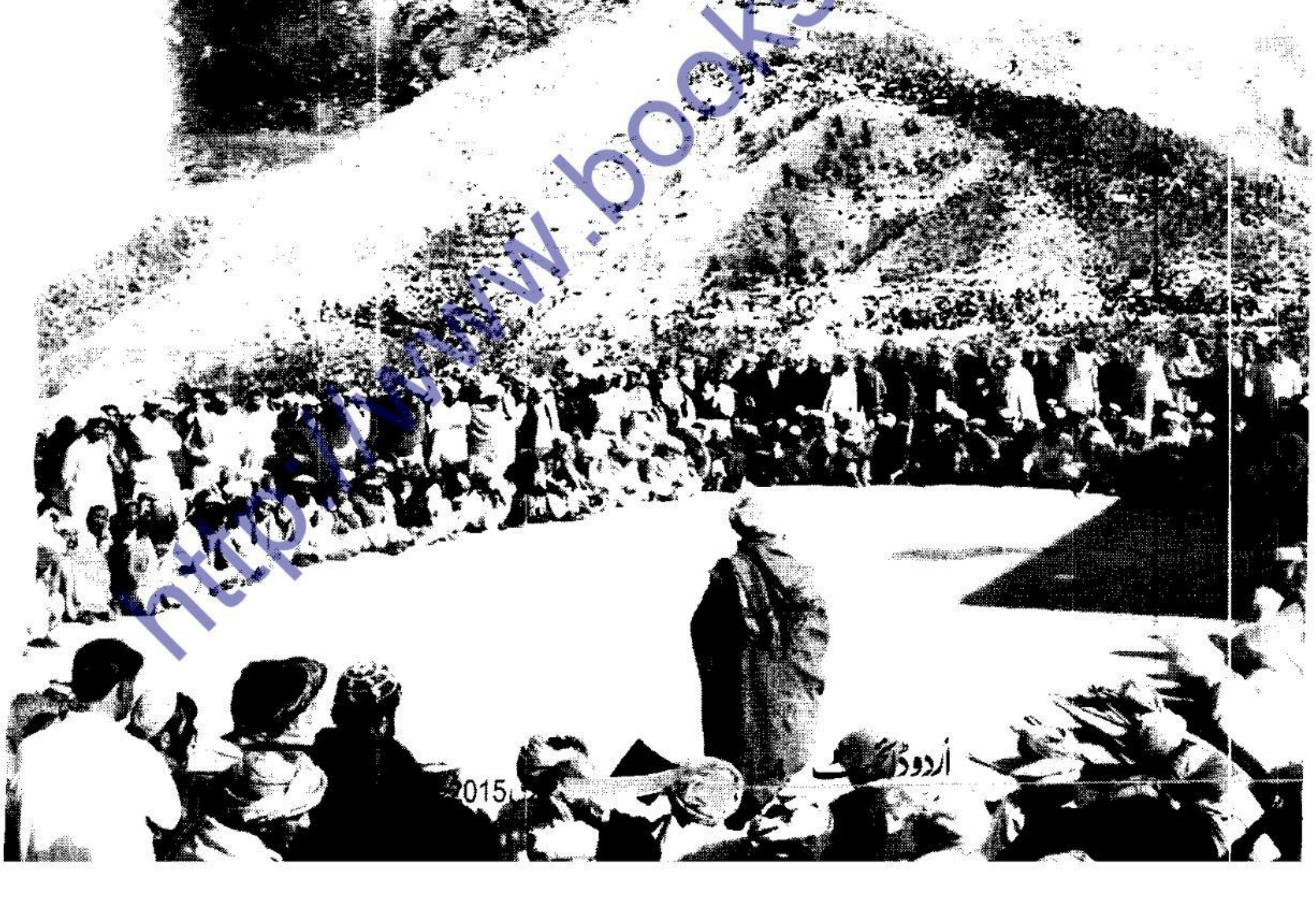

http://www.booksstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

کوئی سنگین نوعیت کا واقعہ یا سانحہ پیش آ جائے۔ چھوٹے موٹے جرائم کا فیصلہ علاقائی سردار اپنی پنچایت میں کرنے کا مجاز ہوتا ہے۔

یہ ۲۰۰۵ء کی اواخر کی بات ہے۔ سانحہ بالاکوٹ میں زلزلے کی تباہی کے بعد میں اپنے دوست یونس خان کی معیت میں عزیز و اقارب کی خبرگیری کرنے اس علاقے میں گیا۔ مرنے والوں کی فاتحہ پڑھ کر زندہ رہنے والوں نے نئے سرے سے کاروبارِ زندگی زور و شور سے جاری کر رکھا تھا۔ زخمیوں کی عیادت اور مرحومین کے لیے دعائے مغفرت کر کے میں لوٹ آیا، لیکن آنے سے پہلے ایک واقعہ میرے دل و دماغ پر ثبت ہو گیا جو قارئین کی نذر ہے۔

بالاکوٹ سے ملحق علاقے کے ایک جرگے میں، میں اور یونس خان بھی شریک ہوئے۔ یہ جرگہ کسی مقدمے کا فیصلہ کرنے نہیں بلکہ علاقے میں امن و امان ہونے کی خوشی میں بیٹھا تھا۔ معمول سے زیادہ لوگ جمع تھے۔ گپ شپ کے ساتھ قہوے کا دور بھی چل رہا تھا۔ ہم بھی اس نعمت سے لطف اندوز ہوئے۔ ہر کوئی ہشاش بشاش تھا۔ اکا دُکا اسلحہ بردار اپنی اپنی بندوقوں کی صفائی ستھرائی میں مشغول اپنے علاقائی نغمے گنگنا رہے تھے۔

کافی دنوں سے جرگے میں کوئی سنگین نوعیت کا مقدمہ نہیں آیا تھا جو اس بات کا غماز تھا کہ علاقے اور گردو نواح میں ہر طرح سے امن و امان ہے۔ مختلف قبیلوں کے سردار..... حشمت خان، دلاور خان، جبروت خان، شیر خان، بارعب خان، گل خان اور جبار خان وغیرہ ایک دوسرے کا حال احوال پوچھ رہے تھے۔ یہ لوگ اپنے اپنے قبیلے کے نامی گرامی سردار تھے۔ اتنے میں غفار خان بڑے طمطراق سے اپنے اسلحہ بردار ساتھیوں کے ساتھ اپنی نئی لینڈکروزر پہ وارد ہوا، تو سب نے ''پاخیر راغلے'' کی صدا بلند کی اور ایک دو اسلحہ برداروں نے ہوائی فائر بھی داغ دیے۔

غفار خان بھی جرگے کا رُکن تھا، مگر تکبّر، گھمنڈ اور بے تحاشا اراضی کے مالک ہونے کا خمار اُس کے سر پر سوار رہتا۔ موقع بے موقع وہ اپنی جائداد کا ذکر کسی نہ کسی رنگ میں ضرور کرتا جو دوسرے کی تذلیل یا کہتری کا باعث ہوتا، تو غفار خان کا سینہ تن جاتا اور وہ اپنے اندر تقویت محسوس کرتا۔

جبکہ بختاور خان نیک نام اور خانوں کا خان تھا۔ اُس کا شمار بھی بڑے زمینداروں میں ہوتا۔ قہوے کا دور چل رہا تھا اور دوپہر کھانے میں تجی تناول کرنے کا پروگرام بھی تھا۔ میں دل ہی دل میں خوش ہوا کہ میں بھی آج اس سوغات سے لطف اندوز ہوں گا جو پختونوں کی مرغوب غذا ہے۔ یہ ذبح شدہ سالم بکرے کے پیٹ میں چاول اور دیگر مسالہ جات بھر کر لکڑیوں کی آگ پر پکائی جاتی ہے۔ غفار خان نے حسب عادت بات شروع کی کہ میں نے فلاں جگہ سو مربعے خرید لیے ہیں۔ بختاور خان نے مبارکباد دی، تو باقی سرداروں نے بھی خوشی کا اظہار کیا۔

باتوں باتوں میں غفار خان نے بھری محفل میں بختاور خان سے پوچھا ''تمہاری کتنی زمین ہے؟''

خان نے چند لمحے خاموشی کے بعد مسکراتے ہوئے کہا ''تمہاری زمین سے زیادہ ہے۔''

یہ سننے کی دیر تھی کہ غفار خان آپے سے باہر ہو گیا۔ اُسے یہی محسوس ہوا کہ بختاور خان نے مجھے اپنے سے کم تر جانا ہے۔ وہ دہاڑ کر بولا ''تم نے کیسے کہہ دیا کہ تمہاری زمین میری زمین سے زیادہ ہے؟ اس بات کا ابھی ثبوت پیش کرو یا کوئی دلیل دو۔ ورنہ مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔''

یوں بیٹھے بٹھائے بات کا بتنگڑ بن گیا اور دونوں فریقین نے ایک دوسرے پر بندوقیں تان لیں۔ خانوں کی ''سرپھری'' کسی سے پوشیدہ نہیں۔ ہنستی بستی محفل یکدم

http://www.bookstube.net/

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

سنجیدہ اور خوف و ہراس سے بھر گئی۔ میں بھی ڈر گیا کہ معلوم نہیں یہاں سے زندہ واپس جاؤں گا یا نہیں...... کسی بھی لمحے کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ مختصر یہ کہ ''پنچایت'' ہی میں پنچایت لگ گئی۔

اس موقع پر موجود بزرگ سرداروں نے مصالحتی کردار ادا کیا اور بختاور خان سے کہا کہ تمھیں ثابت کرنا پڑے گا کہ تمہاری زمین غفار خان کی زمین سے واقعی زیادہ ہے اور اگر ایسا نہ ہوا' تو تم غفار خان سے معافی مانگو گے اور تمھیں پنچایت سے خارج کر دیا جائے گا۔ یہی فیصلہ غفار خان کے لیے بھی تھا کہ اگر بختاور نے ثابت کر دیا' تو اُسے پنچایت چھوڑنی ہو گی۔ پورے جرگے پر خاموشی طاری تھی اور یہ حتمی فیصلہ تھا۔ دوسری صورت میں خون خرابہ یقینی تھا۔

بختاور خان اپنی نشست سے اٹھا اور آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا پنچایت کے سرخیل کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ پھر اس نے بزرگ سردار حشمت خان سے کہا ''غفار خان سے کہو کہ وہ بھی میرے ساتھ آ کر کھڑا ہو۔ حشمت خان کے اشارے پر غفار خان بھی اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتا' گردن اکڑائے بختاور خان کے شانہ بشانہ آن کھڑا ہوا۔

سبھی سردار اور جرگے والے بختاور خان کی جانب پرتجسس نگاہوں سے دیکھنے لگے کہ وہ کیا ثبوت پیش کرنے لگا ہے۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ امارت کے لحاظ سے کون کتنے پانی میں ہے۔ غفار خان شعلہ بار آنکھوں سے بختاور خان کو گھورتا اس کی بائیں جانب کھڑا ہو گیا۔ خان نے شائستگی سے غفار خان کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اُسے اپنی بائیں جانب لا کھڑا کیا۔ چالیس پینتالیس کے پیٹے میں' سرخ و سپید' تنومند بختاور خان لمبا تڑنگا جوان تھا جبکہ غفار خان بھی انہی صفات کا مالک' مگر قدرے پست قامت تھا۔

نصیحت

بصرے کا ایک رئیس حضرت رابعہ بصریؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس نے کہا' میں کچھ نصیحت چاہتا ہوں۔ آپؒ نے فرمایا، اگر کوئی شخص تجھ سے یہ دریافت کرے کہ تو اللہ کو دوست رکھتا ہے' تو خاموش ہو جا کیونکہ اگر تو انکار کرے گا، تو کافر ہو جائے گا اور اگر تو اقرار کرے گا تو یہ غلط بیانی ہے۔ یہ اس لیے کہ تیرے افعال دوستوں جیسے نہیں۔ یہ الفاظ اثر آفرین ثابت ہوئے۔ رئیس اشکبار ہوا۔ اس نے گناہوں سے توبہ کی۔ اس کے اندر تمام خوبیاں پیدا ہو گئیں جو ایک مومن کے لیے لازم و مخصوص ہیں۔

(مرسلہ: احسن کمال یوسفزئی، واہ کینٹ)

بختاور خان نے پنچایت کو متوجہ کرتے ہوئے غفار خان کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور بولا ''ہم دونوں آپ کے سامنے کھڑے ہیں۔ آپ دیکھ سکتے ہیں کہ میری قبر کی زمین اس کی قبر کی زمین سے زیادہ ہو گی۔''

یہ کہنے کی دیر تھی کہ سرخیل سردار اور جرگے والے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ غفار خان بھی حیرت میں گم خلاؤں میں گھورنے لگا۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ بختاور خان دور کی کوڑی لائے گا اور اس طرح سب کے سامنے سرخرو ہو گا۔

چند لمحے خاموشی چھائی رہی۔ پھر پورے جرگے نے ہوائی فائرنگ کر کے بختاور خان کی دلیل کا خیر مقدم کیا۔ غفار خان اپنے سوال پر نادم تھا۔ اُس کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ اُس نے پورے جرگے کے سامنے بختاور خان کو گلے لگایا اور اُس سے معافی مانگی۔ نیک طینت بختاور خان نے کھلے دل سے اُسے معاف کر دیا۔ اس کے بعد رات گئے تک جرگے میں جشن کا سا سماں رہا۔

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

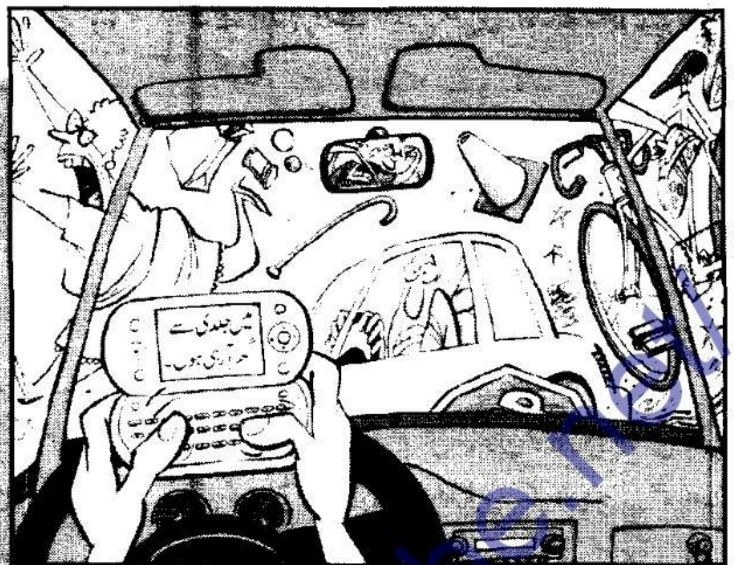

ارے شہر والو! ہوشیار خبردار

بیگم کار چلانے لگی ہیں

صنفِ نسواں کی خصوصیاتِ ڈرائیوری
کا بیان ذرا البیلے رنگ میں

شفق حیات

ایک عورت نے اپنے شوہر کو دفتر فون کیا اور پوچھا "آپ مصروف تو نہیں؟"

شوہر نے دانت پیس کر کہا "میں اس وقت میٹنگ میں ہوں۔ کیوں فون کیا ہے؟"

جواب آیا "آپ کو ایک اچھی اور ایک بُری خبر سنانی تھی۔"

شوہر گرجا "خبردار جو کوئی بری خبر سنائی، بتاؤ اچھی خبر کیا ہے؟"

بیوی چہک کر بولی "وہ جو ہم نے نئی گاڑی لی تھی، اس کے ائیر بیگ بالکل ٹھیک کام کر رہے ہیں"۔

☆☆

اگر آپ کسی تنگ پارکنگ میں کھڑے ہوں اور اچانک کوئی گاڑی نمودار ہو کر چھوٹی سی جگہ میں بھی کسی کار کو نقصان پہنچائے بغیر بہترین طریقے سے کھڑی ہو جائے، تو یقین کر لیجیے کہ اسے کوئی مرد چلا رہا ہے۔ گاڑی دو تین دفعہ آگے پیچھے ہو کر پارکنگ میں جگہ بنائے، تو پھر بھی اسے کوئی مرد ہی چلا رہا ہو گا۔ خاتون کا شائبہ اس وقت ہونا چاہیے جب پارکنگ کی ڈھیر ساری جگہ ہو لیکن آنے والی گاڑی سیدھی آپ کی کار سے آن ٹکرائے۔

خواتین کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ جب وہ گاڑی چلا رہی ہوں، تو سڑک پر سے ساری ٹریفک دفع ہو جائے۔ یہ ون وے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے غلط رخ پر بھی گاڑی چلا رہی ہوں تو سامنے سے آنے والوں کو کوسنے دیے جاتی ہیں "کم بخت سب کے سب غلط آ رہے ہیں۔"

مرد کو جب تک گاڑی ریورس نہ کرنی آئے، وہ سمجھتا ہے کہ اسے ابھی کار نہیں چلانی آتی، لیکن خواتین صرف دروازہ کھولنا ہی سیکھ جائیں، تو انھیں کامل یقین ہو جاتا ہے کہ اب وہ ڈرائیونگ سیکھ چکیں۔

جن خواتین کو ڈرائیونگ نہیں آتی وہ بھی چلتی گاڑی میں حتی المقدور اپنی موجودگی کا احساس دلاتی رہتی

http://www.bookstube.net
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

ہیں۔ بعض اوقات تو شوہر گاڑی ریورس کر رہا ہوتو ساتھ بیٹھی بیگم اچانک پچھلے آئینے کا رخ اپنی طرف کر لپ اسٹک ٹھیک کرنے لگتی ہے۔ وہ چیخ تب مارتی ہے جب آدھی گاڑی گندے نالے میں جا گرے۔ کئی خواتین تو گاڑی لے کے نکلیں، تو گھر والے باقی شہر کی سلامتی کی دعا مانگنے لگتے ہیں۔

شادی شدہ خواتین کی ڈرائیونگ سب سے خطرناک ہوتی ہے' یہ ٹریفک کے اشارے پر رک بھی جائیں، تو ہینڈ بریک لگانے کے بجائے عملاً گیئر لگا کے اطمینان سے ببل گم چباتی رہتی ہیں۔ نتیجتاً اشارہ کھلتے ہی فل ریس دیتی ہیں اور پیچھے کھڑا بچارہ اسکوٹر والا رگڑا جاتا ہے۔ سارا قصور ان کا اپنا ہوتا ہے لیکن پروں پہ پانی نہیں پڑنے دیتیں' الٹا غریب اسکوٹر والے پر چڑھ دوڑتی ہیں ''بدتمیز' کمینے' شرم نہیں آتی خاتون کی گاڑی کے پیچھے اسکوٹر لگاتے ہوئے!''۔

ہماری ایک ساتھی بھی ایسے ہی گاڑی چلاتی تھیں۔ ان کے گھر والے بڑے فخر سے بتایا کرتے تھے ''ہماری بٹی کئی دفعہ گاڑی صحیح سلامت بھی واپس لا چکی۔'' گھر والوں نے اس کے لیے خصوصی طور پر ایک ڈرائیور رکھا ہوا تھا۔ اسے گاڑی تو چلانی نہ آتی تاہم وہ وی بی جی کے ساتھ ضرور بیٹھتا تاکہ ہر وقوع کا آنکھوں دیکھا حال بیان کر سکے۔

میں کئی ایسی خواتین کو جانتا ہوں جو ڈیڑھ سو میٹر کا سفر ہینڈ بریک کھینچے بغیر طے کر جاتی ہیں۔ واپسی پر اپنے مکینک کو فون کر کے پوچھ رہی ہوتی ہیں ''ابھی تو کل ٹیوننگ کروائی تھی پھر گاڑی اتنی بھاری کیوں ہوگئی؟'' ایسی خواتین کو ہینڈ بریک نیچے کرنا اس وقت یاد آتا ہے جب اسے کھینچنے کی ضرورت پڑے۔ مرد اگر گاڑی کا انجن آئل تبدیل کرائے، تو تاریخ لکھ کر پاس رکھ لیتا اور ہر وقت میٹر پر نظریں جمائے رکھتا ہے کہ دو ہزار کلومیٹر سے زیادہ نہ ہونے پائے۔

اس کے برعکس گاڑی اگر خاتون کے زیر استعمال ہو، تو انجن آئل ختم ہونے کا پتا اس وقت چلتا ہے جب خاتون بڑے جوش و خروش سے شوہر کو بتاتی ہے ''نعیم! گاڑی کے میٹر پر ایک لائٹ کبھی نہیں جلتی تھی، اب وہ ایک ماہ سے بالکل ٹھیک جل رہی ہے۔''

آپ نے بہت کم کسی خاتون کو گاڑی کا انجن آئل چینج کراتے دیکھا ہوگا' وجہ صرف یہ کہ ایسا جب بھی ہوا' گاڑی کرین کی مدد سے لانا پڑی۔ خواتین کی گاڑی پنکچر ہوجائے، تو یہ بھی قابل دید منظر ہوتا ہے۔ یہ سانحہ اگر سڑک کے عین بیچ میں پیش آئے، تو وہ اطمینان سے گاڑی وہیں کھڑی کرتی اور گھر فون کر دیتی ہیں ''شہباز! گاڑی پنکچر ہوگئی ہے۔ ذرا فارغ ہوکے آجاؤ'' اس دوران خواہ بدترین ٹریفک جام ہوجائے، یہ اطمینان سے گاڑی کے اندر بیٹھی مختلف بٹن چھیڑتی رہتی ہیں کہ شائد کوئی بٹن دبانے سے خود بخود پنکچر لگ جائے۔

لڑکیاں عموماً آٹو گیئر میں گاڑی چلانا پسند کرتی ہیں۔ ان کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ سائڈ اور بیک مرر میں دیکھنے سے حتی الامکان پرہیز کریں۔ کوئی لڑکی گاڑی چلاتے ہوئے دائیں طرف کا انڈیکیٹر دے، تو سمجھ جائیں کہ وہ بائیں طرف مڑنا چاہ رہی ہے۔

میں نے ایک دفعہ سیکنڈ ہینڈ گاڑی خریدی تھی۔ اس کی مالکہ ایک خاتون تھی۔ موصوفہ نے اشتہار میں لکھا تھا کہ اس کی گاڑی میں ''پاور اسٹیرنگ'' ہے۔ میں نے آزمائش کی خاطر گاڑی اسٹارٹ کی تو اسٹیرنگ دائیں طرف گھمانے کی کوشش میں میرا کندھا اتر گیا۔ میں نے

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

بے بسی سے پوچھا ''محترمہ آپ نے تو کہا تھا کہ پاور اسٹیئرنگ ہے......''

ٹھلا کر بولیں ''ہاں تو کیا اسٹیرنگ گھماتے ہوئے پاور نہیں لگ رہی؟''

مرد کی گاڑی کے نیچے کوئی آجائے، تو وہ فوراً بریک لگا لیتا ہے۔ جبکہ خواتین یہ سوچ کر پوری گاڑی اوپر سے گزار دیتی ہیں ''کم بخت نیچے تو آ ہی گیا ہے، اب بریک لگانے کا کیا فائدہ؟'' ایسی خواتین کی گاڑی میں ٹینکی پٹرول سے آدھی بھری ہو، تو یہ دو انگلیوں سے میٹر پر درمیانی فاصلہ ماپ کر پمپ والے سے لڑنے لگتی ہیں کہ تین ہزار کا اتنا سا پٹرول کیوں ڈالا ہے؟

ان میں سے اکثر کے پاس لائسنس نہیں ہوتا۔ جن کے پاس ہو وہ بھی، تو گھر پڑا ہوتا ہے۔ خواتین کا کہنا ہے کہ وہ اگر گھر چلا سکتی ہیں، تو گاڑی کیوں نہیں؟ صحیح کہتی ہیں، اگر انھیں گھر میں بندے کا بیڑا غرق کرنے کا حق حاصل ہے، تو سڑکوں پر کیوں نہیں؟ خواتین کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ پوری توجہ سے گاڑی چلائیں اور ڈرائیونگ کرتے ہوئے اِدھر اُدھر مت دیکھیں، اسی لیے ہر موڑ پر کار پوری ذمے داری سے کہیں نہ کہیں ٹھوک دیتی ہیں۔

اس کے باوجود خواتین کی ڈرائیونگ کے دو پہلو قابل تعریف ہیں: ایک یہ کہ مرد حضرات گرمی میں بغیر اے سی گاڑی چلا رہے ہوں تو ان کے ہاتھ مسلسل کچھ نہ کچھ کھجانے میں مصروف رہتے ہیں۔ تاہم خواتین پورے تحمل سے روبوٹ بنی بیٹھی رہتی ہیں۔ دوسرے یہ کہ خواتین کبھی تیز رفتاری کا مظاہرہ نہیں کرتیں...... خود ہی سوچیے پہلے گیئر میں گاڑی زیادہ سے زیادہ کتنی تیز چل سکتی ہے؟

◆◆◆

لکھیے اور معقول معاوضہ پائیے

گستاف فلابیر فرانس کا ممتاز لکھاری گزرا ہے۔ اس کا قول ہے: ''لکھنا ایسا فن ہے جس کے ذریعے آپ اپنے دل و دماغ میں پوشیدہ جذبے اور خیال دریافت کرتے، بوجھتے ہیں۔''

اُردو ڈائجسٹ آپ کو بھی لکھنے کی دعوت دیتا ہے

کہانی لکھیے، سچا واقعہ، آپ بیتی، مزاح یا معلوماتی مضمون! یا پھر کسی اسلامی موضوع پر قلم اٹھائیے اور ایسی تحریر تخلیق کیجیے کہ وہ قاری کی زندگی میں انقلاب لے آئے۔

عمدہ نثر پارہ تخلیق کرنے پر آپ کو جو قلبی مسرت ہوگی، اس کی اہمیت اپنی جگہ! اُردو ڈائجسٹ میں جگہ پانے پر وہ آپ کو معقول معاوضے کا حقدار بھی بنا دے گی۔ آخر میں مشہور برازیلی ادیب، پاؤلو کیولو کا یہ قول بھی مدنظر رکھیے:

''ساجھے داری (Sharing) کا دوسرا نام لکھنا ہے۔ یہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ اپنے خیالات، نظریات اور تجزیوں کو دوسروں کے ساتھ شیئر کرنا چاہتا ہے۔''

(ادارہ اُردو ڈائجسٹ)

www.pdfbooksfree.pk

که بالغ عمر میں رونا دھونا بری بات ہے، لیکن **مانا** مجبوری تھی۔ لندن آنے کے بعد جان توڑ محنت اور کمر توڑ مشقت کا رونا ہمیں ہی رونا پڑا۔ مشقت بھی وہ جو خواب میں بھی کم نظر آئی۔ کہاں وہ ارزانی و آسانی کہ ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں اور کچھ کرنے کو نہیں۔ وقت گزاری کے لیے ناول اور افسانوں سے دل بہلایا جاتا۔ اب کام کے علاوہ کوئی کام ہی نہیں تھا۔

ویسے تو بیتے ہوئے دن سنہرے ہوتے ہیں۔ یہ صفت پاک و ہند سے تعلق رکھنے والی خواتین میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ نو جوانی میں مائیں کام نہیں کرواتیں کہ شادی

دوسرا حصہ

جہاں بجتی ہے شہنائی

دیارِ غیر میں گزرے تلخ و شیریں لمحات کی دلچسپ یادیں، ایک پاکستانی خاتون خانہ کے کاٹ دار قلم سے

راشدہ علوی

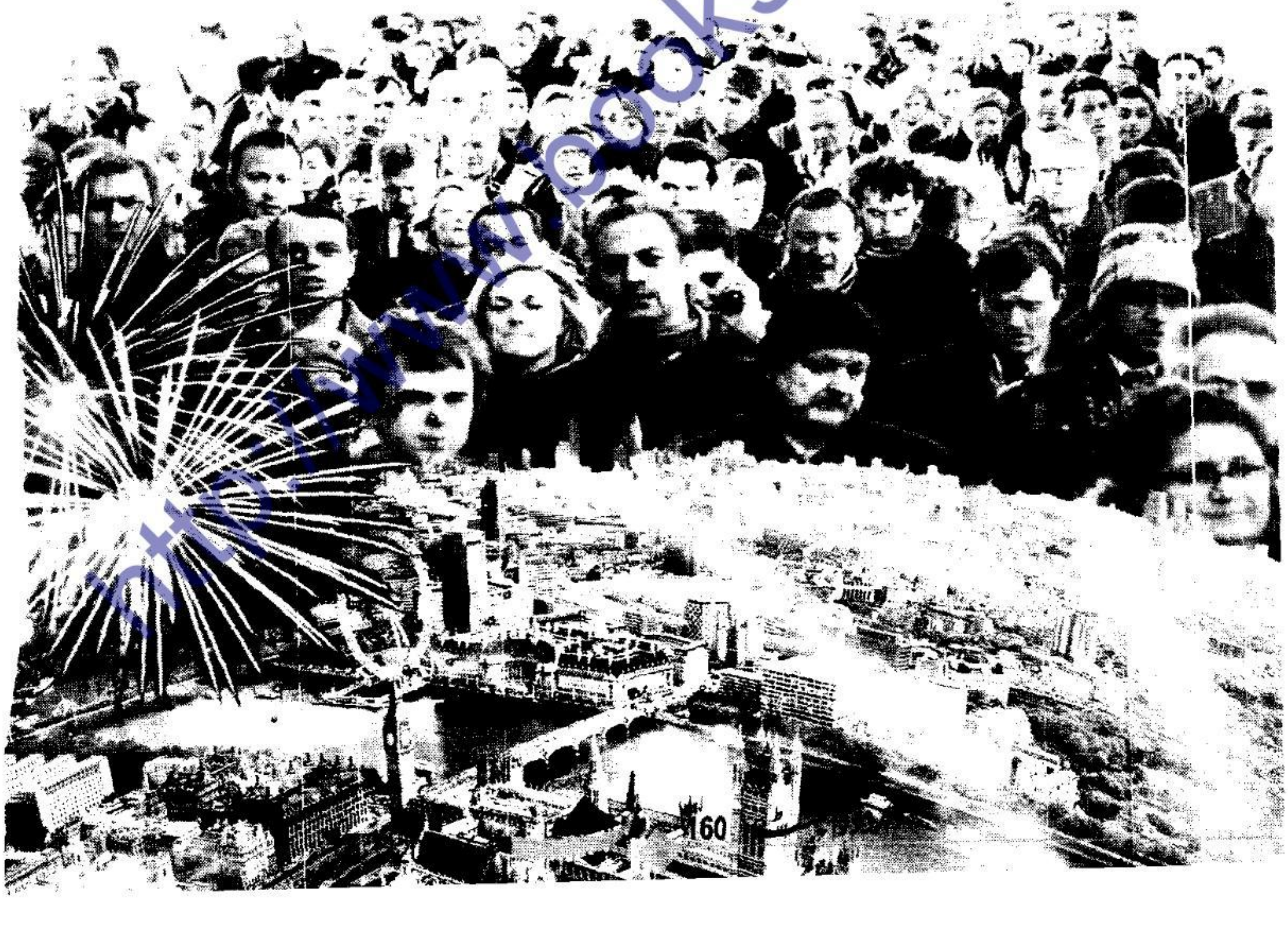

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

محترمہ راشدہ علوی پٹیالہ (ہندوستان) میں پیدا ہوئیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد والدین کے ہمراہ راولپنڈی چلی آئیں۔ گریجوایشن کے بعد کچھ عرصہ اسکول میں بچوں کو تعلیم دی۔ شادی کے بعد برطانیہ چلی گئیں اور وہیں آباد ہیں۔ لکھنے لکھانے سے دلچسپی تھی، اس لیے اپنی یادداشتیں لکھنے لگیں۔ آپ کی پہلی کتاب ''بستے بستے بستی'' ہے جو ۲۰۰۳ء میں شائع ہوئی۔ یہ اسلام آباد میں بیتے وقت پہ لکھی گئی۔ دوسری کتاب ''ہرا دھنیا'' ۲۰۱۳ء میں طبع ہوئی۔ اس میں مصنفہ نے لندن میں گزرے لمحات کو دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔ زیرِنظر مضمون اسی آپ بیتی سے بصد شکریہ لیا گیا ہے۔ اس منفرد آپ بیتی کے چیدہ حصوں سے آئندہ بھی قارئین لطف اندوز ہوسکیں گے۔

کے بعد بچی کو ساری عمر کام ہی کرنا ہے، چار دن عیش کر لینے دو۔ نانی دادیاں بھی اس معاملہ میں کم نہیں، ان کی دعائیں بھی بہ بانگ دہل یہ ہوتی ہیں کہ اللہ میری بچی کو ایسا گھر نصیب کریو جہاں اٹھ کر پانی نہ پینا پڑے۔ ہاتھ پاؤں کی مہندی نہ اترے۔ بالفاظ دیگر دعا ہے کہ ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھی رہے، کوئی کام نہ کرے۔

ان خواہشات، تمناؤں اور دعاؤں کا اثر کچھ تو ہوتا ہے۔ کام سے بیزاری طبیعت ثانیہ بن جاتی ہے۔ ہاتھ ہلانے کی بجائے وقت دعائیں کرنے میں گزرتا ہے کہ اے پروردگار! ہماری نانی دادی کی دعا قبول فرما۔ پتا اب چلا کہ قبولیت کی صورت لڑکیوں کے نصیب لندن میں کھلتے ہیں تاکہ کیا گزرے ہے قطرے پر گہر ہونے تک!

لندن آتے ہی ماماَئیں اور ملازم ہاتھ کے طوطوں کی طرح اڑ گئے۔ درزی، دھوبی اور مالی نابود ہوئے۔ بیرے خانسامے معدوم ہوگئے۔ مہندی پھیکی پڑتے پڑتے نیست ہوگئی۔ تنہائی و کسمپرسی پر بہائے آنسو بہہ بہہ کر خشک ہوئے اور صبر کی سل چھاتی سے جا لگی، تب کہیں لندن کی ٹھنڈی، گیلی اور سرسبز زمین پر قدم جمنے شروع ہوئے۔ برتن دھونے اور فرش صاف کرنے کو قسمت کا لکھا سمجھ کر قبول کر لیا۔

باغیچہ صاف کرنے اور کاریں دھونے میں جو جھجک اور عار تھی، اس پر قابو پا لیا۔ کھانا پکانا تو تھا ہی گلے پڑا ڈھول جسے ہمیں ساری عمر بجانا تھا۔ اب ہماری مرضی تھی کہ ہنس کر بجائیں یا رو پیٹ کر! بچوں کو اسکول سے لانا، لے جانا روزانہ کا معمول ہوگیا۔ زندگی گھڑی کے تابع ہوگئی۔ صبح کام اور شام کام میں زندگی تمام ہونے لگی۔ جسم کا ہر حصہ کسی نہ کسی کام میں حرکت میں رہتا...... بس ایک دماغ تھا کہ بے چارہ بے مصرف و بے کار، عضوِ معطل ہو کر رہ گیا۔

روزمرہ کے معمولات ختم ہوتے ہی بچوں کو اسکول سے لانے کا وقت ہو جاتا۔ اس کے بعد ہماری ساری جدوجہد انھیں اردو پڑھا کر ثقافت سے رشتہ جوڑنے یا عربی پڑھا کر مذہب سے ناتا کرنے میں گزر جاتی۔ اس کے علاوہ برتھ ڈے پارٹیاں، تیراکی اور کراٹے کے شوق نبھانے میں کسی اور چیز کا وقت ہی نہ ملتا۔ اپنی اور اپنے بچوں کی زندگی سنوارنے کے لیے، ہم لٹو کی طرح گھوم رہے تھے۔ اس میں دماغ اور اسے جلا بخشنے کی کس کو فرصت تھی؟ ہاں وقتاً فوقتاً خوف کی ایک لہر بدن سے گزر جاتی کہ کہیں

http://www.bookstube.net/

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

یہ زنگ دماغ کو کھا پی کر بھوسہ نہ کر دے۔

ادھر پاکستان سے جو خط آ رہے تھے، وہ حوصلہ بڑھانے کے بجائے جلے دل پر تیل کی دھار بن کر گرتے۔ کوئی پوچھتا نئی فلم دیکھی آپ نے؟ فلاں اداکارہ کی جو فلاں فلم ریلیز ہوئی ہے، کیسی ہے؟ کوئی نمائش کی تفصیل مانگتا جس کو اتنے لاکھ لوگوں نے دیکھا تھا۔ آپ شامل تھے اس ہجوم عاشقاں ہیں؟ کوئی نئے فیشن کا رنگ پوچھ رہا ہے تاکہ ہمیشہ کی طرح فیشن میں 'ان' رہ سکیں۔ یہ چیزیں دیکھنے اور جاننے کو ہم بھی تڑپ رہے تھے مگر وقت کہاں سے لاتے؟

ہمارا فلمی ذوق بہرحال ''جنگل بک'' اور ''سٹار وارز'' کی طرف مڑ گیا۔ فیشن شو کی بجائے ہم سرکس کا تماشا دیکھتے، علم و ادب میں اضافے کے لیے ''جارج دی انجن'' اور ''مسٹر مین'' کا مطالعہ ہوتا۔ اس پر بھی لوگ، خاص طور پر مرد حضرات پوچھتے ''آج کل کیا شغل رہتا ہے؟ کچھ کر رہی ہیں؟''

ظاہر ہے، جواب انکار میں ہوتا۔ گھر کے کام کاج کا ذکر کرنے کی کوشش کرتے تو جواب ملتا ''یہ کوئی کام نہیں، کوئی باقاعدہ کام کریں۔ آپ تو ماشاءاللہ پڑھی لکھی ہیں۔''

آدھی گھر کی مالکہ

گھر کے کام کاج کی بے قدری اور بے وقعتی سے واقف تو تھے، اوپر سے شنوائی کوئی نہ ہوتی! وہ تو اللہ بھلا کرے جج ڈینس کا جنھوں نے کم از کم انگلستان میں گھر کے کام کرنے کی اہمیت تسلیم کی اور کرائی۔

ستر کی دہائی میں ان کے پاس ایک مقدمہ آیا جس میں ایک آدمی نے اپنی تیس سالہ رفیقہ کو چھوڑ کم سن سیکرٹری سے بیاہ کر لیا۔ اس پر رفیقہ دہائیاں دیتی عدالت پہنچ گئی۔ اس نے کہا ''میں نے اپنی زندگی شوہر اور اس کے بچوں کی خدمت میں لٹا دی۔ بڑھاپے میں خالی ہاتھ کہاں جاؤں، خرچا کہاں سے لاؤں؟''

حضرت سب کچھ بھول کر نئی حسینہ میں گم تھے، انھیں رفیقہ کے مرنے جینے سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ان کی بے اعتنائی دیکھ کر جج کو تاؤ آ گیا۔ حس انصاف بھڑکی۔ سوال کیا ''تمھاری رفیقہ کی جگہ کوئی ملازمہ کام کرتی تو اس کو کتنا معاوضہ دیتے؟ حساب لگاؤ، ایک عورت اپنے گھر میں کتنے گھنٹے روزانہ کام کرتی ہے۔ پھر اس کو اوسط معاوضے سے ضرب دے کر تیس برس سے ضرب دو اور یہ رقم اس عورت کے حوالے کر دو۔''

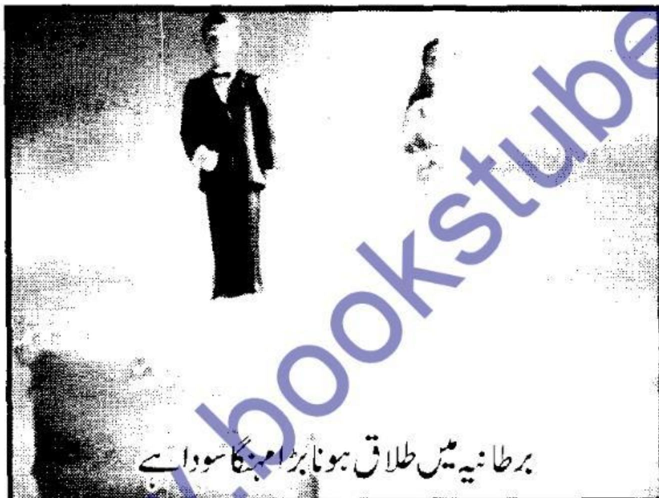

برطانیہ میں طلاق ہونا بڑا مہنگا سودا ہے

یہ رقم اس آدمی کو آدھی جائداد کے برابر نکلی۔ بچوں کے خرچ کی خاطر آدھی تنخواہ الگ دلوا دی۔ سو وہ دن اور آج کا دن، انگلستان میں آدمی بیوی یا محبوبہ کو چھوڑنے پر آدھی جائداد سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ چالاک بیویاں تو اس کے اوپر بھی ہاتھ صاف کر جاتی ہیں۔ اب گھر بیٹھی عورتوں کو کام نہ کرنے کا طعنہ دینے کی کوئی جرأت نہیں کرتا۔ عورتیں فخر سے ہاؤس وائف ہونے کا اعتراف کرتی ہیں۔ اس فیصلے کے بعد کئی عورتیں آفتوں سے نجات پا گئیں۔ ہماری ایک ہم وطن خاتون سے ملاقات ہوئی جو برسوں سے اپنے شوہر کی مار کھا رہی تھیں۔ بے شمار باتوں کے علاوہ

http://www.bookstube.net/

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

نمک کی کمی یا زیادتی وجہ پٹائی بن جاتی۔ آخر میاں نے زوجہ محترمہ کے کفن میں آخری کیل ٹھوکنے کا ارادہ کر لیا اور بات طلاق کی دھمکیوں تک آن پہنچی۔

خاتون ابھی تک صبر کی پتلی بنی خاموشی سے آنسو بہانے پر اکتفا کرتی تھیں۔ طلاق کا لفظ سن کر بے کل ہو گئیں اور لگیں نالے وشکوے کرنے۔ بپتا میں آہیں اور کراہیں شامل ہو گئیں۔ ادھر لوگ ہمدردی کرتے کرتے بیزار ہو چکے تھے۔ جس مسافر کہیں جانا نہ ہو اسے راستہ دکھانے کا کیا فائدہ؟ مشورے دے دے کر حلق الگ خشک ہو رہے تھے، بلکہ ان کی آمد کے ساتھ ہی ہماری ناامیدی بڑھ جاتی۔ اب جو روتے ہوئے انھوں نے تازہ واردات سنائی تو جل کر کہہ دیا ''بی بی تمھارے لیے تو طلاق لینا ہی بہتر ہو گا۔ نہ صرف مار سے جان چھوٹے گی بلکہ آدھی جائداد کی مالک بن جاؤ گی۔ خرچے کے لیے میاں کی آدھی آمدنی کی حقدار الگ ٹھہرو گی۔''

انھوں نے حیرت سے پوچھا ''کیسے؟''

ہم نے جج کا فیصلہ ان کے حق میں سنا دیا۔ چناں چہ شوہر کی اگلی دھمکی پر وہ آرام سے طلاق پر راضی ہو گئی اور آدھے مکان اور آدھی آمدنی کا مطالبہ کر دیا۔ اب حیرت میں ڈوبنے کی باری میاں کی تھی۔ مار کے لیے اٹھا تو ہاتھ اٹھا ہی رہ گیا اور ''کیسے'' کا سوال کیا۔ جج کا فیصلہ سننے کے بعد ہاتھ ہمیشہ کے لیے نیچا ہو گیا۔ مار کی وجوہ برف کی طرح پگھل کر بہہ گئیں۔ اب راوی ان کے گھر میں چین ہی چین لکھتا ہے۔

ہماری اللہ تعالیٰ سے مخلصانہ دعا ہے، پاکستانی عورتوں کو بھی ایسا ہی ایک جج عطا فرما دے۔ جو ان حقوق کو عورتوں کے ہاتھ میں تھمانے کا حوصلہ کرے۔ جن کا وعدہ اللہ نے قرآن پاک میں کیا ہے۔ آمین

شادیوں کے دعوت نامے

دل اداس ہونے کا کوئی ''ٹائم ٹیبل'' نہیں ہوتا لیکن تنہائی کی شدت تھی کہ یکے بعد دیگرے دو شادیوں کے دعوت نامے ملے، تو دل باغ باغ ہو گیا۔ گھر سے باہر نکلنے اور اپنے ہم وطنوں سے ملنے کی توقعات نے تمناؤں کے نئے چراغ روشن کر دیے۔

انگلستان کا ایک پاکستانی جوڑا

پہلی شادی ہفتے کی شام چار کمروں پر مشتمل دوسری منزل کے فلیٹ میں تھی۔ تنگ، گیلی، سیلی اور نیم تاریک سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچے۔ بیٹھنے کے کمرے میں ایک پھلنگا سا صوفہ اور چند کرسیاں بچھی تھیں۔ دلھن کی ماں سبز بنارسی جوڑے میں ملبوس، کھانے کی خوشبو میں رچی، مہمانوں کو گلے لگا لگا کر خوش آمدید کہہ رہی تھیں۔ اگلی ضرورت کسی شناسا چہرے کی تھی لیکن نگاہ تلاش بسیار کے بعد ناکام لوٹی۔ وہاں اجنبی اور بیزار چہروں کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ سب کی مشترکہ پہچان یعنی خاتون خانہ باورچی خانہ سنبھالنے اور مہمانوں کو خوش آمدید کہنے میں مصروف تھیں۔ نہ انھوں نے مہمانوں کا تعارف کرایا، نہ مہمانوں کو توفیق ہوئی کہ آپس میں علیک سلیک کر لیں۔ بیگانہ، بے تعلق اور منہ

http://www.pdfbookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk

لٹکائے بیٹھے رہے۔

دلھن بیس بائیس سال کی ہشاش بشاش، خوش شکل لڑکی تھی۔ چہرے پر لپ سٹک کے علاوہ کوئی میک اپ نہ تھا۔ لیپا پوتی کے بغیر دلھن دیکھنا خوشگوار تجربہ لگا۔ پاکستانی حساب سے کپڑے بڑے سادہ تھے۔ سرخ کریب کا سوٹ اور سرخ دوپٹا جس پر سنہری کناری لگی تھی۔ اس سادگی کے باوجود دلھن دمک رہی تھی۔ حسین چہرے پر تمناؤں کی آب وتاب تھی۔

آخر میری ایک شناسا بھی نمودار ہوگئی۔ یہ شفق عرف چندہ تھی، دلھن کی سہیلی جو اس کے ساتھ ہی کمرے سے باہر آئی۔ چندہ مسز قیصرہ ملک کی بیٹی تھی۔ وہ اسی اسکول میں ہیڈمسٹریس تھیں جہاں کسی زمانے میں، میں نے پڑھایا۔ اس کے شوہر کسی ورکشاپ کے لیے لندن آئے ہوئے تھے۔ یہ پہلی خاتون تھی جسے میں پہلے سے جانتی تھی۔ پہلی آنکھ جو میرے لیے چمکی اور لب میرے لیے مسکرائے۔ ورنہ اک اجنبی سا شہر تھا اور ہم تھے دوستو! شفق سے باتیں کرکے، درد دل سنا اور سن کر بڑا مزا آیا۔ دل کو سکون ملا، قرار سا آیا۔

بے پہچان اور بے نام ہجوم میں آشنا چہرے بڑی نعمت ہوتے ہیں۔ کیسا زعم ہوتا ہے انسان کو اپنے آپ پر......ہم یہ ہیں، ہم وہ ہیں۔ اب پتا چلا کہ ہم کچھ نہیں، ہماری اہمیت، پہچان اور ہمارا وجود عزیزوں، دوستوں اور احباب کا مرہون منت ہے۔ موج ہے دریا میں بیرون دریا کچھ نہیں!

لذتِ کام ودہن کی آزمائش

میز بھرتے ہی کھانے کی دعوت عام دی گئی، یعنی پاکستانی تہذیب کے برملا اظہار کی کھلی چھٹی۔ لوگ تو تیس بتیس ہی تھے لیکن کمرا اس حساب سے چھوٹا تھا۔ عورتیں پہلے سے موجود تھیں، اب اس میں مرد بھی شامل ہوگئے۔ کھانا دیکھ کر اچھے اچھے ہم وطنوں کی سدھ بدھ گم ہوجاتی ہے۔ تحمل وتمیز بھی جاتی رہتی، نگاہ میں صرف کھانا ہوتا ہے۔ سب ایک ساتھ اس کی طرف لپکے، دنیا و مافیہا سے بے نیاز، دائیں بائیں سے بے پروا، واحد مقصد حیات لذت کام ودہن نگاہ میں لیے حصول آرزو کی طرف بڑھے۔

لیکن ابھی عشق کے کئی امتحان باقی تھے۔ اوّل تو یہی کہ صاحب خانہ نے قطار بنانے کی درخواست کر دی۔ باری کے انتظار میں اچھا خاصا وقت کھڑے کھڑے گزر گیا۔ پھر لوگ کھانا ڈالنے لگے، تو بوٹیوں کے انتخاب میں مشغول ہوگئے۔ اچھی بوٹی کی تلاش اور جانچ کا کام ہماری ثقافت کا حصہ ہے، اس کو دلجمعی سے انجام دینا چاہیے۔

ویسے بھی بوٹیوں کا انتخاب زندگی کے ان چند اہم مقامات میں سے ایک ہے جو کبھی کبھی ملتی ہیں۔ اس مقام سے جلد گزرنا کسی طرح بھی مناسب نہیں۔ اگر آپ قطار میں کھڑے اپنی باری کا انتظار کر رہے ہیں، تو معاملہ دوسرا ہے۔ بھوک کی زیادتی کے ساتھ ساتھ بوٹیوں کی تعداد میں کمی کی فکر بھی لاحق ہو جاتی ہے۔ آخر ساغر ہمارے ہاتھ بھی آیا اور کھانا کاغذی پلیٹ میں نکل آیا۔

اب کارِ دارد تھا اس پلیٹ کو ہتھیلی پر جمانا، گرم گرما شوربے اور پلاؤ کی حدت کو ہاتھ پر برداشت کرنا، چھری کانٹا، روغنی نان کا ٹکڑا اور کاغذ کا رومال پکڑ کر بحفاظت تمام میز سے پرے کھسکنا، سرسراتے دوپٹوں اور لہراتی ٹائیوں کو بچانا، پھر کسی دیوار کا سہارا لے کر کھڑے ہونا، لرزتی، چھلکتی پلیٹ کو سنبھالنا، شوربے کو ایک نقطے پر قابو کرکے رکھنا تاکہ نوالہ اس میں ڈوب سکے۔ پلیٹ یوں تھامنا کہ وہ لقمہ کے وزن سے بیٹھ ہی نہ جائے۔ ٹوٹ کر یا چھوٹ کر زمین بوس ہی نہ ہوجائے۔ یہ سارے کرتب اس طرح دکھانا کہ

http://www.bookstube.net
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

آتے جاتے لوگوں کو دھکا نہ لگے۔ قریب کھڑی ہمسائی کی کہنی آپ کے شوربے میں نہ ڈوبے۔ ساڑھی آپ اور ہمسائی کے بچوں کے سالن زدہ ہاتھوں سے بچی رہے اور آپ اپنے بچوں کے منہ میں چند نوالے ڈال لیں......

پیٹ کی خاطر انسان کو کیا کیا جتن کرنا پڑتے ہیں!

شادی کی دوسری تقریب بھی فلیٹ میں تھی، کھانا وہاں بھی گھر پر پکا۔ ابھی تک تقریبات کے لیے دیگی کھانا پکا کر پیسا کمانے کا خیال کسی کو نہیں آیا تھا۔ دوسرے اکثر نوجوانانِ برصغیر شادی کے بندھنوں میں باندھ کر ہی ولایت روانہ کیے جاتے۔ غلطی سے یا جلدی میں ماؤں کے ہاتھ سے نکل جانے والوں کو میموں کے پنجے سے بچانے کے لیے دھونس، دھمکی اور خدا رسول ﷺ کے واسطے دے کر وطن واپس بلایا جاتا۔ پاکستان ہی میں ان کے لیے دیگیں پکتیں اور سہرے کے پھول سجائے جاتے۔ باقی رہ گئیں اکا دکا، چھوٹی موٹی تقریبات تو ان کے لیے کھانے گھر پر ہی پکتے۔ ہنرمند و سلیقہ شعار عورتیں تقریب سے ہفتوں پہلے کھانے پکا کر اپنے اور ہمسایوں کے فریزر میں رکھ لیا کرتیں۔

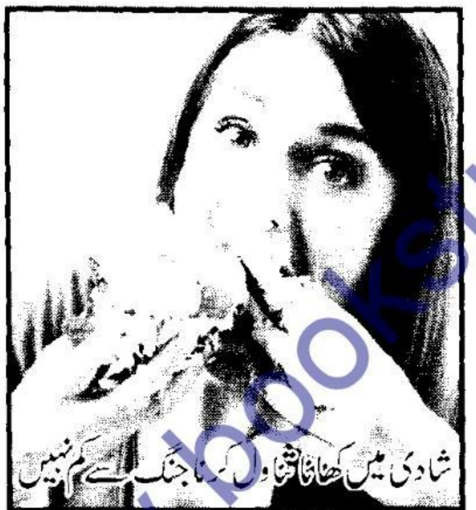
شادی میں کھانا شادی کرنا جنگ سے کم نہیں

خوبیوں والی شادی

اس شادی کی انوکھی بات یہ تھی کہ لڑکا انگریز تھا۔ خیال تھا کہ صرف لڑکے رنگ برنگی لڑکیوں سے شادی رچاتے ہیں۔ اب پتا چلا کہ لڑکیاں بھی کسی سے پیچھے نہیں۔ بہرحال انگریز لڑکا کچھ مشکوک لگ رہا تھا۔ پتا نہ چلا کہ وہ مسلمان ہے یا نہیں؟ اتنا ہمیں پتا تھا کہ غیرمسلم سے مسلمان عورت کا نکاح جائز نہیں۔ چناں چہ جب لڑکی کی اماں نے یہ اطلاع دی تو سمجھ نہ آیا کہ مبارک باد دیں یا پرسہ! بوکھلاہٹ میں حلق سے آواز ہی نہ نکلی۔ نکلی بھی تو بڑی منمنی سی۔ اب ہم جتنے بھی برے مسلمان ہوں، زندگی بھر نماز نہ پڑھیں روزوں کا بھول کر نام نہ لیں، جھوٹ بولیں، دھوکا دیں لیکن لڑکی کی غیرمسلم سے شادی...... توبہ توبہ بڑی معیوب بات اور گناہ تھا۔ ہمیں بھی سن کر صدمہ ہوا۔ ہمارے ممیانے پر لڑکی نے بولنا شروع کیا اور پورا قصہ سنایا۔

لڑکی کسی دفتر میں کام کرتی تھی، وہیں یہ حضرت بھی ملازم تھے۔ پہلے انھوں نے دائیں بائیں ہو کر آنا کانی شروع کی مگر لڑکی ہاتھ نہ آئی۔ پھر ولایتی طریقے سے چائے کھانے کی دعوت دی۔ لڑکی نے وہ بھی ٹھکرا دی اور کہا، مسلمان لڑکیاں غیر آدمیوں کے ساتھ باہر نہیں جاتیں۔ آخر اس نے شادی کا پیغام دیا۔ لڑکی نے اب بھی انکار کر دیا اور بتایا کہ وہ کسی غیرمسلم سے شادی نہیں کر سکتی۔

لڑکا پھر مسلمان ہونے کو تیار ہو گیا۔ لڑکی نے فرمائش کی کہ قرآن اور کچھ اسلامی کتابیں پڑھ لو پھر بتانا کہ مسلمان ہونے کو تیار ہو یا نہیں۔ لڑکے نے وہ بھی پڑھ لیں۔ اب لڑکی کے پاس ٹالنے کے سارے بہانے ختم ہو گئے۔ وہ اپنا مسئلہ لے کر والدین کے سامنے جا پہنچی۔ وہ لڑکے سے بات چیت کے بعد راضی ہو گئے۔

جس وقت ہم شادی والے فلیٹ پہنچے، لڑکی جینز کی پتلون پہنے گھوم رہی تھی۔ دلھن بننے کے پرزور اصرار پر وہ بولی، اب ساری عمر تو مجھے ولایتی قسم کے کپڑے پہننا ہوں گے۔ غالباً جینز میں عمر گزرے۔ پاکستانی دلھن بننے کا

http://www.booksfree.net
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

تکلف کیوں کروں؟ جینز میں نکاح پڑھانے میں کیا حرج ہے؟ لیکن مہمان نہ مانے۔ انھوں نے کھانا نہ کھانے کی دھمکی دے دی، جو کارگر ثابت ہوئی۔

اس شادی میں مہمانوں اور کرسیوں کی تعداد برابر تھی۔ کھانے کے بعد بڑے خوشگوار موڈ میں دلھن اٹھ کر یوں رخصت ہوئی جیسے کوئی مہمان کھانا کھا کر اپنے گھر جا رہا ہو۔ خدا خوش رکھے، ہمیں یہ شادی بڑی پسند آئی۔ بڑی سادہ، آسان اور مسلمان شادی تھی۔ امیر غریب سب کے لیے قابل عمل۔ نہ جان توڑ محنت ہوئی، نہ جان آزار مشقت پڑی۔ نہ ادھار لیا گیا نہ قرض چڑھا۔ نہ مہمانوں کو انتظار کی کوفت ہوئی، نہ بچے بھوک اور بے آرامی سے بلک بلک کر روئے۔ گویا اس شادی میں خوبیاں ہی خوبیاں تھیں۔ دل سے دعا نکلی، کاش آئندہ شادیاں اسی طرح ہونے لگیں۔

افسوس، یہ دعا بھی آرزوئے ناتمام کی فہرستوں میں شامل ہوگئی۔ مہمانوں کی تعداد کم ہونے کے بجائے بڑھتے بڑھتے ہزاروں کے آس پاس منڈلا چکی۔ رسم و رواج ہندوانہ کے ساتھ انگریزی طور طریقے بھی شامل بیاہ ہو گئے۔ منگنی، منھدی، تیل، ابٹن، گانے اور مانجے منائے جاتے ہیں۔ اس کے بعد کیک کٹتے ہیں۔ اگر بس یہیں ہو جاتی، تو بھی غنیمت تھی لیکن خوب سے خوب تر کی جستجو میں لڑکے لڑکیاں ستاروں سے اگلے جہان ڈھونڈنے بہ نفس نفیس نکل کھڑے ہوئے۔ اب ان کو کون روک سکتا ہے، کماؤ اولادیں ہیں۔ تقریب کے لیے عجیب وغریب جگہیں تلاش کی جا رہی ہیں۔ کوئی ہوائی جہاز کرائے پر لیتا ہے، کوئی ساحل سمندر سے کوسوں دور بحری جہاز میں نکاح پڑھوانے پر اصرار کرتا ہے۔

مر گئے تو کیا بنے گا؟

زندگی خوشی اور غم کے بیچ سے گزرتی ہے۔ شادیوں کے فوراً بعد مرنے کا ذکر تکلیف دہ ہے، لیکن موت ہمیشہ بے وقت اور بغیر اطلاع آتی ہے۔ جب آئے تو زندگی کو درہم برہم کر دیتی ہے، اس کے لیے مناسب وقت کوئی بھی نہیں ہوتا۔

ایک سرد اور بے کیف شام اطلاع ملی کہ ہمارے جاننے والوں کا چودہ سالہ بیٹا سر پر چوٹ لگنے سے چل بسا۔ جنازہ اگلی اتوار بعد نماز ظہر ہوگا۔ ان شاء اناللہ کہنے کے بعد حواس بحال ہوئے تو تعجب شروع ہوا، جنازے کو اتنے دن کیوں لگیں گے؟ انتقال ہفتے کے دن ہوا تھا، دفنانے میں پورے ہفتے کا انتظار کیوں؟ جواب میں پردیس کے قانونی چکر، بندشوں اور طور طریقوں کا اندازہ ہوا۔

موت یہاں بھی ہے تو اللہ ہی کے ہاتھ میں، لیکن دفنانے کفنانے کا سارا انتظام انگریز قوم کے سپرد ہے۔ اس لیے نظم وضبط کا انداز وہی ہے جو اس کی باقی زندگی کا وتیرہ ہے۔ سب سے پہلے تو ڈاکٹر لاش دیکھ کر موت کی تصدیق کرے اور سرٹیفکیٹ دے گا کہ مرنے کی وجہ کیا تھی۔ یہ موت ہفتے کے دن ہوئی، اتوار کو ڈاکٹر اور لیبارٹری کی چھٹی تھی۔ بات سوموار پر جا پڑی۔ یہ موت حادثاتی تھی۔ پوسٹ مارٹم ضروری تھا تاکہ پتا چلے، موت میں انسانی ہاتھ کی کارستانی تو نہیں؟ اس میں دو ایک دن لگیں گے۔ سرٹیفکیٹ دکھا کر مردہ نہلانے، کفنانے اور قبر الاٹ کرانے کی اجازت ملے گی۔ اس کے لیے بھی وقت درکار ہے۔

وہ لوگ لندن سے باہر مقیم تھے۔ کیا کیا تکالیف پیش آئی ہوں گی۔ گھر والوں کا پورا ہفتہ کفن دفن کا انتظام کرتے اسی تگ و دو میں گزر رہا ہوگا۔ مردہ لحد کے انتظار میں پڑا تھا، چین کس کو آنا تھا؟ کس نے اس گھر کو کھانے پکا کر بھیجے ہوں گے؟ ہمارے ہاں سوم تک چولھا نہیں جلایا جاتا، سوم کب ہوگا؟ موت کے تین دن بعد یا دفنانے کے تین دن بعد؟ کیا کیا مسائل اٹھتے ہیں غریب الوطنی میں!

نماز کے بعد گھر کی خواتین سے ملاقات ہوئی۔ کمرے میں عجیب سا سناٹا تھا۔ جوان موت پر جس طرح

http://www.booksitube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

ہمارے ہاں خلقت اکٹھی ہو جاتی ہے، اس کا شائبہ تک نہ تھا۔ ماں بچے کی نانی، دادی، پھوپھیوں، خالائیں اور دوسرے رشتے داروں کے نام لے لے کر رو رہی تھی۔ میں اور میرے جیسی غریب الوطن عورتیں موت سے سہمی بیٹھی تھیں۔ مستقبل پر خوف کی پرچھائیاں تھیں:

وطن سے دور مر گئے، تو ہمارا کیا بنے گا؟ کوئی ہمیں رونے والا ہوگا؟ کہاں اور کیسے دفنایا جائے گا؟ فاتحہ نصیب ہوگی؟ موت شہ رگ پر کھڑی لگ رہی تھی۔

اُدھر انگریز پریشان تھے کہ غیر کی موت پر یہ ہنگامہ! ایک بچے کی موت پر لوگ اس طرح اکٹھے ہو گئے؟ ہم نے تو اتنا بڑا جنازہ نہیں دیکھا۔ لوگ تیس، چالیس چالیس میل سے بھاگے چلے آئے ہیں کیونکہ وہ باپ کو جانتے تھے، ماں ان کی عزیز تھی یا چچا سے میل جول تھا۔ کیا قوم ہے، کیا اخلاق ہے؟...... تصویر کا یہ رخ بھی ہے۔

یہودی کی دکان میں

گرتے پڑتے، تجربے کرتے، کچے پکے کھانے پکاتے لندن کی دلربا زندگی شروع ہو ہی گئی۔ خوابوں کی اس حسین دنیا میں پیاز کاٹتے ہوئے آنکھوں سے پانی بہتا اور یوسفؑ کو دیکھے بنا انگلیاں کٹ جاتیں۔ بہشت بریں میں استری کرتے کرتے من ختم، نفس ڈھیر اور کمر ٹوٹنے لگتی۔ بازار جاتے تو ریشم کی ساڑھیاں بھول کر دیگچیاں اور کڑاھیاں ڈھونڈتے۔ کرسٹل کے گلدانوں کے بجائے پیاز کاٹنے کی مشین کے متلاشی رہتے۔ روٹی پکانے کا تو جوئے شیر ہی ہو گیا۔ پھر اس مادر پدر آزاد معاشرے میں ان سب کی تلاش میں نکلنا ایک کارِ دارد تھا۔

بچے ساتھ لے کر نکلتے، تو وقت ان کے چونچلوں میں گزر جاتا۔ چھوڑ کر کہاں اور کس کے پاس جاتے، چناں چہ اسکول اتارنے کے بعد بازار بھاگتے۔ گھڑی پر نگاہ رکھ کر خریداری ہوتی۔ پھر ہانپتے کانپتے سیدھے اسکول جا کر بچوں کو اٹھاتے۔ گھر میں قدم رکھتے ہی یاد آتا "ہائے، دودھ لانا تو یاد ہی نہ رہا۔ ہائے ڈبل روٹی تو ہے ہی نہیں گھر میں!"

نومبر کے آخری ہفتے ہم فلیٹ چھوڑ چار بیڈ روم والے گھر منتقل ہو گئے۔ گھر کے آگے اور پیچھے باغیچے تھے اور آسمان کا نظارہ بلا تکلف تھا۔ مہمانوں کے لیے الگ کمرا جس میں دو لوگ آرام سے سو سکتے تھے، البتہ ایک کمزوری تھی، گھر لندن سے باہر خالص انگریزی علاقے میں تھا۔ وہاں دور دور تک نہ تو کوئی سانولا چہرہ تھا نہ ہمارے ذوق و شوق کی اشیائے ضروریات دستیاب تھیں۔

حلال گوشت کے چکر میں ایک یہودی قصاب کے ہاں پہنچے۔ معلوم ہوا ان کے ہاں بکرے کی رانیں نہیں بکتیں، وہ یہودیوں پر حرام ہیں۔ بیشتر اس کے کہ ہم پوچھ سکتے کہ رانیں کہاں پھینکتے ہو، اس نے پوچھ لیا کہ ہم مسلمان ہیں اور رانیں کھانے کے نقصانات پر ایک لمبا لیکچر دیا۔ لیکچر کے بعد جو گوشت اس نے دیا، لے کر چلے آئے۔ حلال گوشت کی قریب ترین دوکان دس میل دور ساؤتھ ہال میں تھی۔ دو تین چکروں میں عقل ٹھکانے آ گئی۔

دیسی کی کمی نے ولایتی سبزیاں دسترخوان پر رکھنے کی

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

ترغیب دی۔ اللہ کی یہ نعمتیں نہایت لذیذ ثابت ہوئیں۔ البتہ سبزی فروش ہمارا انداز خریداری دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا۔ دس پونڈ پیاز کی فرمائش پر وہ بے ہوش ہوتے ہوتے بچا۔ پانچ پونڈ گاجروں کے مطالبہ پر ترازو اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ ادھر ہم اس قوم کی حرکات دیکھ کر دریائے حیرت کا غوطہ لگا آتے۔

چمکتی، چھچماتی کار سے خاتون اترتی اور ایک سیب خرید کر روانہ ہو جاتی۔ مجال ہے اسے دنیا کی پروا ہوتی۔ عمدہ میک اپ، قیمتی لباس اور ہائی ہیل کا جوتا پہنے ٹک ٹک کرتی خاتون آتی، گھنٹوں چھان پھٹک کے بعد دو عدد چاپیں خرید کر سر بلند کیے رفو چکر۔ قصائی کے ماتھے پر بل پڑتے نہ آواز میں روکھا پن آتا۔ ہر لمحہ نئی دنیا سامنے آ رہی تھی۔

فوجی مالی کی آمد

گھر کے باغ کی حالت یہ تھی کہ درخت، جھاڑیاں اور پودے پھیل پھیل کر آپس میں گتھم گتھا ہو رہے تھے۔ کیاریاں گھاس پھونس اور خودرو پودوں سے اٹی پڑی تھیں۔ لان کی گھاس اونچائی میں فٹوں کو چھونے کی کوشش کر رہی تھی۔ اوپر سے اس جنگل کی لمبائی چوڑائی سما دیتی۔ مکان خریدتے ہوئے اسٹیٹ ایجنٹ نے ذکر بھی کیا کہ گھر کے پیچھے بہت بڑا لان ہے۔ خوابوں کی دنیا میں رہتے ہوئے ہم نے الفاظ پر توجہ ہی نہ دی بلکہ فخر سے کہا "اس کی تو فکر ہی مت کرو، ہمیں باغبانی کا بڑا شوق ہے۔ ہمارے باغیچے ہمیشہ پھولوں سے مہکے ہیں۔" یہ یاد ہی نہ رہا کہ ہمارا شوق باغبانی زبانی جمع خرچ تک ہے۔ مالی کو ہدایات دیتے ہوئے ہم تھک جایا کرتے ہیں۔ زمین کی کھدائی، بوائی سے ہمارا کوئی تعلق نہ تھا۔ پھولوں کی تھوڑی بہت سدھ بدھ تھی اسی پر باغبانی کا دعویٰ کر ڈالا۔

لیکن یہاں تو دنیا ہی دوسری تھی۔ ہاتھ کیا بیلچہ ہلائے بنا چارہ نہ تھا۔ چناں چہ ہاتھ اور بیلچے دونوں چلانے اور ہلانے کی بھرپور کوشش کی۔ تھک ہارنے کے بعد اپنا رونا گھر والوں کے سامنے رویا۔ ہماری بات سننے والے کم تھے اور جو تھے وہ عمل سے گریزاں! امداد کے لیے دائیں بائیں دیکھا، دوستوں سے پوچھا، شرماتے شرماتے ہمسایوں سے ذکر کیا۔ وہاں سے تجویز آئی کہ اخبار فروش کی کھڑکی میں ضرورت باغبان کا اشتہار لگا دو۔

پہلے دو لڑکے اجرت میں خاصی تنخواہ کے طلب گار ہوئے۔ دو چار حوصلہ شکن تجربوں کے بعد ایک نہایت دبے پتلے ریٹائرڈ فوجی معمولی معاوضے پر کام کے لیے تیار ہو گئے۔ تعجب کا اظہار کیا تو بولے، چونکہ پنشن ملتی ہے لہٰذا اس رقم سے زیادہ کمائی کی اجازت نہیں۔

ان کے بڑھاپے کو دیکھ کر میں نے زیادہ اجرت پر آمادگی ظاہر کر دی اور کسی سے ذکر نہ کرنے کا وعدہ کیا۔ لیکن وہ پرانی نسل کا انگریز تھا، ایمان دار، بولا "میں اپنی حکومت کو دھوکا نہیں دے سکتا۔" اللہ، اللہ اور ہم ہیں کہ انھیں کافر کہتے نہیں تھکتے۔

کام شروع ہو گیا۔ بل ہر دو ہفتے بعد تین گھنٹے کے لیے آتے اور بغیر دم لیے کام کرتے۔ چائے کی پیالی بھی کام کرتے پیتے۔ کھانے کی ہر چیز سے البتہ انکار تھا۔ ایسی محنت اور جانفشانی سے کام کرتے کہ ترس آ جاتا۔ بڑھاپا دیکھ کر احساس جرم بھی ہوتا کہ اس عمر میں اتنا کام کر رہے ہیں۔ آخر باغبانی کرکے ہاتھ بٹانے کی کوشش کی۔ ان کی غیر موجودگی میں کچھ کیاریاں صاف کیں، بڑھی شاخیں کاٹ دیں۔ لیکن آئے تو سخت ناراض ہوئے کہ اس کے کام میں دخل دیا۔ غلط شاخیں کاٹیں، گھاس پھونس کے ساتھ پھول بھی نکال باہر کیے۔ پھر تسلی دی کہ جلد اس جنگل پر قابو پا کر اسے باغ میں بدل دوں گا۔

دو تین مہینے بعد شکل نکلنے لگی۔ خالص انگریزی نمونہ کا باغ ابھرنے لگا۔ درمیان میں بیضوی سرسبز لان، اردگرد

http://www.bookstube.net/

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

لہراتی بل کھاتی، کہیں کھلی، کہیں تنگ کیاریاں واضح ہونے لگیں۔ اسی طرح پھول کہیں پستہ قد بوٹے، کہیں اونچے پھولدار درخت۔ کہیں بیلیں، کہیں پھولوں سے اٹی جھاڑیاں کھڑی ہو گئیں۔ کیلنڈر کے حساب سے گرمیاں لیکن ہمارے حساب سے یہ بہار تھی۔ دھوپ کے اندر ہلکی سی خنکی تھی۔ اس میں بیٹھنے کا بڑا مزا تھا۔ وہ الگ بات ہے کہ بیٹھنے کی فرصت مگر کم تھی۔

شگفتہ اور چمکدار پھول کھل رہے تھے، لیکن خراماں خراماں۔ جیسے بہار کو جانے سے روک رہے ہوں۔ بہار اطمینان سے آئی تھی، جانے کی اسے بھی جلدی نہ تھی۔ سورج کی حدت پھولوں کے لیے طمانیت بخش اور رنگ گہرا کرنے والی تھی۔ کلیوں کا کم کم کھلنا ہم نے یہیں دیکھا۔ نیم وا کلی کو دیکھ کر شاعروں آنکھیں یاد آئیں۔ ہمیں کلیاں دیکھ کر شعر یاد آئے۔

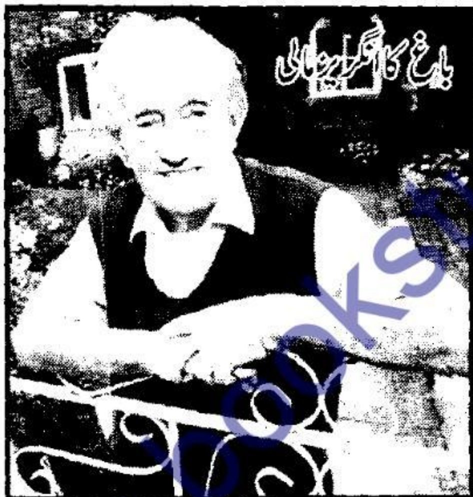

پھولوں کی پنیری خرید لائی۔ قیمت پوچھ کر بڑے ناراض ہوئے کہ آج کل کی لڑکیوں کو پیسے پھینکنے کا بڑا شوق ہے۔ میں آدھے پیسوں میں لاتا۔ اس کے بعد بیج اور پنیری بھی ان کے ذمے ہوگئی۔ لگاتے بھی اپنی مرضی سے! اب میں ان کی اجازت سے اور ہدایت کے مطابق اپنے باغ میں کام کرتی۔

وہ پھر کچھ کہے سنے بغیر غائب ہو گئے۔ پوچھنے پر پتا چلا کہ بیٹی کے گھر چلے گئے تھے۔ پھر یہ ہونے لگا، ہر دو تین مہینے کے بعد ناغہ کر لیتے اور خود ہی واپس آ جاتے۔ ہم نے پوچھنا اور فکر کرنا چھوڑ دیا۔ خیال ہوتا، تینوں میں سے کسی ایک بچے کے پاس گئے ہوں گے۔ باتوں باتوں میں پتا چلا، ان کے کمرے کا قالین بدلنے والا ہے۔ نیا قالین کے لیے اتنی محنت کر رہے ہیں۔ میں نے اپنے حساب سے کہا "اپنے کسی بچے سے کیوں نہیں کہتے کہ قالین ڈلوا دیں۔ بولے "کیا میں فقیر ہوں کہ مانگوں؟" واہ کیا خودداری تھی!

ہمسایوں کی ناشپاتیوں سے لدی ڈالیاں دیوار کے اوپر سے ہماری طرف جھک آئیں۔ جب وہ پکنے پر آئیں تو میں فکرمند ہوئی کہ بچوں کو پھل کھانے سے کیونکر منع کروں؟ بل صاحب سے ذکر کر بیٹھی۔ انھوں نے مژدہ سنایا کہ قانون یہ ہے، جو پھل جس کی طرف ہے، اسی کا ہے۔ بلاتکلف کھاؤ۔ اس کے بعد ہمسائی سے بھی تصدیق ہو گئی۔ کیا الٹ پلٹ دنیا ہے۔ ایک غیر اسلامی ملک میں اسلامی قانون رائج ہے اور دھڑلے سے اس پر عمل ہو رہا ہے۔ ادھر مسلمان اپنے ملکوں سے اسلامی کیا ہر قانون نکالنے پر کمر بستہ ہیں۔ اللہ ہو غنی! مسلمان کہیں ہیں، دعویٰ مسلمانی کہیں اور ہے۔ مسلمان کہیں اور اسلام کہیں اور ہے۔

بل دو ڈھائی سال لگاتار آتے رہے۔ پھر ایسے غائب ہوئے کہ سال گزر گیا۔ فون ان کے پاس تھا نہیں جو پتا کرتے۔ کئی دفعہ خیال آیا کہیں چل ہی نہ بسے ہوں۔ کچھ عرصہ تو باغیچے کی دیکھ بھال خود کی پھر اس کی حالت بگڑنے لگی تو تنگ آ کر ایک مالی رکھ لیا۔ اس کو کام کرتے دو تین مہینے ہوئے ہوں گے کہ اچانک پہنچ گئے۔ مالی کو کام کرتے دیکھ کر خاموش کھڑے رہ گئے۔ چہرہ سفید ہو گیا۔ میں نے بہتیرا اندر بلایا، چائے کی دعوت دی لیکن انکار میں سر ہلایا اور واپس چلے گئے۔ میں آوازیں دیتی رہ گئی۔ مجھے لگا جاتے ہوئے بل کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

(اس دلچسپ آپ بیتی کا اگلا حصہ اگلے ماہ پڑھنا نہ بھولیے گا)

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

جب تین پاکستانیوں نے بھرا انوکھا

سوانگ

غیروں سے متاثر اور اپنی قومیت پہ شرمندہ ہم وطنوں کو آئینہ دکھانے والا تیر اثر قلم پارہ

طیبہ اکمل

سارہ قریشی کی بیش قیمت کار جیسے ہی ہوٹل کے سامنے رکی، ڈرائیور نے لپک کر دروازہ کھول دیا۔ انھوں نے ادا سے اپنے بال جھٹکتے ہوئے گاڑی سے قدم باہر رکھا۔ باہر نکلتے ہی کیمرے اٹھائے ٹی وی چینل والے اور رپورٹر بجلی کی تیزی سے ان کی طرف لپکے، مگر وہ انھیں نظر انداز کرتے آگے بڑھ گئیں اور تھوڑی دیر بعد شروع ہونے والی تقریب کے انتظامات کا جائزہ لینے لگیں۔ سارہ قریشی کا شمار ملک کے بہترین ڈیزائنروں میں ہوتا تھا۔ ان کے بنائے گئے ملبوسات کی اندرون و بیرون ملک بڑی مانگ تھی۔

آج اس پنج ستارہ ہوٹل میں ان کے نت نئے ملبوسات کی تقریب رونمائی ہے۔ یوم آزادی کے موقع پر انھوں نے قومی پھول، چنبیلی کو بنیادی اہمیت دیتے ہوئے تمام ملبوسات میں اسی کے رنگ، نقش و نگار اور پرنٹ کو مدنظر رکھتے ہوئے متعارف کرانے کا فیصلہ کیا۔ توقع تھی کہ ان کی اس کاوش کو عوام و خواص میں سراہا جائے گا۔ تقریب کے انتظامات سے مطمئن ہونے کے بعد وہ اپنے سیکرٹری کو ہدایات دینے لگیں کہ مہمان خصوصی کے آنے پر میڈیا سے گفتگو کریں گی۔ آج اس تقریب کی مہمان خصوصی ملک کی خاتونِ اول تھیں۔

تھوڑی دیر بعد مہمان خصوصی کی آمد کی اطلاع آئی تو وہ پھرتی سے باہر پہنچیں اور ان کا پُرتپاک خیر مقدم کیا۔ مہمان خصوصی نے نفیس قینچی سے فیتہ کاٹ کر تقریب کا افتتاح کیا اور ملبوسات کا جائزہ لینے لگیں۔ مہمان خصوصی

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

نے سارہ قریشی کی اس کاوش کو خوب سراہا جس پر وہ خوشی سے پھولی نہ سما رہی تھیں۔ تقریب میں شہر کی معزز خواتین اور بہت سی ماڈلز شامل تھیں۔ انھوں نے سارہ قریشی کے خیال کو ملک کے لیے بہترین تحفہ قرار دیا۔

آخر میں خاتونِ اول اور سارہ قریشی میڈیا کے نمائندوں کی طرف بڑھیں اور تقریب کے بارے میں گفتگو کرنے لگیں۔ ایک سوال کے جواب میں انھوں نے کہا "چنبیلی کے پھول بچپن ہی سے مجھے پسند ہیں اور میں نے پسندیدگی کی تحریک اپنی دادی سے پائی۔ وہ ہر روز اپنے بالوں میں چنبیلی کے پھول لگایا کرتی تھیں۔ کچھ عرصہ پہلے مجھے احساس ہوا، چنبیلی کے پھول کی اہمیت ہمارے ہاں کم ہو رہی ہے۔ تب میں نے سوچا قومی پھول کی اہمیت اجاگر کرنے کے لیے یہ عمدہ طریقہ ہے۔ خوش قسمتی سے میرے خیال کو بے حد سراہا گیا۔"

تقریب ختم ہوتے ہی وہ اپنی گاڑی کی طرف بڑھیں۔ بیٹھتے ہی کار ان کے "سارہ ولا" کی طرف فراٹے بھرنے لگی۔ جیسے ہی وہ اپنے عالی شان گھر پہنچیں تو سارہ قریشی کی نظر برآمدے پر پڑی۔ کیا دیکھتی ہیں کہ وہاں مالی نے چنبیلی کے نئے پھول لگائے ہیں جس پر بہت سے بھونرے اور شہد کی مکھیاں رس چوس رہی تھیں۔

یہ دیکھتے ہی ان کا پارہ آسمان کو چھونے لگا۔ انھوں نے غصے سے مالی کو آواز دی جو ایک کونے میں گوڈی کرنے میں مصروف تھا۔ آواز سنتے ہی وہ اس طرح لپکا اور بیگم صاحبہ کے سامنے حاضر ہو گیا۔ وہ غصے میں فرما رہی تھیں "تم نے یہ "اولڈ فیشن" اور سستے پھول یہاں کیوں لگا دیے؟ تم جانتے ہو، ان کی وجہ سے سارا دن یہاں شہد کی مکھیاں پھریں اور بیٹھنا دوبھر کر دیں گی۔ اب کون باغیچے میں یہ پھول لگاتا ہے؟ تم جانتے ہو کہ مجھے ٹیولپ بے حد پسند ہے۔ اس جیسا نفیس اور مہنگا پھول پوری دنیا میں نہیں۔ انھیں فوراً یہاں سے اکھاڑو اور ٹیولپ لگاؤ۔ یہ کہہ کر وہ ماتھے پر تیوری چڑھائے اندر چلی گئیں۔"

☆☆

آج پورے گاؤں میں جشن کا سماں تھا۔ دیہاتیوں کے مسیحا اور خادم المعروف گدی نشین اور رکن قومی اسمبلی الیکشن جیتنے کے بعد پہلی دفعہ باضابطہ طور پر جلسے میں اپنی عوام کا شکریہ ادا کرنے آ رہے تھے۔ اب لوگوں کو اپنے ادھورے خوابوں کی تکمیل کا وعدہ پورا ہوتا نظر آیا۔ گاؤں کے خادم، شاہ باسط علی نوجوان، پرعزم اور تعلیم یافتہ تھے۔ بیشتر زندگی یورپ میں گزاری تھی مگر الیکشن قریب آئے، تو باپ کے بلاوے پر وطن واپس لوٹ آئے۔

انھوں نے سادہ دل لوگوں کو اپنی چکنی چپڑی باتوں سے موہ لیا اور الیکشن میں جیت کر قومی اسمبلی کے رکن بن بیٹھے۔ اس تقریب کے لیے شاہ باسط علی نے بڑے زور و شور سے تیاری کی تھی اور اردو میں بہترین تقریر لکھوائی۔ یہ ان کے سیکرٹری نے نامور ادیب سے تیار کرائی تھی اور وہ کئی بار اس کی مشق کر چکے تھے۔ تقریب کا آغاز ہوا تو عوام کا جوش و جذبہ دیدنی تھا۔ ہر کوئی اپنے مسیحا کی ایک جھلک دیکھنے کو بے تاب تھا۔

تقریب میں شاہ باسط علی نے لوگوں کے جوش و جذبے کو سراہا اور کہنے لگے "اگرچہ میں نے تمام زندگی ملک سے باہر گزاری، مگر آپ کے درمیان اپنائیت کا جو احساس اور اپنی زبان میں بات کر کے جو طمانیت و سکون نصیب ہوا، وہ زندگی بھر نہیں ملا تھا۔ میں غیر ملکی زبان میں اپنے احساسات کا اظہار یوں کبھی نہ کر سکا جو میری زبان نے مجھے دیا۔ جلد ہی میں اپنے تمام وعدے پورے کروں گا ان شاء اللہ۔"

یہ کہتے ہی تقریب کا اختتام ہوا۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی انھوں نے اپنے ڈرائیور کو حکم دیا "Drive Fast"

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

(گاڑی تیز چلاؤ)۔ حویلی پہنچتے ہی وہ والد کے کمرے میں پہنچے اور کہنے لگے ''او پاپا ہم کبھی ترقی نہیں کر سکتے۔ ان دِس ماڈرن ایج (اس جدید دور میں بھی) ہم ابھی تک اردو ہی پر پھنسے ہوئے ہیں۔ آج کل اردو کو کوئی اچھا نہیں سمجھتا، ہر طرف انگریزی کا بول بالا ہے۔ اگر ہم انگریزی نہیں سیکھتے' تو کل غیر ملکی اقوام سے کیسے مقابلہ کریں گے؟ پلیز ٹاک ٹو پی ایم (برائے مہربانی وزیراعظم سے بات کریں)، ہماری قومی زبان انگریزی ہونی چاہیے۔ ویسے بھی میں زیادہ دیر اردو میں بات نہیں کر پاتا اور یہاں کے جاہل لوگ انگریزی سمجھتے نہیں۔ اولڈ فیشنڈ پیپلز (پرانے زمانے کے لوگ)۔''

شاہ قاسم علی نے بیٹے کو تسلی و تشفی دی اور سمجھا بجھا کر بھیج دیا۔ پھر خود بھی اس مسئلے پر غور کرنے لگے۔ انھیں امید تھی کہ وزیراعظم اس مطالبے کو مان جائیں گے۔ کیونکہ انھیں معلوم تھا، آکسفورڈ یونیورسٹی میں تعلیم پاتے ان کے بیٹے نے بھی کل کو اس ملک کا وزیراعظم بننا ہے۔ اسے بھی انہی مشکلات سے گزرنا پڑے گا۔ یہ سوچتے ہی انھوں نے وزیراعظم کو فون گھما دیا۔ مگر شاید وہ یہ بھول گئے کہ جو قوم اپنی زبان سے کنارہ کشی اختیار کر لے، اس کا نام بھی مٹ جاتا ہے۔

☆☆

شہر کے دو بہترین اسکولوں کی ہاکی ٹیموں کے درمیان آج میچ ہے۔ سن رائز ہائی اسکول کی ٹیم کے کوچ بے حد پرجوش تھے۔ انھوں نے اپنے طلبہ کی بہت اچھی تربیت کی تھی۔ انھیں پوری امید تھی کہ ان کی ٹیم جیت جائے گی۔ اور ایسا ہی ہوا۔ ان کی ٹیم نے مخالف ٹیم کو دو گول سے ہرا دیا۔ پورے اسکول میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

اگلے دن صبح سویرے ہیڈ ماسٹر نے کوچ حامد کو اسٹیج پر بلایا اور اظہار خیال کی دعوت دی۔ کوچ بڑے فخر سے اسٹیج کی طرف بڑھے اور تمام طلبہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہنے لگے ''مجھے اپنی ٹیم کے طلبہ پر فخر ہے۔ ہاکی ہمارا قومی کھیل ہے' مگر افسوس کہ اسے سرکاری سطح پر وہ پذیرائی نہیں ملتی جو کرکٹ کو حاصل ہے۔ ہماری انہی غلطیوں کی بدولت آج قومی ہاکی ٹیم زبوں حالی کا شکار ہے۔ میری آپ سے استدعا ہے کہ ہاکی کے کھیل میں نام پیدا کریں اور ملک کا پھر سے کھویا ہوا مقام بحال کرنے کا عہد کریں۔''

تالیوں کی گونج میں وہ اسٹیج سے اتر گئے۔ اسکول سے فارغ ہوتے ہی کوچ صاحب نے گھر کا رخ کیا۔ ان کا گھر متوسط علاقے میں واقع تھا۔ گھر پہنچتے ہی انھوں نے اپنے چھے سالہ بیٹے کو گود میں اٹھا لیا۔ وہ خوشی سے کہنے لگا ''ابو میں بھی آپ کی طرح بڑا ہو کر ہاکی کھیلوں گا اور ملک کا نام روشن کروں گا۔''

وہ کچھ دیر اپنے بیٹے کے ساتھ کھیلتے رہے۔ پھر اپنے کمرے کی طرف بڑھے اور بیوی سے کہنے لگے ''ہاکی جیسے کھیل کا ہمارے ملک میں کوئی مستقبل نہیں۔ میرا دوست عظیم جو میرے ساتھ ہی زمانہ طالب علم میں کرکٹ کھیلنے لگا تھا، آج قومی ٹیم میں ہے اور لاکھوں روپے کما رہا ہے۔ میری زندگی یہیں اسی اسکول میں گزر گئی اور میں کوئی مقام نہ پا سکا۔ میں تو اپنے بیٹے کو کرکٹ کی طرف لے کر جاؤں گا۔ اس ملک میں ہاکی والوں کو کوئی نہیں پوچھتا۔''

یہ سنتے ہی بیوی اُن کی تقریر کے الفاظ یاد کرنے لگی جو انھوں نے کل ہی اسکول میں کی تھی۔ ہمارے ملک میں نجانے کیوں جو چیز ''قومی'' کا درجہ پا جائے اسے ہم کمتر اور شرمندگی کا باعث سمجھنے لگتے ہیں۔ جبکہ ''ولایتی'' چیز کو ہم سر آنکھوں پر رکھتے ہیں۔ کیا یہ ہمارے احساس کہتری کی دلیل نہیں؟

◆◆◆

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

وکھوکھ

ان دو دلوں کی داستانِ عجب
جو پیار کا قرب پا کر بھی ایک نہ ہو سکے
اور دنیاوی بکھیڑوں میں الجھ کے رہ گئے

اشفاق احمد

میں اس کو پورے انتالیس سال، گیارہ مہینے، آٹھ دن اور پانچ گھنٹے بعد ملا۔ اس کی شکل و صورت بالکل ویسی تھی جیسی پچھلی سالگرہ پر ......تب اس نے اٹھارہ موم بتیاں بجھا کر اپنا چہرہ سرخ اور ماتھا عرق آلود کر لیا تھا۔ میرا چھوٹا بھائی اس کی تین سوا تین سیر کی گت تھام کر کھڑا تھا جو موم بتی کو پھونک مارتے وقت پیٹھ اور کندھے سے پھسل کر میز کے کنارے سے ٹکراتی تھی۔ ہم ہر موم بتی بجھنے پر تالیاں بجاتے۔

آج میں اپنے پوتے کے ولیمے کے لیے دو قصائیوں سے گیارہ بکرے کٹوا رہا تھا۔ ٹاھلی کے اس کھنڈ پر بیٹھا تھا جو پچھلے دو سال سے لان کنارے پڑا تھا۔ اب اس کے ساتھ دونوں چھولداریوں کے رسّے بندھے تھے۔ کافی گوشت بن چکا تھا اور ابھی بہت سا باقی تھا۔ میں قصائیوں سے محبت بھری گفتگو کرتے ہوئے انہیں ولایت کے قصے سنا رہا تھا۔ وہ محبت سے میری گفتگو سنتے ہوئے اچھی طرح سمجھ رہے تھے کہ میری نظر ان کے کام پر ہے اور ارادوں پر بھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے ناخوش اور بیزار ہنسی خوشی اپنا اپنا کام کر رہے تھے۔

جب ریحانہ وہاں آئی تو ''انجائنا'' اور ''بیٹا بلاکر'' کی گولیاں پابندی سے جذب کرنے والا میرا دل پہلے تو تین چار مرتبہ زور سے دھڑکا پھر بالکل ساکت ہو گیا۔ جب اس نے میرے سامنے آ کر ''ہیلو'' کہا تو میرے گردے کی ساری پتھریاں ایک دم کڑکڑائیں اور میں نے بلبلا کر اپنی کمر پر ہاتھ رکھ لیا۔ پھر وہ جس تیزی کے ساتھ آئی تھی، اسی تیزی سے باہر نکل گئی۔

اس نے اپنی بھاری بھرکم گت کٹوا دی تھی اور کٹے ہوئے بال کانوں سے ذرا نیچے تھے۔ شلوار قمیص چھوڑ کر اس نے ساڑھی پہننا شروع کر دی تھی۔ اور اپنے بدن کو

http://www.bookstube.net/

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

ڈائٹنگ کے زور پر بے حد اسمارٹ بنا لیا تھا۔ بڑے قصائی نے گوشت بنانا چھوڑا اور غور سے میری طرف دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں محبت اور شفقت کی نمی تھی۔ چہرے پر آگہی کی روشنی اور زبان حال کی گویائی تھی۔ ممکن ہے، اس نے بھی اپنی جوانی میں کسی خوبصورت لڑکی سے علاقائی زبان میں محبت کی ہو۔ پھر شاید شریکوں نے اس کی محبوبہ کو اونٹ سے نیچے گرا کر باپ کی نگاہوں کے سامنے ذبح کر دیا۔ بچارے قصائی نے خوفزدہ ہو کر کسی بے محبوبہ سے شادی کر لی۔ ہو سکتا ہے! سب کچھ ہو سکتا ہے! ہو کیوں نہیں سکتا بھلا!!

تھوڑی ہی دیر بعد ریحانہ ٹینٹ سروس والوں کی ایک کرسی گھسیٹتی وہاں چلی آئی۔ اس کی ساڑھی کے پھول پہلے کے مقابلے میں زیادہ کاسنی اور زیادہ بڑے ہو گئے۔ اس نے کرسی لا کر میرے سامنے رکھی اور کہنے لگی ''کھڑے نہیں، کرسی پر بیٹھو۔''

میں نے کہا ''مہربانی! تم نے خواہ مخواہ اتنی زحمت کی۔ مجھے ان پر بیٹھنے کی عادت ہو گئی ہے، اس کرسی پر تم بیٹھو۔''

وہ اسی طرح کھڑی رہی اور میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے بولی ''پتا نہیں ہم کتنے سال بعد آج ملے ہیں۔ مجھے تو صدیاں ہی لگتی ہیں۔''

میں نے کہا ''صدیاں نہیں ریحانہ ہم پورے اکتالیس سال گیارہ مہینے آٹھ دن اور پانچ گھنٹے بعد ایک دوسرے سے ملے ہیں۔''

ریحانہ ہنسی تو اس کے گالوں کے دونوں ڈمپل بننے سے رہ گئے۔ کہنے لگی ''تم نے ایسا پورا پورا حساب کیسے لگا لیا؟''

میں نے جیب سے کیلکولیٹر نکال کر کہا ''اس پر حساب لگا کر صحیح جواب نکالا ہے۔ اور اگر اس میں تمہارے مائیوں بیٹھنے کے بعد اندھی اور اندھیاری یک منٹی ملاقات بھی شامل کر لی جائے، تو پھر تو گھنٹے اور کم ہو جاتے ہیں۔''

ریحانہ نے بڑے قصائی کی طرف بے پروائی سے دیکھا اور پھر کہنے لگی ''اس ساری مدت میں تم نے کیا کیا؟''

میں نے کہا ''کرنا کیا تھا، بس عمر بڑھائی ہے۔ ایک مکان بنایا، دو بچوں کی شادیاں کیں، پنشن لی ہے۔ بلڈ پریشر بڑھایا اور دو ہارٹ اٹیک لیے۔ تھوڑی سی ذیابیطس کرائی ہے۔ ذرا سا موتیا اتروایا ہے۔ اگلے سال بہار میں آپریشن کراؤں گا، اور تو کوئی خاص کام نہیں کیا۔''

ریحانہ ہنس کر کہنے لگی ''تم نے پھر بھی چھوٹی سی زندگی میں بڑے کام نپٹا لیے۔ ہم تو وہیں رہ گئے بیوقوف۔ کچھ ہوا ہی نہیں۔ زندگی آگے نکل گئی اور ہم ''اسٹیشن'' پر ویسے ہی کھڑے رہ گئے۔ کچھ ہو ہی نہیں سکا۔''

قصائی نے کہا ''اندر سے ٹب منگوائیں صاحب

صاحب مضمون

اردو کے مشہور افسانہ نگار اور ادیب، اشفاق احمد ۲۲ راگست ۱۹۲۲ء کو فیروز پور (ہندوستان) میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۷ء میں ہجرت کر کے پاکستان چلے آئے۔ گورنمنٹ کالج، لاہور سے اردو ادب میں ایم اے کیا۔ بیرون ممالک بھی تعلیم پائی اور وطن واپس آ کر مختلف سرکاری و نجی اداروں سے وابستہ رہے۔ افسانوں کے پانچ مجموعے شائع ہوئے۔ سوز و گداز، نرماہٹ اور مقصدیت آپ کے افسانوں کی بنیادی خصوصیات ہیں۔ ۷ ستمبر ۲۰۰۴ء کو وفات پائی۔

http://www.bookstube.net/

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

جی۔‘‘

میں نے کہا ’’یہیں صف پر ڈھیر کرتے جاؤ، نائی خود آ کر بندوبست کر لیں گے۔‘‘

اس نے بہت مری اور ڈری سی آواز میں کہا ’’گوشت زیادہ ہے اور صف چھوٹی، آگے آپ کی مرضی۔‘‘ میں نے اس کی بات پر کوئی توجہ نہیں دی۔

جب میں نے ریحانہ سے کہا، مجھے اجازت دو کہ میں پھر کھنڈر پر بیٹھ جاؤں اور اپنے آپ کو اجازت دو کہ وہ کرسی پر بیٹھ جائے، تو اس نے بڑی سنجیدگی سے ’’شکریہ‘‘ کہہ کر کرسی پر بیٹھنا منظور کر لیا۔

☆☆

جب ریحانہ سے میری ملاقات ہوئی تو وہ نویں میں پڑھتی تھی اور میں سیکنڈ ایئر کا طالب علم تھا۔ جب وہ کالج میں داخل ہوئی، تو میں بی۔اے کا اسٹوڈنٹ تھا۔ جب وہ ’’چاٹی ریس‘‘ میں اوّل انعام لے کر گھر آئی، تو میں اپنا پہلا مشاعرہ پڑھنے ٹاؤن ہال گیا ہوا تھا۔

اگلی صبح اس نے اپنا کپ مجھے دکھایا اور میں نے اس کے ماتھے سے لے کر ناک کی ٹپ تک اپنی انگلی سے سیدھی لکیر کھینچتے ہوئے کہا ’’یہ چاٹی ریسیں، کھیل کھلنڈریاں، جسمانی ورزشیں، یہ سب ہلکی چیزیں ہیں۔ ذہنی سربلندیوں کے مقابلے میں بے معنی اور لایعنی مظاہرے، بے حقیقت باتیں اور گھاٹے کے سودے ہیں۔ میں نے کل ٹاؤن ہال میں غزل پڑھی ہے، پوچھ لو جا کر کسی سے۔‘‘

اس نے اپنا کپ میرے قدموں میں رکھا اور شرمندگی سے سر جھکا کر کھڑی ہوگئی۔ کہنے لگی ’’بھیا نے گھر آ کر بتایا تھا کہ آپ نے تو مشاعرہ لوٹ لیا۔ بڑے سوز سے ترنم کیا۔‘‘

میں نے کہا ’’بیوقوف لڑکی وہ خالی ترنم اور خالی سوز ہی نہیں تھا۔ اس میں فکر تھی اور دانش ونشان دہی بھی۔‘‘

ریحانہ اپنی ذات میں خجالت سے پگھل سی گئی۔ وہ جس قدر خوب صورت تھی، اس قدر سادہ لوح اور احمق بھی! وہ ہنر مندی اور عقلمندی سے زندگی بسر کرنے کی اہل نہیں تھی۔ وہ زندگی کو اپنے اوپر سے ایسے گزرنے دیتی جیسے زندگی دانش، علم یا عقل سے کوئی برتر اور فزوں تر چیز ہو اور اپنی مرضی سے گزرنے کے لیے بنی ہو! ریحانہ کے ہاتھ، اس کی بات، انداز اور بدن میں کوئی ہنر نہ تھا۔ دین سے اسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ دنیا کی اسے کوئی سمجھ نہیں تھی۔ وہ بڑے یقین سے نہایت بیوقوفی کے ساتھ بے یقین اور بے اعتبار زندگی بسر کر رہی تھی۔

> ہم تو وہیں رہ گئے بیوقوف۔ کچھ ہوا ہی نہیں۔ زندگی آگے نکل گئی اور ہم ’’اسٹیشن‘‘ پر ویسے ہی کھڑے رہ گئے۔

جب ہم نئے نئے ریحانہ کے خاندان سے واقف ہوئے تو وہ نویں جماعت میں پڑھتی تھی۔ کندھے پر دو بھاری بھرکم گٹھڑیں اٹھا کر جاپانی کپڑا بیچنے والا جب ان کی ڈیوڑھی میں اترا تو ریحانہ کی ڈیوٹی لگی کہ وہ تھان ڈیوڑھی سے لے کر اندر امی اور خالہ کو دکھائے اور ترتیب وار بھاؤ بتائے۔ تین چار چکر کاٹنے کے بعد جب امی نے رنگدار ساٹن کی قیمت پوچھی تو ریحانہ نے ڈیوڑھی میں آ کر پھیری والے سے کہا ’’بھائی! آٹھ آنے گز قیمت زیادہ بتلانا۔ امی ضرور قیمت کم کریں گی۔ مجھے بار بار چکر لگانے پڑیں گے۔ تمھارا بھی نقصان ہوگا۔‘‘ پھیری والا ہنس پڑا اور اس نے خوش ہو کر یہ بات ہم سب کو سنائی۔

میں نے حق اور سچ کی خاطر یہ بات اس کی امی اور ابو

http://www.bookstube.net/

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

کو بتائی اور ان سے درخواست کی کہ وہ ریحانہ کو صحیح، صاف اور حقیقت سے بھرپور زندگی بسر کرنے کے رموز سمجھائیں ورنہ اس کی عمر مظلومیت اور بیچارگی میں گزرے گی اور اس سے ارتقائے انسانی کا قافلہ آگے نہیں چل سکے گا۔

ایک روز ہم سب اپنی حویلی کے پچھواڑے چھوٹے سے باغ میں کھیل رہے تھے۔ ہم کوئی چھوٹے بچے نہیں تھے۔ میں تیرہ غزلیں لکھ چکا تھا اور ریحانہ چاٹی ریس میں اوّل انعام حاصل کر چکی تھی۔ اچانک زور کی سیاہ آندھی اٹھی اور رات کا سماں ہو گیا۔ آندھی کے جھونکے پتے بجانے اور حویلی کے دروازے کو ہولے ہولے کھڑکانے لگے۔ ہم سب خوفزدہ ہو گئے، تو ہماری نوکرانی بیبو نے کہا ''اگر کوئی پہلوٹھی کی لڑکی اپنی خالی پشت اڈتی آندھی کو دکھا دے، تو آندھی رک جاتی ہے اور اس کا رخ مڑ جاتا ہے۔''

ہم سب بیبو کی بات اچھی طرح سے سمجھ گئے، لیکن ریحانہ الو کی طرح کھڑی ہمارا منہ تکتی رہی۔ جب میں نے بیبو کی بات کا انگریزی ترجمہ کر کے اسے سمجھایا، تو وہ شرما گئی اور گھبرا کر بولی ''اس گروہ میں پہلوٹھی کی لڑکی تو صرف میں ہوں۔ لیکن میں یہ کام سب کے سامنے نہیں کروں گی۔''

میری چھوٹی بہن نے کہا ''ہائے ریحانہ باجی! خدا نہ کرے سب کے سامنے کیوں! وہ سامنے بابے نورے کا کوٹھا ہے، اس پر چڑھ کر آندھی کو روک دیں۔ سب کے سر سے بلا ٹل جائے گی۔''

بابا نورا مالی تھا اور سائیس بھی۔ لنگر پکا لیتا تھا اور گاؤں گاؤں گھوم کر خالص شہد اور گھی جمع کرتا۔ اس کے کوٹھے کے اوپر کبوتروں کا ڈربا تھا۔ اوپر ہی اس نے تنور لگایا ہوا تھا جس میں وہ کبھی کبھار بجی تیار کر کے ذیلدار کے مہمانوں کو کھلایا کرتا۔

ریحانہ کوٹھے کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی اور ساتھ ساتھ کہے جا رہی تھی ''ہائے اللہ! خدا کی قسم...... میں نے نہیں جانا......'' اس طرح سے آندھیاں رکی ہیں کبھی...... میں نے واپس اتر آنا ہے آدھی سیڑھیوں سے۔'' اور ہم نیچے سے چلائے ''نہ نہ۔ اللہ کے واسطے نیچے نہ اترنا...... بڑی زبردست کالی آندھی ہے...... سخت نقصان کر کے جائے گی۔ جاؤ شاباش...... جاؤ''

میری چھوٹی بہن شرارت سے اونچی آواز میں کہنے لگی ''بس باجی آپ کو جانا ہے اور آنا ہے...... کوئی دیر تو نہیں لگانی زیادہ۔''

ریحانہ ''نہیں نہیں، ناں ناں'' کہتی سیڑھیاں چڑھتی جا رہی تھی اور ہم نیچے اچھل اچھل کر تالیاں بجا رہے تھے، جیسے عقلمند لوگ احمقوں کو الو بناتے وقت دل ہی دل میں اچھل کر تالیاں بجایا کرتے ہیں۔

☆☆

اس وقت میں ٹاہلی کے پرانے کھنڈ پر بیٹھا قصائیوں سے گوشت بنوا رہا تھا اور ریحانہ میرے سامنے ٹینٹ والوں کی دو رنگی نواڑ والی کرسی پر بیٹھی تھی۔ اس کی ناک کے دائیں نتھنے پر اب بھی بھورے رنگ کا ستارے جیسا تل تھا جسے اب اصولاً مسہ بن جانا چاہیے تھا لیکن وہ نہیں بنا۔

جب اسے مائیوں بیٹھے دوسرا دن تھا، تو میں رات کے وقت اس کے کمرے میں پہنچ گیا۔ اس کے بدن سے ہلدی، تیل، چنبیلی، حنا اور نافے کی خوشبو آ رہی تھی۔ ماتھے اور مانگ میں سیب، چندن، کھتے اور بھوسی کی جلی مہک تھی۔ ہم بڑی گرم جوشی سے ملے اور پھر رک گئے۔ میں اس کے سامنے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھ کر کھڑا تھا اور اس نے میری دونوں کلائیاں بڑی مضبوطی سے تھام رکھی تھیں۔

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

اس کی امی اندھیرے میں دیا سلائی جلاتی اچانک نمودار ہوئیں اور مجھے اس طرح کھڑے دیکھ کر بولیں "اب کیا فائدہ..... اب کیا حاصل....."

رخصتی کے وقت دولھا خود کار چلا رہا تھا۔ سیاہ رنگ کی آسٹن گاڑی تھی جس کے بونٹ پر انگریزی کا "اے" کھڑا تھا۔ گاڑی پورچ سے نکلنے سے پہلے ریحانہ نے اپنی امی سے میرا نام لے کر کہا کہ وہ نظر نہیں آتے۔ انھوں نے اونچی اونچی آوازیں دے کر مجھے بلایا۔ میں ڈرا ڈرا اور سہما سہما گاڑی کی کھڑکی کے پاس آ کر بزرگوں کی طرح کہنے لگا "اچھا بھئی ریحانہ، خدا حافظ اور اللہ کے حوالے..... خوش رہنا..... اور اپنا خیال رکھنا....."

اس کے شوہر نے گاڑی کا آئینہ گھما کر میرا چہرہ اس میں فوکس کیا اور پھر کہا "اب اجازت دیں، دیر ہو رہی ہے..... بڑا لمبا سفر درپیش ہے۔" ساتھ بیٹھے والد نے بھی یہی کہا کہ لمبا سفر درپیش ہے، زنانہ ساتھ ہے۔ اب اجازت دیجیے۔

ریحانہ نے سر جھکائے آہستہ سے کہا "ایک تو لوگوں کو ہر وقت جلدی پڑی رہتی ہے۔ پتا نہیں کس بات کی؟" پھر وہ سسکیاں بھر کر رونے لگی جیسے دلھنیں رویا کرتی ہیں۔

میں چھولداری کے اندر پرانے کھنڈ پر بیٹھا قصائیوں سے گوشت بنوا رہا تھا اور ریحانہ میرے سامنے بیٹھی تھی۔ اس نے اپنی ریشمی ساڑھی کا پلو تیزی سے اپنی کمر کے ساتھ لپیٹا، تو اس میں سے فرانسیسی پرفیوم کی خوشبو لہر کی طرح پھیلی۔ چھوٹے قصائی نے سر اوپر اٹھایا اور پھر پٹھ کی گنڈیریاں کاٹنے میں مصروف ہو گیا۔

ریحانہ کی شادی وزارت خارجہ کے افسر سے ہوئی تھی لیکن وہ اپنی بے پناہ خداداد قابلیت کی بنا پر چند سال کے اندر ہی سفیر بن گیا۔ پھر ریحانہ کی خبر ضرور آتی رہی لیکن وہ خود نظر نہیں آئی۔ کئی سال گزر گئے۔

اب پورے انتالیس سال، گیارہ مہینے، آٹھ دن اور پانچ گھنٹے کے وقفے کے بعد وہ میرے سامنے ٹینٹ والوں کی نواڑی کرسی پر بیٹھی تھی اور میرے دل کے اندر اس کی محبت ڈسٹلڈ واٹر بننے والے بخارات کی طرح قطرہ قطرہ بن اتر رہی تھی۔ روح کی ہرنالی سے ٹھنڈے، مقطر، مصفا قطرے میرے دل پہ چھپک چھپک کر اسے دھو رہے تھے اور قلب کے نیچے ہلکے جامنی رنگ کی ایک تتلی سی جاری تھی۔ میں خوش تھا اور شکر کر رہا تھا کہ ہم دونوں کی شادی نہیں ہو سکی۔

میرے ساتھ رہ کر وہ بھی ہنرمند، عقلمند اور میری طرح سے زمانہ شناس اور رمز آشنا جاتی۔ ہم لکھنے پڑھنے والے ادیب اور شاعر لوگ جس طرح ہر بات کی تہ کو فوراً پہنچ جاتے ہیں، اس کو بھی یہ فن سیکھ لینا تھا۔ ہمیں بھی جس طرح ہر اعلان، بیان اور گفتگو کے پیچھے اس کے اصل محرکات کا علم ہو جاتا ہے اور اصل صورت حال سے واقفیت ہو جاتی ہے، اس کو بھی مجھ سمیت میرے ساتھیوں کے ساتھ رہ کر اس علم سے آشنائی ہو جاتی تھی۔

اس نے بھی میری طرح انسانیت سے محبت تو کرنی تھی، لیکن لوگوں کو ایک ایک کر کے نکتہ چینی اور غیبت کی تکلی پر کس کر کوڑے برسانے تھے..... لفظ انسان سے بے پناہ الفت کرنی تھی اور قریب سے گزرتے ہوئے سچ مچ کے بندے کا دل جلانا اور اس پر کُڑھنا اچھا لگتا تھا..... میرے ساتھ رہ رہ کر اس نے جس حویلی کے لان میں بیٹھنا تھا، وہاں کالی سیاہ آندھی کو خود ہی جھلا کر ہر ایک کو ننگا کر دینا تھا.....

خدا کا کتنا بڑا کرم ہوا، کیسی مہربانی ہوئی..... اگر ہم

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

ایک ساتھ رہتے، تو ہمیں گھر بیٹھے نارتھ کیرولینا، ساؤتھ کوریا، ایسٹرن یورپ اور ویسٹ ورجینیا کی اندرونی خرابیوں کا علم ہو جاتا۔ ہم پورٹوریکن کانگرس کے پس پردہ عوام سے واقف ہوتے۔ مٹسوبشی کے آئندہ سال کے بجٹ سے آشنا ہوتے۔ اس ریحانہ نے جو میرے سامنے بیٹھی ہے، میری جراتوں سے بے پناہ فائدہ اٹھا کر میری طرح جری ہو جانا تھا۔ میں نے حق گوئی اور بیباکی کا ساتھ نہیں چھوڑنا تھا۔ کڑوی بات منہ پر کہنی تھی۔ منافقت کے خلاف جہاد کرنا تھا۔ اس نے بھی میرے اس وتیرے کو اپنا کر کیش کرنا تھا۔

ہیرے اور ہار خریدنے تھے۔ کارنر پلاٹ لینے تھے۔ غیر ملکی سفر اختیار کرنے تھے۔ پھر اس نے ویسی نہیں رہنا تھا جن کی گاڑیاں ''ٹیشن'' پر کھڑے کھڑے چھوٹ جاتی ہیں۔ اس نے زندگی سے بھی آگے نکل جانا تھا، اتنا آگے کہ وہاں زندگی کی کشش بھی ختم ہو جاتی تھی۔ اس کے ویٹی باکس میں نقب زنی کا سب سے کارگر اور مہلک اوزار ''انفارمیشن'' ''ڈیٹا'' اور ''میڈیا ڈوسیئر'' ہر وقت موجود ہونا تھا۔ اس نے ''بنیادی انسانی حقوق'' یا ''پرامن بقائے باہمی'' کے نام پر ہم سب کو چھیل، ادھیڑ، کاٹ اور ہلا کے رکھ دینا تھا۔ جیسے آنجوزے میں جامن ڈال کر کھڑکاتے ہیں، ویسے کھڑکا دینا تھا۔

اگر میری ریحانہ سے شادی ہو جاتی، تو اس کے ماتھے اور مانگ سے چندن، کتھے، سیب اور بٹھور کی خوشبو آتی، نہ ہی اس کی ناک کے دائیں نتھنے پر براؤنش گولڈ کلر کا یہ تل رہنا تھا۔ لونگ اور ستارے کے سائز والا...... وہ بڑھ کر سیاہ مسہ بنتا اور اس کے سفید نتھنے سے کالے کیڑے کی طرح چمٹ جاتا۔ اچھا ہی ہوا، بلکہ بہت ہی اچھا ہوا۔

اللہ کے کرم اور اس کی مہربانیوں کے انداز نرالے ہیں۔ وہ جسے انا، خود پسندی، خودفروشی، خودغرضی، خودرائی کے چکر سے بچانا چاہے، صاف بچا کر لے جاتا ہے۔ ایسے لوگ باغ ہستی میں پھول کی طرح کھلتے ہیں۔ دائیں بائیں جھولتے جھومتے ہر ایک کو ''ہیلو ہیلو'' کہتے کہتے ایک دن خوشبو کی طرح فضا میں تحلیل ہو جاتے ہیں...... بڑی شرافت اورخودفراموشی کے ساتھ، ہنسی خوشی، جھومتے جھامتے، گاتے بجاتے۔

میں کئی سال کی ''سیلف پٹی'' اور خواہ مخواہ کی خود ساختہ قربان گاہ سے باہر نکل کر پہلی مرتبہ ریحانہ کی محبت کے نشے میں چور ہو گیا۔ وہ میرے سامنے بیٹھی تھی اور میں اس کی محبت کے افشردہ سے عقیدت کے چھوٹے چھوٹے تنکے اور سوکھی پتیوں کے دست بستہ بھورے چورے نکال اسے زندگی کے حضور پیش کر رہا تھا۔

پھر میرا دل چاہا کہ اس کے ساتھ لمبی بات کروں، لمبی اور نہ ختم ہونے والی بات! اتنی لمبی کہ ختم ہو جانے کے بعد بھی اسی طرح جاری رہے۔ زیادہ نہیں تو کم از کم ولیمے کے شروع ہونے تک ایک رات اور آدھا دن ہم اسی طرح اسی مقام پر بیٹھے باتیں کرتے رہیں۔ میں نے کہا ''ریحانہ تمھاری منجھلی بیٹی کی بڑی دھوم ہے۔ وہ آج کل کہاں ہے؟''

ریحانہ نے قدرے لاتعلقی سے کہا ''پہلے اس نے انگلستان سے ٹرائی پوس کیا تھا۔ پھر برین ڈائز یونیورسٹی میں چلی گئی۔ آج کل برکلے میں کچھ کر رہی ہے۔ مشکل مشکل سے کام ہیں۔ مجھے تو ان کا کچھ پتا نہیں چلتا بہرحال کچھ کر رہی ہے۔''

میں نے کہا ''بھئی وہ تو ہمارے ملک کی ایک عظیم ریاضی دان بن کر ابھر رہی ہے اور تم اس سے اتنی بے خبر ہو؟''

http://www.bookstube.net

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

اس پر وہ زور زور سے ہنسنے لگی، اتنی زور سے کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ہنستے ہنستے بولی ''تم کو جو ماسٹر بھودیال حساب پڑھانے آیا کرتے تھے، وہ اپنی سائیکل کے اگلے پہیے پر پیر رکھ کر بریک لگایا کرتے تھے۔ ہر مرتبہ بریک لگاتے وقت ان کی جوتی اتر جایا کرتی تھی......''

وہ پھر ہنسنے لگی، تو میں بھی اس کے ساتھ ہنسی میں شریک ہو گیا۔ ہم دونوں کو اپنے اپنے زاویے سے ماسٹر بھودیال سائیکل پر بیٹھے، ماتھے کی عینک لگائے، پاؤں سے پہیے کو بریک لگاتے نظر آئے۔ آگے سے چنن کمہار کے گدھے آ گئے۔ ادھر ماسٹر بھودیال کے پاؤں سے جوتی نکلی ادھر وہ سندر سنگھ کی بھوری بھینس پر گرے۔ بھینس خوفزدہ ہو کر ایک دم اٹھی۔ میں اور ریحانہ چوبارے کی کھڑکی میں کھڑے اتنا ہنسے کہ ہنستے ہنستے ایک دوسرے سے چمٹ گئے اور ہم نے اپنی آنکھیں ایک دوسرے کے کندھوں سے پونچھ پونچھ کر خشک کر لیں۔

ہم دونوں کو اس طرح ہنستے دیکھ کر قصائیوں نے گوشت بنانا چھوڑ دیا اور اپنے اپنے بغدے بوریوں پر رکھ ہمیں دیکھنے لگے۔

اتنے میں ریحانہ کے شوہر ہزایکسیلنسی شہباز نصیر دونوں ہاتھوں سے تالی بجاتے وہاں پہنچے اور اپنے کولھوں پر ہاتھ رکھ کر بولے ''بھئی تم یہاں ہو ریحانہ اور میں سارے گھر میں تم کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر عاجز آ گیا ہوں۔ چلو اٹھو، جلدی کرو، ورنہ دکانیں بند ہو جائیں گی۔''

ریحانہ نے خوشامدانہ لہجے میں کہا ''آپ خود نہیں چلے جاتے شہباز۔''

''کمال ہے بھئی، حد ہو گئی۔'' شہباز نے طوطے کی طرح سر گھما کر کہا ''کام آپ کا اور جاؤں میں۔ مجھے کیا ضرورت پڑی ہے؟ چلیے اٹھیے، جلدی کیجیے......فوراً''

ریحانہ نے اٹھتے ہوئے کہا ''ایک تو لوگوں کو ہر وقت جلدی پڑی رہتی ہے، پتا نہیں کس بات کی۔''

جونہی وہ دونوں باہر گئے، بڑے قصائی نے کہا ''صاحب جی اب تو حب منگوا دیجیے، بوٹی بوٹی الگ ہو گئی ہے......وکھو وکھ......الگ الگ!!''

◆◆◆

سنہری باتیں

☆ حسن خلق یہی ہے کہ تم پر جفائے خلق کا مطلق اثر نہ ہو۔
☆ نہ کسی کے ساتھ محبت کرنے میں جلدی کرو اور نہ عداوت کرنے میں عجلت سے کام لو۔
☆ استغفار کو اپنی زبان کی عادت، اقرار کو اپنے دل کی عادت اور اطمینان وسکون کو اپنے باطن کی عادت بنا لو۔
☆ جب تک ترا اِترانا اور غصہ کرنا باقی ہے، اپنے آپ کو اہل علم میں شمار نہ کر۔
☆ وہ رزق کی فراخی جس پر شکر نہ ہو اور وہ معاش کی تنگی جس پر صبر نہ ہو، فتنہ بن جاتی ہے۔
☆ دنیا دار عالم گدھ کے مانند ہے جو آسمان پر اڑتا ہے مگر مردار کھاتا ہے۔
☆ اللہ تعالیٰ سے راضی رہ، وہ بھی تجھ سے راضی رہے گا۔
☆ جو شخص حرام کی آگ اور برائیوں کا ایندھن جمع کرتا ہے اس کے دین اور ایمان کا گھر ضرور بھڑک اٹھے گا۔
☆ جب تم کسی عالم کو بادشاہ یا حاکم کے پاس جاتا دیکھو، تو جان لو کہ وہ چور ہے۔ (انتخاب: سعید اللہ کیانی، اسلام آباد)

http://www.bookstube.net
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

مقامِ ذکر ہے سبحان ربی الاعلیٰ

علامہ اقبالؒ صوفی کی ہیئت میں

شاعرِ مشرق مفکرِ امت ہی نہ تھے بلکہ انھوں نے تجدیدِ افکارِ تصوف کا فریضہ بھی انجام دیا

زید گل خٹک

تصوف کا مادہ تخریج صوف ہے جس کے معنی آراستہ کرنا، ایک سیدھ میں رکھنا، منظم کرنا وغیرہ لیے جا سکتے ہیں۔ تصوف دراصل اسلام کا باطنی نظم اور شریعت مطہرہ کی روحِ محرکہ ہے۔ قرآن مجید میں اس کو ''تزکیہ'' کا نام دیا گیا۔ حدیث پاک میں اس کا نام ''احسان'' رکھا گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے لفظ تصوف کا کئی مواقع پر ذکر فرمایا ہے! ''میں نے اپنے بھائی موسیٰؑ، ہارونؑ اور یونسؑ کو دیکھا کہ صوف کا جبہ پہنے ہوئے ہیں۔''

ایک سفر میں رسول اللہ ﷺ سے ایک جماعت نے ملاقات فرمائی جنھوں نے صوف کا لباس پہنا ہوا تھا۔ نبی کریم ﷺ نے نادار صحابہ کرامؓ کے لیے جو چبوترا بنوایا تھا، وہ بھی صُفہ کے نام مشہور ہوا۔ لیکن ان تمام روایات کے باوجود تصوف کسی خاص علامت کا نام نہیں بلکہ یہ ایک عملِ تزکیہ ہے جس کی انتہائی اور مطلوب شکل احسان ہے۔

ان اللہ یحب المحسنین O ان رحمۃ اللہ قریب من المحسنین O ان اللہ لایضیع اجر المحسنین ایسی آیات مبارکہ اس پر شاہدِ عادل ہیں۔

حکیم الامت حضرت علامہ اقبالؒ جہاں ایک عظیم فلسیوف اسلام، مفکرِ امت اور ترجمانِ ملت ابراہیمیؑ تھے، وہاں ایک بلند پایہ مصلحِ تصوف بھی ہیں۔ بلکہ درست یہ ہے کہ آپؒ نے تجدیدِ افکارِ تصوف کا فریضہ انجام دیا۔ آپؒ جہاں تصوف کے غیر عملی اور روایتی دعویداروں پر گرفت کرتے ہیں۔ یونانی افکار کے زیرِ اثر جو گوسفندیت ہماری متصوفانہ تحریروں اور اشعار میں سرایت کر گئی، اس کا بھی سخت ناقدانہ جائزہ لیتے ہیں۔ وہیں تصوف کے اسلوب نکھار کر پیش کرتے اور مسلمانوں کو نگاہِ

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

فقر اور دل بینا کا سزاوار بنانا چاہتے ہیں۔

تیغِ ایوبی، نگاہِ بایزیدؒ
گنج ہائے ہر دو عالم را کلید
شوکتِ سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود
فقرِ جنیدؒ و بایزیدؒ تیرا جمال بے نقاب

ان رشحاتِ جلیلہ پر مستزاد یہ کہ کیا علامہ اقبال خود بھی ایک صوفی تھے؟ جی ہاں! آپ ایک صاحب مقام صوفی ہیں۔ آپؒ نے سلسلۂ قادریہ میں اپنے پدرِ بزرگوار حضرت شیخ نور محمد قادریؒ کے ہاتھ پر بیعت فرمائی تھی۔ البتہ آپ کا مشرب قلندری رہا۔ اپنے کلام میں آپؒ عموماً ابوالمعارف امام جلال الدین رومیؒ کا ذکر کرتے ہیں۔ جاوید نامہ میں خصوصاً جہاں آپ نے اپنے روحانی اسفار میں حسین بن منصور حلاجؒ سے اپنی ملاقاتوں کا ذکر کیا ہے، اس سے اظہر من الشمس ہے کہ آپ کا جادہ و منزل کیا ہے:

پیرِ رومی مرشدِ روشن ضمیر
کاروانِ عشق و مستی را امیر
نورِ قرآں درمیانِ سینہ اش
جامِ جم شرمندہ از آئینہ اش

پیامِ مشرق میں فرماتے ہیں:

مرشدِ رومیؒ حکیم پاک زاد
سرِّ مرگ و زندگی برما کشاد

اہل نظر تصوف کے مراتب سے بخوبی واقف ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ارادۂ ظہور فرمایا۔ وہ ذات بحت اپنے اعیان ثابتہ کو اعیان خارجہ میں دیکھنے کا بقدرۃ کاملہ متمنی ہوئی: کنت کنزاً مخفیا...... الخ میں ایک پوشیدہ خزانہ تھا...... میں نے چاہا کہ پہچانا جاؤں۔ تب اللہ نے ارادہ فرمایا اور پھر امر فرمایا' اس طرح امر کن سے فیکون کا تکوینی معنوی اور تخلیقی عمل شروع ہوا: انما امرہ اذا اراد شیئاً ان یقول لہ کن فیکون۔ اللہ تعالیٰ کی صفات کی تجلیات امر کی تحریک سے نزول کے مراتب میں ظہور در ظہور فرماتی چلی آئیں۔ وجود کے یہ مراتب باتفاقِ صوفیا کچھ یوں ہیں:

۱۔ عالم ہاہوت، ذاتِ بحت کا مقام یعنی حجاب اکبر ہے۔ یہ مقام علویت اور کبریت پر دلالت کرتا ہے وگرنہ وہ اطراف واکناف، اشارہ وتحدید سے پاک ومبرا ومنزہ ہے۔

۲۔ عالم لاہوت، صفات کی لطیف تجلیات کی ہمہ ہمی کا مقام۔

۳۔ عالم جبروت، ارواح کا مقام، معانی کا مقام بھی یہ ہے۔

۴۔ عالم ملکوت، ملائکہ کا مقام۔

۵۔ عالم مثال، ارواحِ متشکلہ کا مقام۔

۶۔ عالم ناسوت، ہمارا مادی جہان

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں:

میں بندۂ ناداں ہوں، مگر شکر ہے تیرا
رکھتا ہوں نہاں خانۂ لاہوت سے پیوند

آپ اسی لاہوتی فکر کو عالمِ اسلام میں احیا دینے کے خواہاں ہیں:

اک ولولۂ تازہ دیا میں نے دلوں کو
لاہور سے تا خاکِ بخارا و سمرقند

آپ سالک کو صرف تجلیات کی نیرنگیوں تک محدود نہیں رکھتے بلکہ اس کو ذات میں فنا کا درس دے کر بے خودی و سرمستی کے دریائے ناپیدا کنار میں غوطہ زن کرنا

http://www.bookstube.net
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

چاہتے ہیں۔ تصوف کو صعودی ارتقا کے بعد نزولی برکات کے لیے روبہ عمل لانے کے آرزومند ہیں:

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

حکیم الامتؒ تصوف کو روحانی و سائنسی، دونوں جہات میں کارفرما دیکھنا چاہتے اور اس کا فلسفہ وسعتِ فکری سے بیان کرتے ہیں۔ یعنی نسل آدم کو خلافت کا جو بلند مقام عطا ہوا' اس کا شرف تو اپنی جگہ لیکن اس کے سرمدی اور دینوی تقاضے کیا ہیں؟ چناں چہ فرماتے ہیں:

یہ ہیں سب ایک ہی سالک کی جستجو کے مقام
وہ جس کی شان میں آیا ہے، علم الاسماء
مقامِ ذکر، کمالاتِ رومی و عطار
مقامِ فکر، مقالات بو علی سینا
مقامِ فکر، پیمائشِ زماں و مکاں
مقامِ ذکر ہے سبحان ربی الاعلیٰ

علامہ اقبالؒ معرفت کا سفر ذاتِ خویش سے شروع کرنے کا اسلوب بتاتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے نفس کے اندر معرفت ودیعت فرمائی ہے۔ اس کو پہلے عمل تزکیہ یعنی مجاہدہ سے آلائشوں سے پاک کیا جائے پھر اپنا (خود) اصل تلاش کیا جائے اور سالک خود میں نظر ڈال کر معرفت کا گوہر نایاب پالے۔ یحییٰ بن معاذ الرازیؒ نے کیا خوب فرمایا ہے: من عرف نفسه فقد عرف ربه

عجب نہیں کہ خدا تک تری رسائی ہو
تری نگہ سے ہے پوشیدہ آدمی کا مقام

خودی کا یہی سفر بے خودی کی جانب گامزن ہوتا ہے اور حکیم اقبال سرمدی الطاف و عمیم کی جستجو فرماتے ہیں۔:

گیسوئے تاب دار کو اور بھی تاب دار کر
ہوش و خرد شکار کر، قلب و نظر شکار کر
عشق بھی ہو حجاب میں، حسن بھی ہو حجاب میں
یا تو خود آشکار ہو یا مجھے آشکار کر
تو ہے محیطِ بے کراں، میں ہوں ذرا سی آبجو
یا مجھے ہمکنار کر یا مجھے بے کنار کر

حکیم الامتؒ کا منشورِ تصوف ذاتِ خویش کے گرد نہیں گھومتا بلکہ تزکیہ کے عمل سے گزر، خود کو پا، خدا کی معرفت حاصل کر کے، وظائفِ حیات کی طرف لوٹنا ہے تاکہ خلافت کے فرائضِ منصبی بحسن و خوبی ادا ہو سکیں۔ فرماتے ہیں:

اند کے اندر حرائے دل نشیں
ترکِ خود کن سوئے حق ہجرت گزیں
محکم از حق شو سوئے خود گام زن
لات و عزائے ہوس را درشکن
لشکرے پیدا کن از سلطان عشق
جلوہ گر شو برسر فارانِ عشق
تا خدائے کعبہ بنوازد تیرا
شرحِ انی جاعلٌ سازد ترا

ترجمہ: پہلے اپنے دل کے غارِ حرا میں خلوت نشیں ہو جا۔ اپنے وجود کی دنیا چھوڑ کر حق کی طرف ہجرت کر لے۔ حق سے طاقت لے کر اپنے وجود کی جانب لوٹ آ اور ہوس کا بت خانہ پاش پاش کر دے۔ اب سلطنت عشق کے لشکر جمع کر لے اور فارانِ عشق پر محمد ﷺ سے وفا کا جلوہ دکھا تاکہ خدائے کعبہ تجھے نوازے اور تیرے سر پر خلافت ارضی کا تاج سجا دیا جائے۔

http://www.bookstube.net
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

شاطر چور

ایک ہوس پرور کا ناقابل فراموش قصہ،
لالچ کے دام میں پھنس' اس نے
اپنے پیشے کی لاج برباد کر ڈالی

اشرف صبوحی

ساہوکاروں کے ایک قصبے میں دو چور رہتے تھے۔ بڑے دھاڑی، جتھے والے جس کو تاکا ننگا کر کے چھوڑا، جس گھر میں گھسے پوری صفائی کر دی مگر جب لوٹا بھرپور اسامی کو! غریبوں کو کبھی نہیں ستایا، بلکہ امیروں کی دولت سے بیسیوں بیواؤں، سیکڑوں اندھے دھندوں کی ہمیشہ مدد کی۔ سفید پوش بھوکوں کا ان سے گزارہ چلتا تھا۔

اتفاق سے ان دونوں میں کچھ ان بن ہو گئی۔ ایک دوسرے کی گھات میں رہنے لگے۔ ہر پیشے میں ایک شرافت ہوتی ہے۔ دشمن ہو کر بھی وضعداری کا پاس رہا۔ خون کے پیاسے تھے، تاہم ایک دوسرے کی آبرو پر ہاتھ نہ ڈالا۔ پولیس نے اپنی اپنی جگہ دونوں کو گانٹھنا چاہا۔ کیا مجال ہے کہ کسی نے ساتھ دیا یا پرائی دوستی کو تیسرے ہاتھ سے قطع کرانے کی ٹھانی۔ یہاں تک کہ دونوں بوڑھے ہو کر خانہ نشین ہو گئے۔ جوانی کی کمائی پر عمر کے باقی دن کاٹنے لگے۔

ان دونوں کا ایک ایک لڑکا تھا۔ چوروں کے بیٹے سوداگر یا منشی تو ہونے سے رہے۔ مثل مشہور ہے کہ باپ پر پوت پتا پر گھوڑا، بہت نہیں تو تھوڑا تھوڑا۔ ان کا بھی چوری ڈکیتی کی ہی باتوں میں جی لگتا۔ جب دیکھا کہ چوری کے سوا ان کی طبیعت کا لگاؤ کسی دوسری طرف نہیں تو

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

خیال کیا کہ پھر بے استادے کیوں رہیں؟ دونوں اپنے اپنے لڑکے کو لے کر ایک پرانے استاد کے پاس پہنچے۔

چوروں کا گرو گھنال بستی کے باہر قبرستان میں تکیہ جمائے بیٹھا تھا۔ دور دور سے لوگ چوری کی گھاتیں سیکھنے آیا کرتے تھے، چناں چہ دونوں لڑکوں کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا گیا اور دونوں باقاعدہ شاگرد ہو گئے۔ چوری علم سینہ ہے، سفینے میں کہاں' پھر بے عمل علم کس کام کا؟ اس فن میں کمال پیدا کرنے کے لیے پورے پچیت استاد کی ضرورت ہے۔ اناڑی چور ہمیشہ مار کھاتے ہیں۔ دیوار پھاندنا، کونبل کرنا، تالے توڑنا آسان نہیں۔ چوری کہنے کو تو معمولی بات ہے لیکن اس کی ندرتوں کو دیکھنے سے معلوم ہو گا کہ یہ محض اُچکا پن نہیں، بڑا دلیرانہ و عاقلانہ ہنر ہے۔

کئی برس گزر گئے اور دونوں لڑکے اچھے اچھے سورماؤں کے کان کاٹنے لگے۔ بڑی بڑی چوریوں میں شریک ہوئے۔ مسافروں کو خوب جُل دیے' مگر استاد کو ابھی پورا اطمینان نہ تھا۔ جب تک وہ ان کا الگ الگ امتحان نہ لے لیتا کیسے نیابت کی پگڑی باندھتا؟ اس لیے ایک دن دونوں ہونہار شاگردوں کو بلا کر کہا "چھورو! تم سیکھ تو سب کچھ گئے ہو پر اپنے ہاتھ پاؤں سے تو کوئی ہنر دکھاؤ۔"

جھبرا: "استاد جو کہو۔ حکم ہو تو آج ہی لکھی بنیے کی بہو کے کپڑے اتار لاؤں؟"

دھنا: جوالا کے پوت کی سگائی ہے۔ بڑا مال ہوگا۔ رات کو لگا دوں کونبل؟

استاد: نہ رے، یہ کام ابھی کرنے کے نہیں' پھر کر لینا۔ میں تو جب جانوں کہ فقیرا میواتی کے چھپر کے اوپر جو تونبے (کدو) پڑے ہیں، ان میں سے بیچ کا تونبا توڑ لاؤ۔

جھبرا: "واہ استاد! یہ بھی کوئی کمال ہے؟"

دھنا: "اچھی کہی۔ اس بے چارے بڈھے بڑھیا کے تونبے میں کیا رکھا ہے۔

استاد: "ارے میرا بھی تو بڑھاپا ہے' سٹھیا گیا ہوں۔ دیکھیو، لائیو بیچ ہی والا تونبا! تم دونوں میں جو تونبا لائے گا بس وہی پکا چور ہے۔ کل ہی پگڑی بندھ جائے گی۔"

دونوں استاد کی بات پر ہنستے اور اس کی بے وقوفی کا دل ہی دل میں مذاق اڑاتے اپنے اپنے گھر گئے۔

فقیرا میواتی کبھی خاصا مال دار کاشت کار تھا۔ ادھر بڑھاپا آیا' ادھر کئی جوان بچے مرے۔ کمر ٹوٹ گئی۔ ہار کر بیٹھ گیا۔ دو میاں بیوی تھے۔ جھونپڑی کے آس پاس کچھ ترکاریاں بو لیتا انہی کی آمدنی پر گزارا کرتا۔ اس نے تونبوں کی ایک بیل بھی لگا رکھی تھی۔ ان کی پرورش کا ایسا ڈھب اسے آ گیا کہ جب وہ پک جاتے تو دور دور سے لوگ لینے آتے۔

چھپر برسوں پرانا تھا۔ اسی پر تونبوں کی بیل چڑھی رہتی اور جب تک تونبے پک کر تیار نہ ہو جاتے، دونوں بڈھے بڑھیا چھپر کے نیچے بیٹھے ان کی دیکھ بھال کیا کرتے۔ بیل کی خاطر چھپر مرمت بھی نہ کرتے۔ رات کو دونوں میں سے کوئی نہ کوئی جاگتا رہتا کہ ایسا نہ ہو' اندھیرے اجالے کوئی قصبے کا لونڈا چھپر پر چڑھ پکے ہوئے تونبے توڑ لے جائے۔

جھبرا تو گھر جا کر یہ سوچتا ہی رہا کہ استاد نے یہ کیسی چوری بتائی ہے۔ مذاق تو نہیں کیا؟ بھلا تونبے کا چرانا بھی کوئی کاریگری ہے۔ چار ٹکے کا تونبا اور مفت کی جان جوکھوں۔ فقیرا بڈھا تو ہے پر اس کی دھاک ساری بستی مانتی ہے۔ چھپر کا بانس بانس گلا ہوا' یہ کیا بات ہوئی' لیکن دھنا اپنے استاد کے حکم کا بندہ تھا۔ وہ فقیرا کی جھونپڑی کو دیکھتا ہوا گھر آیا۔

آدھی رات ہونے کو آئی' تو اس نے ایک بلی پکڑی۔

http://www.bookstube.net

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

ایک رسی کمر سے باندھی اور ایک چاقو انٹی میں لگا کر روانہ ہوا۔ جھونپڑی کے برابر میں نیم کا درخت تھا۔ چپکے سے آ کر اس پر چڑھ گیا اور کان لگا کر سننے لگا کہ فقیرا اور اس کی بڑھیا جاگتے ہیں یا سو گئے۔ جب خراٹوں کی آواز کے سوا کوئی آواز نہ آئی تو نیم کی ٹہنی میں جھول کر آہستہ سے چھپر پر اترا۔ چھپر میں اتنی سہار کہاں تھی' پرانا ٹھاٹر چر چر کرنے لگا۔ گلا ہوا پھونس گرنا شروع ہوا۔ بڑھیا کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے چھپر پر کسی کی آہٹ پا کر میاں کو جگا دیا۔ ''سنتے ہو جگو کے باپ، کوئی نامراد چھپر پہ اپنی گور پوت رہا ہے۔''

بڈھا کروٹ لے کر بولا ''کیا ہے؟ تیرا تو دماغ چل گیا ہے۔ پڑی رہ! رات کو بھی سونے نہیں دیتی۔''

اتنے میں پھر کھڑ بڑ ہوئی اور چھپر میں سے مٹی جھڑی۔ بڑھیا کہنے لگی ''ارے میرا دماغ نہ چلا ہے۔ ذرا باہر نکل کر تو دیکھ' تونبے لے جائے گا تو پھر روئے گا۔''

دھنا نے جو بڑھیا کو یہ کہتے سنا تو جھٹ بلی کا گلا دبایا۔ وہ زور زور سے خُرخُر میاؤں میاؤں کرنے لگی۔

بلی کی آواز سن کر بڈھا بہت جھلایا اور بولا ''کہتا نہیں کہ تُو باؤلی ہوگئی ہے۔ سن یہ تیری میا بول رہی ہے۔ تجھے رات دن چور دکھائی دیتے ہیں۔ نہ آپ سوئے نہ سونے دے۔ چپکی پڑ جا' اب کے بولی تو مار بیٹھوں گا۔''

بڈھا بڑھیا تُو تُو میں میں کرتے رہے اور دھنا نے چاقو نکال کر درمیان والا تونبا کاٹ لیا۔ وہ پندرہ بیس سیر سے کم نہ تھا۔ اسے سنبھال کر اترے کیوں کر؟ چھپر کمزور اور اتنا بوجھ۔ ادھر فقیر بڑا خفا ہو رہا تھا، مگر بڑھیا برابر سر تھی کہ ایسی نیند بھی کس کام کی؟ گھر لٹ جائے اور تُو پڑا پڑا باتیں ملایا کرے۔ یہ تو کوئی تونبے کا چور ہے۔

خیر دونوں میں تکرار بڑھنے لگی۔ وہ کہتا تھا کہ بلی ہے۔ یہ کہتی تھی کہ نہیں' کوئی ہمارا بیری ہے۔ بڑھیا طعنے دے دے کر کہہ رہی تھی کہ اچھا باہر نکل کر دیکھ تو لے پھر کہیو۔ بڈھا کہتا تھا کہ ایسا ہی وہم ہے' اٹھ کر تو ہی دیکھ لے نا۔ دھنا ڈرا کہ کہیں لڑتے جھگڑتے یہ باہر نہ آ جائیں یا بڑھیا چیخ چیخ کر پڑوسیوں کو نہ جگا دے۔ پولیس کی چوکی بھی سامنے ہے۔ کوئی سپاہی نہ آ کر دھر لے۔

یہ خیال آتے ہی دھنا نے بلی کو اٹھا کر زور سے چھپر پر دے مارا۔ چھپر کا پھونس تو گلا ہوا تھا ہی، بلی چھپر پھاڑ کر نیچے گری اور سیدھی بڑھیا کے منہ پر جا پڑی۔ ایک تو بلی جھلائی ہوئی دوسرے بڑھیا نے جو گھبرا کر ہاتھ چلائے تو بلی کا گلا دب گیا۔ اس نے تڑپ کر ایسا پنجہ مارا کہ بڑھیا کا منہ کھسوٹ لیا۔

بڑھیا لہولہان ہو کے ہائے ہائے کرنے لگی۔ بڈھا جھنجھلا کر کہہ بولا ''اب مزا آیا۔ کہہ رہے تھے کہ سو جا اری سو جا۔ نہ مانی۔ لے اب کرموں کو رو۔ نہ غل مچاتی نہ بلاڑی گر کر پنجہ مارتی۔ بڑی آئی تونبوں کی رکھوالی

صاحب مضمون

سید ولی اشرف المعروف اشرف صبوحی صاحب طرز خاکہ نگار، افسانہ نگار اور ڈراما نگار تھے۔ دہلی میں ۱۱/مئی ۱۹۰۵ء کو پیدا ہوئے۔ ادبا و علما کی آغوش میں تربیت پائی، سو جلد لکھنے پڑھنے کی طرف مائل ہو گئے۔ شستہ و معیاری اردو میں کئی تحریریں یادگار چھوڑیں۔ آپ کے انمول اور بے مثال طرز تحریر کی جھلکیاں زیر نظر افسانے ''شاطر چور'' میں نمایاں ہیں۔ اشرف صبوحی قیام پاکستان کے بعد لاہور چلے آئے تھے۔ طویل عرصہ محکمہ ڈاک اور پھر ادارہ ہمدرد سے وابستہ رہے۔ ۲۲/اپریل ۱۹۹۰ء کو وفات پائی۔

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

کرنے والی۔ پڑ گئی نا ٹھنڈک.....''

دھنا کو ایسا موقع خدا دے، اس نے تونبے کو رسی میں باندھ کر نیچے لٹکایا اور نیم کی ٹہنی پکڑ، چھلانگ مار تونبا کندھے پر رکھ یہ جا وہ جا۔ صبح ہوتے ہی تونبا استاد کے سامنے پیش کیا اور ساری واردات کہہ سنائی۔ استاد نے شاباشی دی، کمر ٹھونکی اور کہا کہ جا اب تو پکا ہو گیا ہے۔ چوری کر چاہے ڈاکا مار۔ اوسان سے کام لیجیو، ہر جگہ پورا اترے گا۔

باپ کو جو بیٹے کے امتحان میں پاس ہونے کی خبر لگی وہ بھی بہت خوش ہوا۔ کہنے لگا کہ کاش تو رانی کے گلے سے نولکھا ہار اتار لائے۔ دھنا کا جوان خون باپ کی بات سن کر کھول گیا۔ منہ سے تو کچھ نہ بولا، لیکن راج محل پہنچنے کی ترکیبیں سوچنے لگا۔ قلعے کے دروازے پر جاتا، پہرے والوں کے پاس بیٹھتا، چلمیں پیتا، اندر آنے جانے والوں سے انجان بن کر بھید لیتا۔ رانی کے اٹھنے، بیٹھنے، جاگنے سونے کے حالات سنتا۔ اسی اثنا میں اتفاق سے خاص رانی کی ایک باندی مل گئی۔ وہ بڑی مٹکو تھی۔ دھنا بھی خاصا سجیلا جوان تھا۔ اس سے جو میل جول بڑھا تو ڈیوڑھی والے بھی جان پہچان گئے۔ سیاں بھئے کوتوال اب ڈر کاہے کا!

ایک رات کہ خوب اندھیری گھری ہوئی، دھنا نے چوری کی ٹھانی۔ کالے کپڑے پہن ایک نوک دار کٹار کمر میں اڑسی، ہتھوڑی اور کچھ لمبی لمبی سی میخیں بغل میں دبا، مٹھائی کا دونا ہاتھ میں لے محل کے دروازے پر پہنچا۔ پہرے داروں کو مٹھائی بانٹتا اور اپنی آشنا باندی کی ٹوہ لیتا زنانی ڈیوڑھی میں پہنچا۔ رانی اوپر کی بارہ دری میں سوتی تھی۔ زینے کے کواڑ بند، چوبداروں کا پہرہ لگا ہوا تھا، اوپر جائے تو کس طرح؟ ادھر چوکیدار اُدھر اونچی دیوار۔

خواب گاہ کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ روشنی جھلک رہی تھی۔ میخیں ٹھونک کر چڑھتا ہے تو ہتھوڑے کی آواز کا ڈر۔ زنانی ڈیوڑھی کے چوک میں ایک گھڑیالی ٹنگی ہوئی تھی۔ دل میں سوچا اب بارہ بجنے والے ہیں، گھڑیالی بجے گی اور پہرہ بدلا جائے گا۔ اس کی ٹکور کے ساتھ میخیں ٹھونکنی چاہئیں اور پہرے بدلنے کی گڑبڑ میں اوپر پہنچ جاؤں۔ چناں چہ تھوڑی دیر میں گھڑیالی پر موگری پڑنی شروع ہوئی اور یہ میخیں ٹھونکتا ہوا چلا۔ ادھر گھڑیالی کی جھنجھناہٹ ختم ہوئی اور یہ کھڑکی کے اندر تھا۔

کمرے میں خاموشی تھی، دبے پاؤں داخل ہوا۔ دیکھتا کیا ہے کہ باہر کی طرف دو سیجیں بچھی ہوئی ہیں۔ ایک پر راجا بے خبر پڑا سو رہا ہے اور دوسری پر رانی۔ رانی کے سرہانے ایک عورت بیٹھی ہے، نیند میں چور، آنکھیں بند! یہ عورت داستان گو تھی۔ رانی کو کہانی سنے بغیر نیند نہ آتی تھی۔ اس وقت بھی عورت نے کوئی قصہ شروع کر رکھا تھا۔ جھونٹے پر جھونٹے آ رہے تھے، مگر کیا مجال ہے کہ زبان رکے۔ دھنا پہلے تو کہانی سنتا رہا اور جب کہانی کا مطلب سمجھ میں آ گیا تو چپکے چپکے پیچھے سے جا کر اسے بے ہوشی کا فتیلہ سونگھا دیا۔ وہ وہیں ڈھیر ہو گئی۔

اسے کمرے کے اندر لا کپڑے اتارے اور آپ اس کی صورت بن رانی کے سرہانے جا بیٹھا۔ اس دوران رانی نے کروٹ لی۔ ہر کام میں اوسان بڑی چیز ہیں، گھونگھٹ نکال کہانی کہنے لگا۔ رانی پھر سو گئی۔ کروٹ لینے میں ہار سامنے آ پڑا تھا۔ دھنا نے جلدی سے اتار لیا اور پنجوں کے بل زینے سے اتر پہرے والوں سے دروازہ کھلوایا۔ انھوں نے کہانی کہنے والی سمجھ کر پھاٹک کھول دیا۔ یہ کولے پھڑکاتا اور بڑبڑاتا کہ بھلی نوکری ہے، آپ تو آرام کریں اور ہمارا مغز خالی ہو، چوبداروں، پہرے والوں سے نوکا جھوکی کرتا صاف نکل آیا۔

گھر آ کر خوب مزے سے سویا۔ سویرے جو باپ کی آنکھ کھلی، تو ہار دیکھ کر حیران رہ گیا۔ بیٹے کو گلے لگایا اور کہا" لے بس

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

اب موج کر، ہم نے بھی کہہ دیا کہ تو استاد ہے۔ باپ دادا کا نام روشن کرے گا، پر دیکھیو کسی غریب اور دکھیا کو نہ ستائیو۔ میری بات کو بھولیو مت؛ نہیں تو سارے کنبہ کی ناک کٹ جائے گی۔"

ادھر تو دھنا کے باپ کے ہاں خوشی منائی جا رہی تھی ادھر رانی جو اٹھی تو گلے میں سے نولکھا ہار غائب۔ چیخ مار کر کمرے میں بھاگی۔ وہاں کہانی کہنے والی بیہوش پڑی تھی۔ ڈر کے مارے گھگھی بندھ گئی۔ راجا صاحب جو اٹھے تو وہ بھی ماجرا دیکھ کر گھبرا اٹھے۔ قلعے کے اتنے پہروں سے نکل کر ایسا کون چور تھا جو ہار لے گیا۔ بچاری کہانی کہنے والی بھی مرتے مرتے بچی۔ اندھیر کی بات ہے۔ سپاہی، چوبدار، ڈیوڑھی بان سب اندھے ہو گئے۔ آخر آیا کدھر سے اور گیا کس طرح؟ الوپ انجن لگا کر آیا تھا یا کوئی برکی ماری کہ کسی نے آتے دیکھا نہ جاتے؟

غصے میں بھرا ہوا باہر آیا۔ راج محل کا سارا محافظ عملہ طلب کیا گیا۔ تحقیقات میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا، مگر سوائے اس کے کہ دیوار میں چند میخیں ٹھکی ہوئی ہیں اور آدھی رات کے بعد کہانی کہنے والی راج کی نوکرانی ضرور خلاف معمول اپنے گھر گئی تھی، چور کا ذرا پتا نہ چلا کہ اندر کس طرح آیا اور کدھر سے گیا۔

جھلا کر راجا نے تمام نوکروں کو خوب سزائیں دیں۔ کسی کو پٹوایا، کاٹھ میں ٹھونکا، کسی پر جرمانہ کیا۔ کتنے ہی جیل میں بھر دیے اور شہر میں ڈھنڈورا پھروا دیا کہ جو چور کا کھوج لگائے گا، اس کی راج میں بڑی عزت ہوگی، انعام ملیں گے۔

جب کئی دن گزر گئے اور چور کا کسی نے پتا نہ دیا، تو راجا نے خود ایک ترکیب نکالی۔ دو توڑے اشرفیوں کے اونٹ پر لاد حکم دیا کہ روز رات کو اسے لے کر گلی گلی کوچے کوچے گشت لگاتے پھرو۔ ایک طرف تو اپنے جاسوس چھوڑ دیے کہ ہر جگہ گھات لگائے بیٹھے رہیں۔ جو اونٹ پر ہاتھ ڈالے اُسے پکڑ لیں اور دوسری طرف ساری ریاست میں یہ منادی کرا دی کہ جس نے رانی کے گلے کا ہار چرایا ہے، اس کی استادی تو جب ہے کہ اونٹ پر سے اشرفیاں چرا لے۔

> **دھنا اور اس کے باپ نے باوجود تشدد اور انعام کے لالچ کے اپنی آن نہ چھوڑی...... جھبرے کی نسبت ایک حرف منہ سے نہیں نکالا۔**

دو راتیں یونہی گزر گئیں کسی نے اونٹ کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا، بلکہ سرِشام شہر سنسان ہو جاتا۔ چراغ جلتے ہی لوگ اپنے اپنے گھروں میں جا گھستے۔ تیسری رات آئی۔ ساربان اونٹ لے کر نکلا۔ بازار بند، سڑکوں پر نہ آدم نہ آدم زاد۔ پھرتے پھرتے ایک چوراہے پر پیپل کے نیچے دیکھا کہ ایک جوگی لوگ چھالا بچھائے بھبوت ملے، دھونی رمائے بیراگی پر ماتھے ٹیکے بیٹھا ہے۔ جانور جو سامنے سے گزرا، تو اس نے گردن اٹھا کر اونٹ والے سے کہا:

"بچہ! راجا تو مورکھ ہے۔ کہیں اس طرح چور پکڑے جاتے ہیں؟"

ساربان: سادھو جی اپنا کیا بس، حاکم کا حکم۔ آپ ہی دیا کریں۔ چور پکڑا جائے، تو اپنا بھی کچھ بھلا ہو۔"

جوگی: "اچھا ادھر آ، کیا یاد کرے گا۔ ذرا چلم تو اٹھا لے سلفے کے اور دو چار دم لگا۔ چور بھی آیا جاتا ہے۔"

جوگی نے یہ فقرے کچھ ایسے انداز سے کہے کہ اونٹ والا نکیل چھوڑ جوگی کے پاس آ گیا۔ ڈنڈوت کی چلم اٹھائی۔ جوگی نے ایک پوٹلی میں سے سلفہ نکال کر دیا۔ آگ کا کیا گھاٹا تھا۔ اونٹ والے نے سلفہ جما چلم بھری، پہلے جوگی نے جھوٹ جھوٹ ایک دو دم لگائے پھر ساربان کو دے کر بولا: "لگا کس کر دم۔ گرو کا بچن جھوٹا نہیں پڑے گا۔"

ساربان بھی پرانا چرسیا تھا۔ کئی دن کے بعد چلم ہاتھ آئی تھی۔ صافی لگا کر جو کھینچتا ہے تو بالشت بھر کی لو اٹھا دی۔ نجانے دھتورا ملا ہوا تھا یا جوگی کی کوئی کرامت تھی کہ

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

دم مارتے ہی چاروں شانے چت...... لمبا لمبا لیٹ گیا۔
جوگی نے جو اصل میں دھنا تھا، جھپٹ کر اونٹ کی مہار پکڑی اور شہر سے نکل اپنے قصبے کا راستہ لیا۔ راتوں رات گھر پہنچ اشرفیاں گلا' سونے کی اینٹیں بنا لیں۔ اونٹ کو مار کر انگنائی کی اندھی کھوئی میں ڈال، زمین برابر کر دی۔

یہاں کی تو یہ رہی، وہاں مخبروں نے جو اونٹ کو غائب دیکھا، تو ہوش جاتے رہے۔ تو چل میں آیا' گلی گلی کوچہ کوچہ چھان مارا۔ آخر چوراہے پر ساربان بے ہوش، زبان نکلی ہوئی، جھاگ منہ سے جاری بے سدھ پڑا ہوا ملا۔ اسی حالت میں اٹھا کر راجا کے پاس لے گئے۔ باز پرس ہوئی۔ ساربان کے اوسان درست ہوئے، تو اس نے ڈرتے ڈرتے ساری کیفیت بیان کی۔ راجا غصے کے مارے آئے تو جائے کہاں، مگر کیا کرتا' گھریاں گھونٹ کر بیٹھ گیا۔

دو دن کا غوطہ دے کر پھر ڈھنڈورا پٹوایا کہ ملک خدا کا' حکم راجا کا، چور ہو یا ساہوکار جو اونٹ کا پتا لگائے' اس کو راج دربار سے ایک ہزار اشرفیاں انعام ملیں گی۔ یہ خبر جھبرے کو بھی ملی۔ لالچ نے آنکھیں بند کر دیں۔ آدمی میں برے پیشے کا ہو یا اچھے کا، بہت سی کمزوریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ وضع داری کا پاس نہیں رہتا۔ بلا محنت مفت میں مال مارنا چاہتا ہے۔ دھنا کی چالاکیوں سے وہ واقف تھا۔ سوچا کہ ہو نہ ہو یہ اسی کا کام ہے۔ حسد کی آگ بھڑک اٹھی۔ پکا ارادہ کر لیا کہ جو کچھ بھی ہو اسے پکڑوا کر چھوڑوں گا۔ میرا گھر بگڑے اور دھنا سونا رولے۔ نام نہیں جو اس کو تھوتھے تیروں نہ اُڑوایا ہو۔

مثل مشہور ہے کہ بیری سوئے نہ سونے دے۔ جھبرے نے ساری بستی چھان مری اور جب کسی طرح اونٹ کا کھوج نہ لگا' تو اس نے یہ ترکیب نکالی کہ ایک اندھی بڑھیا کا بھیس بھرا اور اونٹ کی ہڈی کا سوال کرنا شروع کیا۔ ہندوؤں کی آبادی میں اونٹ کی ہڈی کا کیا کام' جھڑکیاں گالیاں کوسنے کھاتا' رات کے اندھیرے میں دھنا کے گھر پہنچا اور دکھیاری بڑھیا کی سی آواز بنا کر کہنے لگا ''رانی! میں پیسہ نہیں مانگتی، کپڑا نہیں۔ اونٹ کی ذرا سی ہڈی ہو تو دے دو بھگوان تمھارا بھلا کرے گا' بیٹی! میں بھکارن نہیں۔ ماں تا کی ماری دکھیاری ہوں۔ میرا اکلوتا جوان بیٹا بیمار ہے۔ حکیم کہتے ہیں کہ اونٹ کی ہڈی گھس کر پلا۔ اپنے بچوں کے صدقے میں میرے بچے کی جان بچا لو۔

دھنا موجود نہ تھا' اس کی بیوی بڑھیا کا انوکھا سوال سن کر دروازے پر آئی۔ یہ اس کے پاؤں پر لوٹ گیا۔ ایسا بلکا کہ عورت ذات موم ہو گئی۔ سمجھی کہ واقعی کوئی مصیبت زدہ ہے۔ آنکھوں میں آنسو بھر کر کہنے لگی ''مائی رو نہیں' میں اونٹ کی ہڈی ابھی لائی۔ ذرا بیٹھ جاؤ۔'' اور اندر جا کر زمین کھودی۔ اتفاق سے اونٹ کی ایک ٹانگ اوپر ہی تھی۔ اسے کاٹ ہڈی کا ٹکڑا بڑھیا کے حوالے کیا۔ بنی ہوئی بڑھیا نے دھنا کی بیوی کی بلائیں لیں اور دعائیں دیتی چلی گئی۔

جھبرے کی خوشی کا کیا پوچھنا، مدعا ہاتھ میں تھا۔ رات کاٹنی مشکل ہو گئی۔ صبح سویرے سویرے دربار میں پہنچ راجا کو سارا بھید دیا۔ راجا نے سپاہی ساتھ کر دیے۔ دھنا اور اس کا باپ گرفتار ہوئے۔ اونٹ کی لاش کنویں میں سے نکلی۔ سونے کی اینٹیں اور بہت کچھ مال برآمد ہوا۔ اسی سلسلے میں پولیس نے اور گھروں کی تلاشی لی۔ جھبرے اور اس کے باپ کے ہاں سے بھی بیسیوں چوری کی چیزیں نکلیں، لیکن دھنا اور اس کے باپ نے باوجود تشدد اور انعام کے لالچ کے اپنی آن نہ چھوڑی...... جھبرے کی نسبت ایک حرف منہ سے نہیں نکالا۔ نہ ہار کا پتا دیا نہ اشرفیوں کی چوری کا اقرار کیا۔

راجا نے چاروں کو پھانسی کی سزا دے دی۔ جھبرا شاہی گواہ بن کر بھی قانون کی گرفت سے نہ بچا، بلکہ اس کی موت غداروں کی تھی۔ وہ رو رہا تھا اور دھنا خوش تھا کہ اس نے مرتے ہوئے بھی اپنے پیشے کی لاج رکھی۔ چور دونوں تھے' فرق صرف رذالت' شرافت اور بہادری کا تھا۔ ◆◆◆

http://www.bookstube.net/

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

مولانا چراغ حسن حسرت مرحوم کی تصویر نہ جانے کس میگزین میں دیکھی تھی۔ وہ تصویر خواہ مخواہ پسند آ گئی، چناں چہ خود حسرت صاحب کو دیکھنے کا شوق دل میں چٹکیاں لینے لگا۔ یہ لطیف حادثہ کب رونما ہوا ٹھیک سے یاد نہیں۔ بہرحال پاکستان بن چکا تھا...... پھر کرنا خدا کا یوں ہوا کہ میں ۱۹۵۱ء میں لاہور پہنچا اور ایم اے اردو میں داخل ہو گیا۔ طبیعت کو یک گونہ اطمینان نصیب ہوا کہ اس شہر طلسمات میں عظیم ادبی ساحروں سے ملاقات ہوتی ہی رہے گی اور اب وہ دسترس سے باہر نہیں۔

ایک روز میں اور نصیر احمد زار جو میرے لڑکپن کے ساتھیوں میں سے ہیں' مال روڈ کے فٹ پاتھ پر جا رہے تھے۔ رخ شاید جناح باغ کی جانب تھا۔ تبھی سامنے سے آتے ہوئے ایک شخص معتبر دکھائی دیے۔ سر پر ٹوپ، ہاتھ پر چھڑی، جاندار اور گھیردار مونچھیں، چال میانہ، ڈھال نمایاں۔ معقول سی

ہم سا ہو تو سامنے آئے

دُنیائے ادب کے مولانا

اس عظیم ادبی ہستی کا روح افزا خاکہ جن کی زندگی دو اصولوں کے گرد گھومتی تھی...... اسلام اور اُردو

مرزا محمد منور

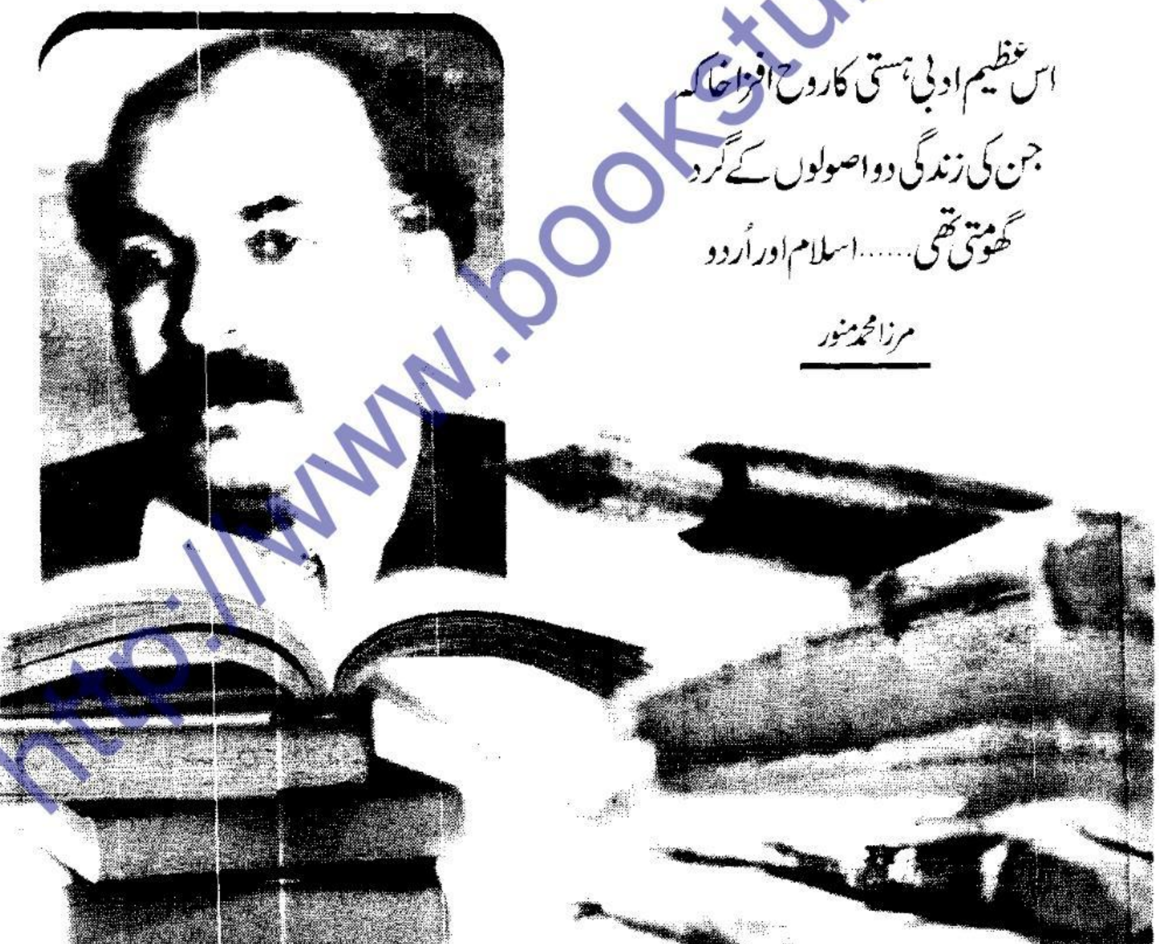

http://www.bookstube.net

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

توند جسم کے آگے آگے رواں تھی۔ میں نے زار صاحب سے کہا "وہ دیکھو شاید چراغ حسن حسرت ہیں۔ اگر ان سے تعارف ہے تو مجھ سے بھی ملوا دیجیے۔"

بولے "یہ تو مولانا صلاح الدین ہیں، ادبی دنیا والے۔"

میں نے کہا "جب بھی کیا مضائقہ ہے، انھی سے مل لیتے ہیں۔" یہ کشش اس تصویر سے مشابہت کی پیدا کردہ تھی۔ قریب پہنچے تو پتا چلا کہ مولانا زار صاحب سے خاصے بے تکلف ہیں۔ دونوں باہم تپاک سے ملے۔ زار صاحب نے میرا بھی تعارف کرایا۔ مولانا بڑی شفقت سے پیش آئے، میں نے سوچا ع

ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

زار صاحب تب پنجاب یونیورسٹی میں ایم اے اردو کی اوّلین جماعت میں شامل تھے۔ یہ جماعت ۱۹۴۸ء میں شروع ہوئی تھی۔ ۱۹۵۰ء کے اکتوبر میں نتیجہ آیا۔ زار صاحب پاس ہو گئے۔ اس طرح مستند بیکاروں میں ایک قابل قدر بیکار کا اضافہ ہو گیا۔ بیکاری کے عالم میں لوگوں سے پیار بڑھ جاتا ہے جن سے معمولی جان پہچان ہو ان سے بھی بغلگیر ہونے کو جی چاہتا ہے۔ زار صاحب بھی ان دنوں کچھ معمول سے زیادہ ملنسار ہو گئے۔ کسی نہ کسی "دوست" یا "بزم" کی کشش انھیں دوڑائے رکھتی۔

میں اس معاملے میں ان کا اچھا رفیق ثابت نہ ہو سکتا تھا۔ کچھ اس لیے کہ مزاجاً کاہل ہوں اور کچھ اس لیے کہ ابھی میرے ملنسار ہونے کے لیے مناسب وقت نہ آیا تھا۔ میں ابھی دو سال تک اپنی شیروانی کے بٹن بند کیے مگن رہ سکتا تھا۔ تاہم ایک شام زار صاحب نے فرمایا "بھئی میں مولانا صلاح الدین سے ملنے جا رہا ہوں، چلو گے!" میں نے اثبات میں سر ہلایا اور چل دیا۔

سورج غروب ہوئے کم از کم دو گھنٹے گزر چکے تھے، مگر مولانا اپنے دفتر میں بیٹھے کام کر رہے تھے۔ ہم وہاں بیس پچیس منٹ بیٹھے ہوں گے کہ مولانا نے فرمایا "اچھا تو چلیں۔" زار صاحب نے ہامی بھر لی۔ مولانا نے دفتر بند کیا اور مال پر اتر آئے۔ پھر کیا ہوا، کہاں تک ہم اکٹھے چلے، کچھ یاد نہیں۔ یوں زار صاحب کی بدولت میں نے مولانا کا دفتر بھی دیکھ لیا۔ اس کے بعد جلد زار صاحب ایڈورڈ کالج، پشاور میں اردو کے استاد بن کر چلے گئے اور ان کی فالتو ملنساری کا بھوت اتر گیا۔ ان کے چلے جانے سے لاہور کا تو کیا بگڑتا، البتہ میں خاصا ویران ہو گیا۔

ہماری ایم اے اردو کی جماعت میں لڑکیاں لڑکے ملا کر کوئی "پچھتر" "دانش پناہ" شامل تھے۔ لہٰذا حلقۂ تعارفات بہت جلد وسیع ہو گیا۔ وولز ہاسٹل میں ڈیرہ تھا۔ وہاں بھی علیک سلیک بڑھنے لگی۔ ملاقاتوں اور انتقامی ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ تاہم جی سیر نہ ہوتا۔ عمر میں اپنے سے بڑوں کی مجلس ہمیشہ عزیز رہی تھی۔ بزرگوں ہی کی گپ مزا دیتی مگر یہاں جن اصحاب سے یارانہ ہوا، وہ بزرگ نہ تھے۔ اساتذہ کا قرب چاہا اور انھوں نے مہربانی بھی فرمائی۔ مگر آخر وہ مہربانی ہی تو تھی..... مہربانی میں دلجوئی ضرور ہوتی ہے، دلکشی نہیں ہوتی۔ ہٰذا رفتہ رفتہ طبیعت پر گراں گزرنے لگتی ہے..... البتہ مولانا علم الدین سالک اور سید عابد علی عابد کی مہربانی میں دوستی کی لطافت بھی پیدا ہو گئی۔ چناں چہ ان دونوں بزرگوں کے لیے دل میں خاصی کشش رہی۔

یہ تو مجھے پتا چل ہی گیا تھا کہ مولانا عشا تک عموماً دفتر میں کام کرتے ہیں۔ چناں چہ شام کے وقت جس روز بھی طبیعت اداس ہوتی، میں ادبی دنیا کے دفتر پہنچ جاتا۔ شام کے وقت تنہائی کے عالم میں اور پردیس کی فضا میں دل کا

http://www.bookstube.net/

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

اداس ہونا دستوری اور اصولی بات ہے۔ کئی دیگر اہلِ دل نے بھی تصدیق کی ہے کہ اسی طرح ہوتا ہے۔ خیر میں ادبی دنیا کے دفتر پہنچتا' تو یک گونہ اطمینان محسوس ہونے لگتا۔ مولانا اور میں کوئی زیادہ باتیں نہ کرتے۔

مثلاً میں پہنچا، تبادلہ سلام ہوا۔ ایک آدھ رسمی جملہ انھوں نے ارشاد فرمایا، کوئی ایک آدھ بات میں نے کی اور پھر اپنا اپنا کام۔ یعنی مولانا کوئی پروف پڑھنے میں مصروف ہو گئے۔ میں نے کوئی پرانا رسالہ یا کتاب اٹھائی اور پڑھنے لگا۔ مولانا کا عمومی تصور اب تک یہی ہے کہ وہ کوئی پروف پڑھ رہے ہیں۔ عینکیں سجی ہیں، بال جتنے کچھ تھے، وہ اڑ رہے ہیں، انداز بتاتے ہیں کہ ذہن ظاہری مصروفیت سے کچھ زیادہ ہی مصروف ہے۔

جب ذرا بے تکلفی بڑھی' تو میں نے پاؤں پھیلانے شروع کیے۔ وہ فقط ان معنوں میں کہ ان کے دفتر جا کر کوچ پر لیٹ جاتا اور پڑھتا رہتا۔ اس زمانے میں ایک کوچ دفتر میں رکھا ہوتا۔ پڑھنے کے لیے وہاں رنگ رنگ کی کتب موجود تھیں۔ کچھ تبصرے کے لیے آئی ہوئی ہیں' کچھ ہدیہ شریف ہیں۔ مگر انھیں گرد چاٹ رہی ہوتی۔ انبار لگا ہوتا۔ کوئی نظم و ترتیب ان کے کمرے میں نہ تھی۔ رسائل ہیں تو وہ کچھ اوپر تلے دھرے ہیں۔ اس زمانے میں مولانا کوئی کتاب یا رسالہ کم ہی پڑھتے۔ ان کے ذہن میں نجانے کیا کیا بوجھ تھے۔ میں نے کبھی نہ پوچھا مگر ذہن عموماً زیرِ بارِ گراں ہی پایا جس کا عمومی اظہار ایک طرح کی وضعدارانہ اداسی تھی۔

آج سوچتا ہوں کہ آخر ہم کیا باتیں کرتے تھے' تو کچھ یاد نہیں آتا۔ میرا جی، کرشن چندر، باری امرتسری، یوسف ظفر...... سب سے برتر ظفر علی خان سے ان کی محبت تھی، شیفتگی کی حد کو پہنچی ہوئی محبت! مجھے یاد ہے، جب بھی وہ اپنے لڑکپن کی طرف لوٹتے، تو مولانا کے گھر اپنا آنا جانا بڑے چاؤ سے بیان کرتے۔ اس وقت ان کی آنکھوں میں اچانک خود مولانا ظفر علی خان کی آنکھوں والی چمک جلوہ ریز ہو جاتی۔

آخر اکتوبر ۱۹۵۳ء میں میری تقرری لائلپور (فیصل آباد) گورنمنٹ کالج میں ہو گئی اور لاہور بلکہ وولنز ہاسٹل سے جدا ہو گیا۔ میرا اصل لاہور تو وولنز ہاسٹل ہی تھا۔ مجھے ہاسٹل سے بڑی محبت تھی۔ لائل پور چلے جانے کے بعد بھی کئی سال تک میں وہاں آ کے کسی نہ کسی بہانے ٹھہرتا رہا۔ طبیعت ''ماندی'' ہوتی تو وولنز ہاسٹل کے در و دیوار کی خوشبو اسے اعتدال عطا کر دیتی۔

میں لائلپور سے جب بھی لاہور آتا دوستوں اور کرم فرماؤں سے ملنے کے لیے وقت ساتھ لاتا۔ ان میں مولانا صلاح الدین احمد بھی شامل تھے۔ مجھے ان سے محبت تھی اور وہ بدستور میرے دل میں مقیم تھے۔ مولانا درحقیقت شجر سایہ دار کی طرح تھے، زندگی کی راہوں کے تھکے ہوئے مسافر ان کے زیرِ سایہ دم لیتے۔ ان کا سایہ بڑا خوشگوار اور آنکھوں سکھ، کلیجے ٹھنڈک کا مصداق تھا۔ شجر تو غیر جانبدار رہتا ہے۔ کوئی کہے کہ وہ میرا دوست ہے' تو یک طرفہ دعویٰ ہے۔

کوئی اس شجر سایہ دار و فرحت بار کے نیچے ذرا سی دیر رکے یا زیادہ دیر ڈیرہ جمائے' اس شجر کی آبیاری کرے یا الٹا اس کے پتے جھاڑ لے، چلتے وقت، شکریے کے طور پر ٹہنیاں توڑ لے جس سے سواری کے لیے چابک بنائے یا دفعِ بلیات کی خاطر چھڑی' تو یہ مسافر کا اپنا رویہ ہے۔ کم از کم میرا ان کے بارے میں یہی خیال تھا کہ وہ سایہ تو ہر ایک کے لیے تھے' باقی یہ اہلِ ہمت پر منحصر تھا کہ کتنے پتے جھاڑیں یا ٹہنیاں توڑیں۔

ایک روز ''مفلس'' ساہوکار کی طرح بہی کھاتہ دیکھ کر بتانے لگے کہ فلاں صاحب نے اتنی رقم واپس لی ہے۔ فلاں

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

مولانا صلاح الدین احمد

اردو کے عاشق صادق، مولانا صلاح الدین احمد ۲؍مارچ ۱۹۰۲ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ جنوری ۱۹۳۴ء سے مشہور ادبی رسالہ ''ادبی دنیا'' ایڈٹ کرنا شروع کیا جو آپ کی وفات، ۱۴؍جون ۱۹۶۴ء کے دس سال بعد تک نکلتا رہا۔ مولانا صاحب نے اردو زبان کی ترقی و ترویج میں حقیقتاً تن من دھن سے حصہ لیا اور جب اس پر کبھی آنچ آئی، تو جنرل ایوب خان اور نواب آف کالا باغ سے بھی ٹکر لی۔ اردو کے لیے آپ کی خدمات یادگار حیثیت رکھتی ہیں۔

ادارے نے اتنی...... میں نے کہا ''مگر وہ لوگ تو آپ کو بڑی عقیدت سے ملتے ہیں، رقم کیوں نہیں لوٹاتے؟''

مولانا نے اپنے مخصوص لہجے میں فرمایا ''ہاں! اور پھر آپ نے دیکھا کہ فلاں صاحب کتنے نستعلیق آدمی ہیں۔ مگر بھائی پیسا کچھ معاملہ ہی ایسا ہے۔''

مولانا کی ''ہاں'' کلید بلاغت تھی، وہ اس ایک کلمے سے نجانے کیا کیا مفہوم ادا کر لیتے۔ یہ ''ہاں'' ربڑ کی طرح تھی، کبھی سکڑ، کبھی کھینچ جاتی۔ مثلاً استفہامی حیرت کے موقع پر بہت طویل ہو جاتی۔ بات ٹالنے کے لیے ہاں کرتے، تو بالکل مجمل اور واجبی سی...... وہ ہاں سے اپنے ہر طرح کے ذہنی رویے کی ترجمانی پر قادر تھے، لہٰذا ہاں ایجابی تھی، اقراری بھی، تو بیخی تھی اور تاکیدی بھی استفہامی تھی اور استعجابی بھی۔ تقریبی تھی اور اجتنابی بھی...... فعل مضارع تھی اور ماضی استمراری بھی۔

مولانا عموماً اردو ہی بولتے تھے۔ میں نہ جانے کیوں ان سے اکثر پنجابی میں باتیں کیا کرتا تھا۔ وہ جواباً باضابطہ اردو بولتے چلے جاتے۔ اس کے برعکس ڈاکٹر محمد باقر سے ملاقات ہوتی، تو وہ پنجابی بولتے اور میں اردو......

رفتہ رفتہ میں ٹھیک ہو گیا، وہ دونوں تو کیا ہوتے، لہٰذا اوّل الذکر کے ساتھ میں بھی اردو ہی میں گفتگو کرنے لگا اور موخر الذکر کے ساتھ پنجابی میں۔ اس ضمن میں مولانا نے اپنے مرحوم دوست باری امرتسری کا ذکر کیا اور کہا ''میں تو حسبِ عادت اردو بولتا ہی ہوں۔ اپنے دوستوں سے بھی توقع رکھتا ہوں کہ کم از کم میرے ساتھ اردو ہی بولیں۔ چناں چہ باری صاحب بھی ہمت کر کے اردو بولنے لگتے۔ آدھ پون گھنٹے بعد کہتے، بس بھائی۔ اب میری باچھیں دکھنے لگی ہیں۔ اب مجھے پنجابی بولنے کی اجازت دیجیے۔''

مولانا بعض اوقات سادگی اور بھولپن سے بڑے مزے کی بات کہہ جاتے۔ مثلاً ایک بار میں لائلپور سے آیا اور ان سے ملا تو پوچھا ''کیا حال ہے، آپ کے شہر ادب کی ادبی سرگرمیوں کا۔''

جواباً فرمایا ''تقسیم سے قبل میں دہلی گیا۔ وہاں کئی اصحاب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے اسی قسم کا سوال کیا تھا۔ میں نے انھیں جواب دیا ''چوری چکاری'' عام ہے۔ آپ بھی پوچھتے ہیں اور لاہور کی ادبی سرگرمیوں کا کیا حال ہے۔ یہی عرض کر سکتا ہوں کہ ''چوری چکاری'' عام ہے۔''

ایک بار مولانا نے بعض پرانی اور نئی کتب کی طباعت کا منصوبہ بنایا۔ اس میں بعض عزیزوں اور دوستوں کو رکن کی حیثیت سے شریک کر لیا۔ منصوبے کے تحت حیاتِ جاوید، دیوان شیفتہ، فغان دہلی، مسرت کی تلاش وغیرہ کئی کتابیں چھپ گئیں۔ حیاتِ جاوید کو چھپے چند دن ہوئے تھے کہ میں لائلپور سے آیا، ملا اور لاہور کی ادبی سرگرمیوں کا احوال پوچھا۔ مولانا ہوں ہاں کرتے رہے۔ میں نے

http://www.bookstube.net/

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

اتنے میں حیاتِ جاوید کا مطالبہ کیا اور قیمت نکال میز پر رکھ دی۔ رخصت ہونے لگا تو میں نے کہا ''مولانا اس کتاب پر ذرا دستخط تو فرما دیجیے۔''

بولے ''یہ زیادتی ہے۔ کتاب مول لینا اور دستخط کرانا۔''

میں نے عرض کیا ''مولانا کتاب ہی مول لی ہے دستخط تو مفت لے رہا ہوں۔''

بے ساختہ بولے ''ہاں!''...... لمبی ہاں اور دستخط کر دیے۔ پھر دفعتہً اداس سے ہو کر کہنے لگے ''جس شہرِ علم کی طرف آپ حسرت سے دیکھتے ہیں، اس شہرِ علم میں حیاتِ جاوید کا یہ پہلا نسخہ ہے جو پیسوں سے جا رہا ہے۔ حالانکہ اسے چھپ کر آئے کئی روز ہو چکے۔''

ادبی دنیا رسالہ مولانا کی وفات سے بہت پہلے خسارے کا سودا بن گیا تھا۔ ۱۹۵۰ء میں جب مولانا سے میرا تعارف ہوا، تب بھی یہی عالم تھا۔ کئی کئی ماہ کا غوطہ ہو جاتا۔ ایک بار میں نے پوچھا ''مولانا اب پرچہ کب تک نکلے گا؟''

جواب ملا ''جب اتنے پیسے جمع ہو جائیں جتنا اوسطاً ایک سال کا خسارہ بنتا ہے۔ ایک سال تو چلے۔'' یہ شاید ۱۹۵۴ء کا قصہ ہے۔ میرا خیال ہے، مولانا نے اس زمانے میں نمک کی ایجنسی لے رکھی تھی۔ جو کمائی ہوتی وہ ادبی دنیا پر لگا دیتے۔ ان کی وفات کے بعد کسی نے ذکر کیا کہ ایک مکان بھی بیچ کر ادبی دنیا کو کھلا دیا۔ اردو اگر ایسے خانہ برانداز عاشقوں کے باوصف نہیں پنپتی، تو پھر حد ہے۔ مجھے یاد ہے، اسی قسم کی باتوں کے ضمن میں، میں نے ایک بار پوچھا ''کیا آپ پرچہ محض خسارے سے لطف اندوز ہونے کے لیے نکالتے ہیں؟'' فرمایا ''ہاں'' اور ساتھ شیفتہ کا شعر سنایا ؎

زیاں عشق میں ہم خود بھی جانتے ہیں مگر
معاملہ ہی کیا ہو اگر زیاں کے لیے

صاحبِ مضمون

دانشور، ادیب اور ماہر اقبالیات پروفیسر محمد منور ۱۹۲۳ء میں پیدا ہوئے۔ پنجاب یونیورسٹی سے اردو، عربی اور فلسفے میں ایم اے کیے۔ تکمیل تعلیم کے بعد کئی علمی و ادبی اداروں سے منسلک رہے۔ آپ نے اقبالیات، پاکستانیت، اسلامیات اور ادب وغیرہ پر کئی کتب لکھیں۔ سچے مسلمان اور کٹر پاکستانی تھے۔ آپ کی خدمات کے مدنظر حکومت پاکستان نے آپ کو ستارۂ امتیاز عطا کیا۔ ۷؍فروری ۲۰۰۰ء کو لاہور میں وفات پائی۔

میں نے ادبی دنیا میں کبھی کچھ نہ لکھا تھا۔ بعدازاں ڈاکٹر وزیر آغا نے ایک آدھ جدید نظم پر مجھ سے تبصرہ کرایا۔ ایک آدھ غزل چھپی ہو گی اور بس، مگر اس کے باوجود پرچہ مجھے ہمیشہ ملتا رہا۔ مولانا سے جب بھی ملاقات ہوتی، پچھلا پرچہ تھما دیتے۔ ساتھ ہی کہتے، ہاں بھئی وہ زار صاحب اور خورشید صاحب کا موجودہ پتا کیا ہے۔ میں بتاتا اور وہ ان کے نام بھی پرچے ارسال کر دیتے۔ وہ عجیب تباہ کن وضعداری میں مبتلا تھے۔ مگر کرتے بھی کیا، اپنے مزاج کو کوئی کس طرح بدل سکتا ہے؟ پھر ڈاکٹر وزیر آغا بھی شامل ہو گئے اور ادبی دنیا ضخیم پرچہ بن گیا، اب وہ دوماہی تھا۔

ایک بار میں نے لائلپور سے چندہ بھیج دیا۔ ساتھ لکھا کہ میں قلمی معاون نہیں کہ پرچہ مفت وصول کروں، نہ کوئی علمی بزرگ ہوں کہ ہدیتہً پانے کا استحقاق ہو۔ لہٰذا ازرہِ کرم مجھے خریداروں میں شامل فرما لیجیے۔ اسی روز سرگودھا

http://www.bookstube.net/

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

جانا ہوا۔ وزیر آغا صاحب سے ملاقات ہوئی۔ میں نے ذکر کیا کہ ''ادبی دنیا'' کے دورِنو کی خوشخبری سنی تھی۔ خدا کرے کامیاب رہے، اپنا چندہ روانہ کر دیا ہے۔

آغا صاحب بولے، مولانا آپ کا چندہ لوٹا دیں گے۔ میں نے کہا یہ زیادتی ہوگی۔ آغا صاحب بولے، آپ کل لائلپور جائیں گے' تو منی آرڈر واپس آیا پڑا ہوگا۔ اور یہی ہوا...... اگر میرے پاس بھی ادبی دنیا مفت آتا تھا' تو شاید وہ چھپتا ہی مفت تقسیم ہونے کے لیے تھا۔

میں ۱۹۶۱ء میں تبدیل ہو کر لاہور پہنچ گیا۔ ڈیرہ ماڈل ٹاؤن میں ڈالا۔ مولانا سے بھی ملاقات گاہے گاہے ہوتی رہی۔ ایک روز بڑے تلخ لہجے میں کہنے لگے ''منور صاحب! آپ ماڈل ٹاؤن سے نجات نہیں پا سکتے؟ یہ بستی میری زندگی کے قیمتی بارہ برس ہڑپ کر چکی۔ آپ کا بھی جس قدر اس بستی میں وقت گزرے گا، برباد ہوجائے گا۔ وہاں وہ رہے جس کے پاس بے مصرف وقت کی بہتات ہو۔ جس کے پاس کار ہو اور خود اپنی کوٹھی۔ کوئی آدمی کرائے پر وہاں کیوں رہے اور بس پر کیوں آئے جائے۔ یہ جبر آخر کیوں؟ چھوڑیئے صاحب! شہر کے قریب آیئے۔ ورنہ اعصاب جواب دے جائیں گے۔''

اور واقعی جلد میرے اعصاب جواب دے گئے اور میں کرشن نگر منتقل ہوگیا۔ مگر اس وقت تک مولانا بھی اپنی رہائش بدل چکے تھے...... انھوں نے جنت الفردوس میں اپنے لیے کوئی خوشگوار غرفہ چن لیا تھا۔

مولانا کو پاکستان اور اسلام کے ساتھ عشق تھا۔ وہ پابند صوم وصلوۃ نہ تھے، مگر جس قوم اور ملت نے انھیں پالا پوسا، اس کی تہذیبی اور روحانی وراثت کے شیدا تھے۔ نبی اکرم ﷺ کا ذکر سنتے' تو سر جھکا لیتے۔ اسلام کے بعد سب سے بڑی وفاداری اردو سے تھی۔ اوپر اسلام نیچے اردو...... وہ ہر اس عنصر سے بھڑ جاتے جو ان دو اصولوں سے ٹکراتا۔ وہ عنصر عوامی ہوتا خواہ حکامی......

عام معاملات میں سلیس اور لوچ دار، مگر اصولوں کی مدافعت میں بڑے مضبوط اور پائیدار، یہی لوگ قوم و وطن کی بقا کے ضامن ہوتے اور معاصروں ہی نہیں بلکہ آئندہ نسلوں کے لیے بھی روشنی کا منار بنتے ہیں' مگر یہاں ایک بات کی وضاحت لازم ہے، وہ یہ کہ مولانا اپنے سیاسی اور ملی نظریات کی وضاحت یا ان نظریات کی تردید کے لیے اپنے مجلے کو کبھی استعمال نہ کرتے۔ رائٹرز گلڈ سے انھیں شدید نظریاتی اختلاف تھا اور جہاں تک مجھے یاد ہے وہ رائٹرز گلڈ کے رکن آخر تک نہ بنے۔ ایک روز کہنے لگے ''جی تو چاہتا ہے رائٹرز گلڈ پر ایک اداریہ نما مضمون لکھوں مگر خود ساختہ دیوار حائل ہوجاتی ہے۔''

میں نے پوچھا ''کیا مطلب مولانا؟''

بولے ''مطلب یہ ہے کہ میں نے ''ادبی دنیا'' کو فقط ادب کے لیے وقف کیے رکھا ہے۔ اب وہ روش بدلوں تو گویا ادبی دنیا کا مزاج بدلوں۔ اور یہ مشکل بات ہے۔''

کتنی ہی کہانیاں تھیں جو مولانا کے پرانے ملنے والوں' عزیزوں' بزرگوں اور تحریکوں سے وابستہ ہیں۔ ان کی پولیس ملازمت سے متعلق کہانیاں، ریاست خیرپور کے حکمران اور سندھ کے بعض رئیس خاندانوں کے قصے۔ ذہن پر زور دیتا ہوں تو دھندلے سے کئی نقوش ابھرتے ہیں' مگر کیا کیا لکھا جائے۔ فی الحال اسی بے ربط بیان پر سلسلۂ گفتگو ختم کرتا ہوں کہ کبھی خدا نے توفیق دی' تو باقی پھر سہی۔ مولانا صاحب اخلاص بزرگ تھے لہٰذا دلوں میں بستے ہیں ؎

اے ہمنفسانِ محفلِ ما
رفتید ولے نہ از دلِ ما

http://www.bookstube.net
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

جس نے تھانیدار کا زورِ بازو آزمانا چاہا

جھجھر کا جوئے باز

ایک پولیس افسر کے اوراقِ زندگی جس نے انوکھے انداز میں مجرموں پر قانون کی طاقت کا سکہ جما دیا

ڈی ایس پی (ر) دلاور حسین لودھی

میں نے تھانہ جھجھر کا چارج ۴؍جولائی ۱۹۳۵ء کو لیا۔ یہ قصبہ ریاست جھجھر کا صدر مقام تھا۔ یہ ریاست برصغیر کی اہم ترین ریاستوں میں شمار ہوتی تھی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں نواب جھجھر عبدالرحمٰن خان نے حب الوطنی کی لہر میں بہ کر حریت پسندوں کا ساتھ دیا۔ اس کی پاداش میں سات سمندر پار کے حکمرانوں نے نواب غازی کو سرفرازِ دار کیا اور ان کے کم عمر فرزند، خلیل الرحمٰن کو مخدرات عصمت کے ساتھ ریاست بدر کر کے لدھیانہ میں پابند مسکن کر دیا۔ ریاست کے حصے بخرے کیے۔ تحصیل جھجھر اور قصبہ بہادر گڑھ کو اپنے

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

علاقے میں شامل کر لیا اور چرغی داوری وغیرہ سکھ جاٹوں کی ریاست جنید کو انعاماً عطا کیا کہ وہ انگریزوں کی وفادار رہی تھی۔

میں نے بچپن میں اپنے خالو، خواجہ احد شاہ مرحوم کے گھر جو لدھیانہ میں چوٹی کے رئیس اور مسلمانوں کے مخلص ترین راہنما تھے، چند بیگمات جھجھر کو دیکھا۔ کیا ٹھسے کی خواتین تھیں۔ کبھی کبھار وہ دوران گفتگو تاریخ ماضی کا کوئی ورق الٹتی تو بچوں تک کا خون گرما دیتیں۔ ایک مرتبہ بیگم بلقیس جہاں نے جن کے سر پر چاندی جھلکتی تھی، کسی خاتون کے دریافت کرنے پر کہ نواب صاحب کس طرح گرفتار ہوئے تھے؟ بتایا:

''وہ اپنی مختصر سی فوج لے کر بنفس نفیس دہلی پر حملہ آور ہوئے۔ تین دن تین راتیں آنکھ جھپکائے گزر چکی تھیں اور متواتر جنگ سے بند بند شل ہو رہا تھا۔ پہاڑ گنج (نواح دہلی) میں ذرا سی دیر کے لیے ستائے، تو آنکھ لگ گئی۔ ہر اول کا کمان دار ایک میر صاحب تھا۔ وہ اندرون خانہ دشمنوں سے ملا ہوا تھا، لیکن نواب صاحب کی میدان کارزار میں ہمہ وقت موجودگی اور بیدار مغزی نے اب تک اس کی دال نہیں گلنے دی تھی۔

''اب جو وہ محو خواب ہوئے، تو اسے موقع مل گیا۔ اس نے ہر اول دستے کو گھیرے میں پھنسا کر باقی عسکریوں کو بھی بے بس و مایوس کر دیا۔ یوں نواب غازی کو بے خبری میں پابہ جولاں کر لیا گیا۔'' بیگم نے پھر آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا ''اعلیٰ حضرت کو بڑی اذیتوں کے بعد میری زبان جلے، برسر عام دار پر لٹکایا گیا۔ اہل حرم کے ساتھ اسی میر صاحب کی معرفت جو اس وقت تک خرقہ سالوس اوڑھے تھا، انگریزوں کی طرف سے تحفظ ناموس و ریاست کے پکے وعدے کیے گئے۔ لیکن بی بی اس ستار عیوب کے قربان، کسی کا پردہ ناموس تو چاک نہ ہوا مگر دامنِ ریاست کی دھجیاں اڑ گئیں۔

آج ہمیں اس حال میں دیکھ رہی ہو۔ ہمارے تو پاؤں ٹوٹیں جو کسی کے گھر جائیں اور ہاتھ پھیلائیں۔ شہر کی اکثر نام نہاد معزز خواتین ہم سے یوں بدکتی ہیں گویا ہم پلیگ زدہ چوہیاں ہیں۔ خدا بھلا کرے تاجو کا (میری خالہ تاجور سلطانہ اہلیہ خواجہ احد شاہ) جس نے ہماری خدمت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ کھینچ کھینچ کر گھر میں لاتی اور آنکھیں بچھاتی ہے۔ ہمارے مردوں کی محفل ان کے میاں کے پاس جمتی ہے۔ ان کے بچے ہمارے ہی بچوں کے ساتھ کھیلتے ہیں۔''

چند بیگمات جھجھر کو دیکھا۔ کیا ٹھسے کی خواتین تھیں۔ کبھی کبھار وہ دوران گفتگو تاریخ ماضی کا کوئی ورق الٹتی تو بچوں تک کا خون گرما دیتیں۔

خواجہ احد شاہ کو اعلیٰ شرافت و انسانی ہمدردی کی قیمت جلد ادا کرنا پڑی جب ۱۹۱۷ء میں حکومت کی طرف سے ایک جھوٹا مقدمہ قائم کر کے ان کی گرفتاری برضمانت عمل میں لائی گئی۔ الزام یہ تھا کہ ''خواجہ صاحب نے اپنے فوجی سامان کی سپلائی کے لیے انگریز فوجی جرنیل کو رشوت دینے کی کوشش کی تھی۔'' وہ تو سب اکابرین شہر بلالحاظ مذہب اکٹھے خواجہ صاحب کی مدافعت میں اٹھ کھڑے ہوئے، تو ان کی گلوخلاصی ہوئی۔ مگر واہ ری وضعداری، اندرون و بیرونِ خانہ نواب شہید کے پس ماندگان کی مجلسیں ویسے ہی جمتی رہیں۔

اب ذکر چھڑ ہی گیا تو خالہ تاجو کے متعلق ایک بات سن لیں۔ خدا کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، انھیں جب بھی پتا چلتا کہ کسی اجڑے معزز خاندان کی بیٹی جوان

http://www.bookstube.net

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

ہوگئی۔ رشتہ موجود ہے مگر والدین میں اسے دروازے سے اٹھانے کی استطاعت نہیں، تو یہ جانتے ہوئے کہ اگر نقد مالی امداد کی گئی، تو شاید والدین کی انا دانستناً اسے قبول نہ کرے یا انھیں ٹھیس پہنچے، لڑکی کی والدہ سے بڑی اپنائیت سے کہتی "بُوا! ساجدہ میری تو بیٹی ہے۔ میں تو اسے دن رات اپنے ہی پاس رکھوں گی۔" وہ اسے اپنے گھر لے جاتیں اور پھر دو تین مہینے بعد اس لڑکی کی بارات خواجہ احمد شاہ کے دولت کدہ پر آتی۔ ہر طرح کا خرچ خالہ اٹھاتیں۔ کہاں گئے وہ لوگ جو صورتاً اور سیرتاً انسانیت کا اعلیٰ نمونہ تھے ؏

اب دیکھنے کو ان کے آنکھیں ترستیاں ہیں

جھنجھر میں نوابوں کی یادگار جہاں آرا باغ کا وسیع و عریض احاطہ تھا، یا پھر وہ بلند قامت و کشادہ کوٹھی جس میں تھانہ اور ایس ایچ او کا رہائشی مکان واقع تھا۔ جہاں آرا باغ میں تحصیل کی بلڈنگ اور شاندار ریسٹ ہاؤس واقع تھے۔ باغ اجڑ چکا تھا، پھول نہ اشجار، بوٹے نہ اثمار۔ بس نیم کے چند خشک درخت اور احاطہ کی شکستہ چار دیواری زمانے کی چیرہ دستیوں کی غمازی کرتے۔

جنوب مشرقی کونے میں ایک خشک تالاب تھا۔ اس کے کنارے سات آٹھ فٹ اونچا چبوترہ جسے ایک سکوپ کے ذریعے (جسے وہاں کی زبان میں ریٹن، پھسلنے والی جگہ کہتے تھے) تالاب سے ملایا گیا تھا۔ تالاب کے درمیان میں ایک گول منار سطحِ آب سے کافی اونچا بنا ہوا تھا جس میں چاروں طرف خوبصورت طاقچے تھے۔ ان طاقوں میں لوہے کے کنڈے لگے تھے جن میں بندھی ریشمی ڈوریاں پانی میں تیرتی رہتی تھیں۔ رات کے وقت طاقچوں میں چراغ جلتے۔

جھنجھر میں ہر مذہب و فرقے کے لوگ آباد تھے۔ ہندوؤں میں مہاسبھائی اور کانگریسی، دونوں ہی خیالات کے پائے جاتے۔ مقامی وکلا سب ہندو ہی تھے۔ تسلیم حسین خان وکیل روہتک میں پریکٹس کرتے۔ مشتاق حسین خاں سرکاری وکیل تھا جن کا تبادلہ مختلف اضلاع میں ہوتا رہتا۔ لیکن ان میں نااتفاقی اور پھوٹ تھی۔ مسلمانوں کے دو مشہور خاندان تھے: "دروازے والے اور لالی خانی۔" دروازے والے میں خیر محمد نہایت شریف اور صاحب ثروت تھا۔ وہ میدان سیاست کا بھی پکہ تاز تھا۔ اس کا شمار انڈین کانگریس کے اہم ارکان میں ہوتا تھا۔ لیکن قیام پاکستان سے قبل ہی مولانا مودودی کی تصانیف بالخصوص "مسلمان اور سیاسی کشمکش" کے مطالعہ کے بعد اس نے کانگریس سے قطع تعلق کر لیا۔

پولیس والے کہا کرتے تھے کہ جھجھر کا چارج کانٹوں کا سیج ہے۔ وہاں لوگ کافی پڑھے لکھے اور ملازمت پیشہ ہیں۔ آپ جس محکمے کے جتنے پنشنر یا سروس میں ملازمان چاہیں، دستیاب ہو سکتے ہیں۔ یہ لوگ پولیس پر کڑی نظر رکھتے۔ ذرا چوک ہوئی فوراً شکایت درج کراتے اور ہائی کورٹ تک اس کی پیروی کرتے۔ میرے لیے اس چارج کو سنبھالنا اور بھی مشکل تھا کیونکہ دروازے کے پٹھانوں سے رشتہ داری تھی جو میری عم زادہ کی جھجھر میں شادی سے قائم ہوئی۔

خیر میں نے اللہ کے بھروسا سے ناؤ پانی میں ڈال دی۔ دل میں فیصلہ کیا کہ "گربہ کشتن باید روزِ اول" کے مصداق جرائم پسند عناصر کا ٹینٹوا شروع ہی سے سختی سے دبا جائے۔ حسن اتفاق سے اگلے ہی روز قاضی فرید الدین، وائس پریذیڈنٹ میونسپل کمیٹی اور چند معززین کے ہمراہ قصبے کی گشت اور دیکھ بھال کے لیے نکلا۔ ہتھکڑیاں اور لاٹھیاں لیے چند سپاہی بھی ساتھ تھے۔

http://www.bookstube.net/

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

ہم راہوالوں کے محلے میں پہنچے، تو دیکھا کہ ایک مکان کے سامنے کھلی جگہ شارع عام میں ایک چھان (چھتر) لگا ہے۔ اس کے اندر کوئی آدمی نہ تھا، لیکن قمار بازی کے آلات پڑے تھے۔ معلوم ہوا کہ یہ مکان اور چھان بشارت علی راہوال کے ہیں جو پولیس کا برخاست شدہ سپاہی تھا۔ منہ زور اور شورہ پشت تھا، شارع عام میں کھلے بندوں قمار خانہ چلاتا۔ پولیس اس سے خائف تھی یا شاید اپنا کمیشن باقاعدہ وصول کرتی ہوگی۔ ممکن ہے دونوں ہی باتیں ہوں۔ میں نے بشارت کو بلوایا جو اپنے مکان میں ایک خورد سالہ بچے کو اٹھائے شان بے اعتنائی سے برآمد ہوا۔ دعا نہ سلام، مجھے کہا ''فرمائیے؟''

میں نے کہا ''تم اپنے مکان کے سامنے جوا کراتے ہو۔''

''کون کہتا ہے؟''

''میں؟''

''غلط ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

میں ایک بات بتاتا چلوں۔ جہاں نووارد پولیس افسر ناپسندیدہ عناصر پر اپنا رعب جمانا چاہتے ہیں، وہ بھی نئے تھانیدار کو سانٹتے ہیں کہ کتنے پانی میں ہے۔ اسی لیے بشارت بھی جواب دے کر میرے دست قدرت کو آزما رہا تھا۔

''تو کیا میں غلط کہتا ہوں؟'' میں نے کہا۔

''جیسا سمجھ لیں۔'' اس کے لہجے میں تمسخر تھا۔

ایسے جوابات سن کر میں آپے سے باہر نہیں ہوا بلکہ یہ آرام گود سے بچے کو اتروا اسے فوراً ہی ہتھکڑی لگوا دی۔ وہ تو جیسے ششدر رہ گیا۔ میرے ہمراہی جو پہلے اس بات پر حیران تھے کہ یہ تھانیدار گستاخانہ جواب سن اور حقارت آمیز رویہ دیکھ کر اس پر ٹوٹ کیوں نہیں پڑتا، اب پریشان ہوئے کہ اسے کس جرم میں گرفتار کیا گیا؟ میں نے اپنا گشت کچھ زیادہ ہی لمبا کر دیا۔ بشارت کو ہتھکڑی پہنا میں ساتھ لیے بازاروں سے ہوتا اس جلوس کے ساتھ تھانہ پہنچا۔ اسے حوالات میں بند کروا خود اپنے کوارٹر میں چلا گیا کہ جاننے والوں میں سے کوئی اس کا سفارشی نہ آن ٹپکے۔ ہیڈ محرر نے پوچھا کہ اس کی رپٹ میں کیا لکھوں؟

میں نے جواب دیا ''فی الحال کچھ نہیں۔''

دراصل میں نے ابھی سوچا بھی نہ تھا کہ اسے کس جرم کے تحت گرفتار کیا گیا۔ وہ تو اپنی ہی دہکائی ہوئی آگ میں گر پڑا تھا۔ اس شورہ پشت کی سفارش میں کئی آدمی (وکلا سیٹھ وغیرہ) آئے لیکن مجھ سے مل نہ پائے کیونکہ میرے اردلی نے ہر ایک کو یہ کہہ کر ٹال دیا ''داروغہ جی سو رہے ہیں'' (حقیقتاً داروغہ جی سفارشیوں سے چھپے بیٹھے تھے)۔ یہ سفارشی بھی بشارت پر بس یہی ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ وہ اس کی خاطر آئے۔

بالآخر ایک صاحب ایسے آئے جو اردلی کے بھی قابو میں نہ آئے اور مجھ سے ملاقات کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ فرمانے لگے ''میں بشارت کو چھڑوانے نہیں آیا۔ صرف اتنا گوش گزار کروں گا کہ بشارت کا آپ کے ساتھ گستاخانہ رویہ پڑس کا نتیجہ تھا۔ اس لیے آپ از راہ کرم اس امر واقع کو مدنظر رکھیں۔''

میں نے ''بہتر'' کہہ کر انھیں رخصت کیا۔ ابھی تک میں فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ بشارت کی گرفتاری کس جرم میں دکھائی جائے۔ ان صاحب نے میری یہ مشکل حل کر دی۔ میں نے اسی وقت اسے سرکاری شفاخانے میں ڈاکٹر کے پاس طبی معائنے کے لیے بھجوایا۔ ڈاکٹر کو جس سے ابھی تک میری ملاقات نہیں ہوئی تھی، کہلوایا کہ نتیجتاً مہربانی سے تحریر کر دیں کہ وہ شراب یا کسی نشے کے زیر اثر ہے۔ یہ

http://www.bookstube.net
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

کچھ ایسے غلط بات بھی نہ تھی۔ تاہم ڈاکٹر نے بغیر کسی خاص معائنے کے لکھ دیا:

"شراب کے نشے میں ہے، منہ سے بدبو آتی ہے، بے ربط باتیں کرتا ہے۔" (یہ کچھ ایسا غلط نہ تھا۔ بشارت پر گرفتاری کا اثر کچھ زیادہ ہی تھا)۔ میں نے اس کی گرفتاری معمولی جرم زیر دفعہ ۳۴ پولیس ایکٹ (نشہ میں بدمست ہو کر شارع عام میں گالم گلوچ کرنا اور عوام کے لیے تکلیف کا باعث ہونے) میں کی۔ پھر آرام سے اس نے حوالات اور میں نے اپنے بستر میں رات گزاری۔

صبح اسے ہتھکڑی لگوا کر حوالات سے نکلوایا۔ بظاہر اس سے جرائم کے متعلق دریافت کرنے کے لیے ٹاؤن ہال کی جانب اپنے سامنے کھڑا کیا۔ میں نے ادھر کرسی میز لگوا رکھی تھی۔ یوں اسے آدھ پون گھنٹے کھڑا رکھا۔ شارع عام سے گزرنے والوں نے اسے اس حالت میں دیکھا۔ پھر میں نے اسے ضمانت و مچلکہ پر رہائی دی اور تحصیل دار جھجھر کی عدالت میں اس کا چالان پیش کیا۔ اس نے میرے کہنے پر اس کی پیشی کی تاریخیں دورے میں دور دور مقامات پر لگائیں۔

ایک روز میں تھانے کے کمپاؤنڈ میں بیٹھا تھا کہ بشارت آیا۔ اس نے حقیقتاً میرے پاؤں پکڑ لیے۔ میں نے اسے اٹھایا اور کہا "اس طرح نہیں کیا کرتے، آخر کیا بات ہے؟"

"کچھ بھی نہیں، آپ میرے مکان پر چلیں۔"

"آخر کیوں؟" میں نے بھنا کر کہا۔ اتنے میں کانسٹیبل قاضی فرید الدین آ گیا۔ (بشارت شاید اسے سمجھ کر آیا ہوگا کہ پہنچ جانا)

اس نے کہا "حرج کیا ہے؟" چلیے اس کے مکان تک گھوم آتے ہیں۔ دیکھیں یہ کیا دکھاتا ہے۔"

میں اور قاضی فرید، بشارت کے ساتھ اس کے مکان پر پہنچے۔ دیکھا کہ اس کے سامنے راکھ کا ڈھیر لگا تھا۔

"اچھا تو تم یہ دکھانا چاہتے تھے؟" میں نے کہا۔

"جی ہاں، میں نے نہ صرف چھان پھونک کر قمار خانہ ختم کر دیا بلکہ ہر قسم کے جرم سے توبہ کر لی ہے۔" بشارت نے جواب دیا۔

"اللہ استقامت دے۔" میں نے کہا۔ بعدازاں تحصیل دار سے فرمائش کر کے بری کرا دیا۔ یوں قصبے میں مجرموں پر میری دھاک بیٹھ گئی اور پھر میری موجودگی تک کسی خاص جرم کا واقعہ ظہور پذیر نہیں ہوا۔ ◆◆◆

کام کی باتیں

☆ جس نعمت کی ناشکری کی جائے وہ کبھی پائدار نہیں ہوتی۔ (ابو یعقوب)
☆ بیوقوفوں کی طرح سوال اور عقل مندوں کی طرح یاد کرو۔ (ابراہیم بن مہدی)
☆ فرزندِ آدم کی بھلائی خدا کی بندگی اور عزت سرافگندگی میں ہے۔ (احمد بن یحییٰ)
☆ بہت سی مصیبتیں ایسی ہیں جو امیروں کو اٹھانی پڑتی ہیں اور غریب ان سے بچے رہتے ہیں۔ (احمد کبیر)
☆ معرفت کے درخت کو تفکر کا پانی ملتا ہے اور غفلت کے درخت کو جہالت کا، توبہ کے درخت کو ندامت کا۔ (احمد مسروق)
☆ آنکھوں سے دنیا کی طرف نہ دیکھنا اور دل سے اس کے متعلق فکر نہ کرنا تقویٰ ہے۔ (احمد مسروق)
☆ جو شخص فضولیات میں مبتلا ہوگا، وہ کبھی ضروریات کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتا، یہ تجربے کی بات ہے۔ (اشرف علی تھانوی)

(انتخاب: تحریم رمضان، ضلع وہاڑی)

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

فرمائش ایک فقیر کی......

بساط بھر چاول

سینہ بہ سینہ چلی آرہی ریاضی کی
پیچیدگیاں بیان کرتی دلچسپ داستان

سہیل یوسف

امی جی بچپن میں ہمیں یہ کہانی سنایا کرتی تھیں۔ سچی بات ہے تب یہ کہانی ہمارے سر سے گزر جایا کرتی۔ لیکن جب بڑے ہوئے تو معلوم ہوا کہ ریاضی سے اس کا کتنا گہرا تعلق ہے۔

کہانی کچھ یوں ہے کہ کسی ملک کا بادشاہ خود کو شطرنج کا بہت بڑا ماہر سمجھتا تھا۔ اسے زعم تھا کہ شطرنج کے کھیل میں کوئی اسے نہیں ہرا سکتا۔ پھر ایک دن یوں ہوا کہ پڑوسی ملک کے بادشاہ نے اس کی سرحدوں پر اپنی فوج لا کر کھڑی کر دی۔ پڑوسی ملک بہت طاقتور تھا اور اس کی فوج بھی بہت زیادہ تھی۔ لڑائی شروع ہونے سے پہلے، دوسرے ملک کے بادشاہ نے اپنے ایلچی کے ہاتھ اس بادشاہ کو پیغام بھیجا، اگر وہ شطرنج کے کھیل میں اسے شکست دینے میں کامیاب ہو گیا، تو وہ اپنی فوجیں واپس لے جائے اور دوبارہ کبھی حملہ نہ کرے۔ لیکن اگر وہ ہار گیا تو پھر اسے اپنی ساری سلطنت، پڑوسی بادشاہ کے حوالے کرنا ہو گی۔ خون خرابے سے بچنے کے لیے حملہ آور بادشاہ نے شرط منظور کر لی۔

ایک بڑے ہال نما کمرے میں، جس کے فرش پر شطرنج کی بساط کے خانے بنے ہوئے تھے (جن میں مہروں کی جگہ غلام کھڑے کیے جاتے کھیل شروع ہوا۔ حملہ آور بادشاہ اور اس کے مشیر بھی شطرنج میں زبردست ماہر تھے۔ ان کے مقابلے میں شطرنج میں مہارت کا دعویٰ رکھنے والے بادشاہ سلامت کمزور پڑنے لگے۔ ایک ایک کر کے ان کے غلام (یعنی مہرے) پٹتے گئے۔ یہ دیکھ کر ان کے ہوش جاتے رہے

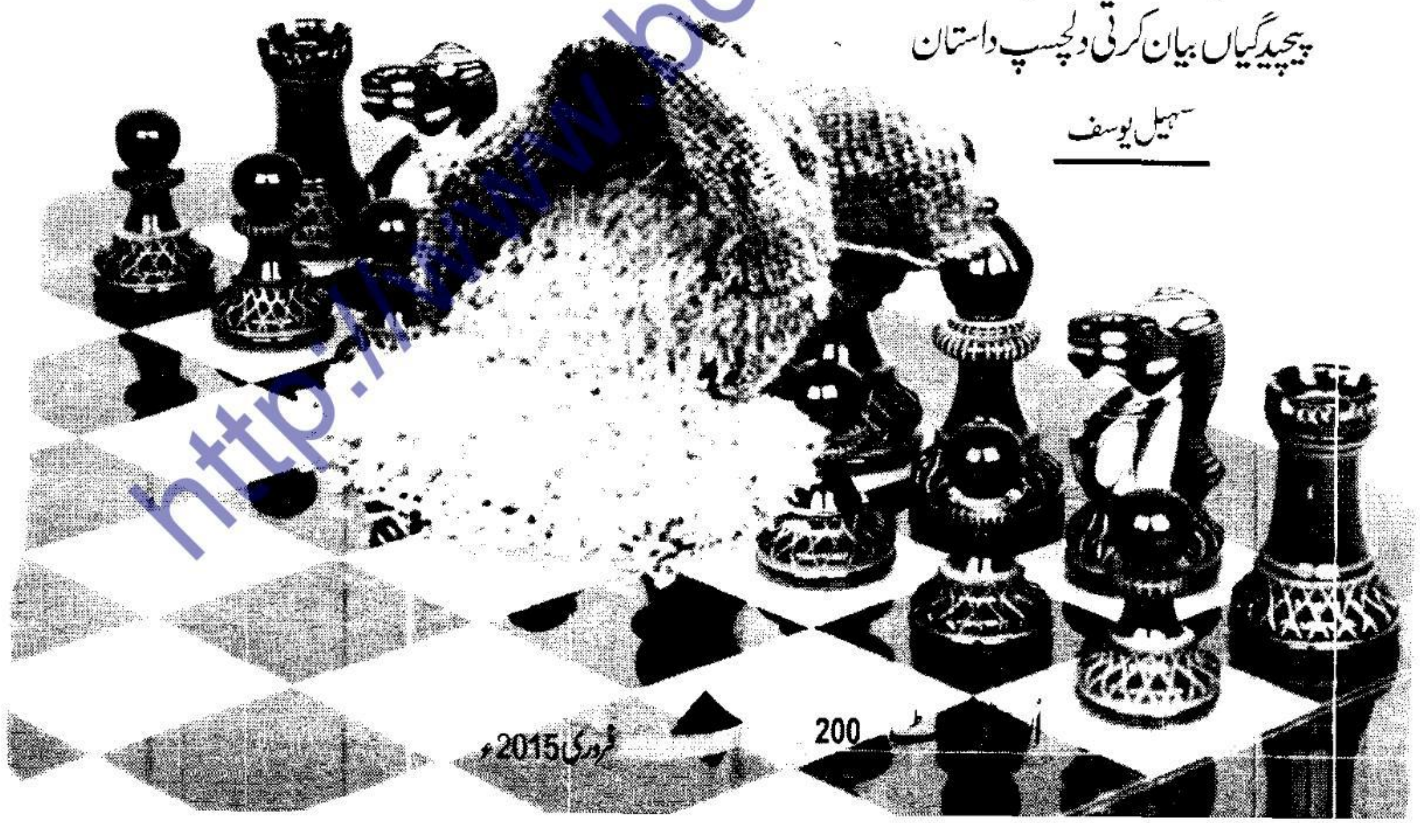

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

وہ اپنے وزیروں مشیروں سے مشورے مانگنے لگے۔ لیکن پوری سلطنت میں سب سے زیادہ شطرنج تو بادشاہ سلامت ہی کو آتی تھی۔ دوسروں کے مشوروں پر عمل کرنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ بازی اور بھی زیادہ ہاتھ سے نکلنے لگی۔ بادشاہ کا گھمنڈ ٹوٹ گیا۔ وہ دل ہی دل میں توبہ کرتے ہوئے، اللہ تعالیٰ سے غیبی مدد کی دعا مانگنے لگا۔

اسی موقع پر ایک وزیر نے آ کر بادشاہ کے کان میں کہا ''حضور! باہر ایک فقیر کھڑا ہے۔ کہتا ہے کہ وہ آپ کو شکست کو فتح میں بدل سکتا ہے۔ اسے یہاں آنے کی اجازت دی جائے یا نہیں؟''

بادشاہ نے اجازت دے دی۔ کچھ ہی دیر بعد میلے کچیلے کپڑوں والا ایک فقیر اس کے سامنے تھا۔ اس نے بادشاہ سے وعدہ لیا کہ وہ صرف وہی چال چلے گا جسے چلنے کا مشورہ فقیر دے گا۔ یعنی وہ شطرنج کے کھیل سے عملاً دستبردار ہو جائے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے پانسہ پلٹ گیا۔ فقیر نے ایسی ایسی چالیں بتائیں کہ بادشاہ کو شطرنج میں مہارت کا اپنا دعویٰ غلط معلوم ہونے لگا۔ حملہ آور بادشاہ کے مہرے ایک کے ایک کر کے پٹتے چلے گئے، یہاں تک کہ اسے ''شہ مات'' ہوگئی..... اس طرح حملہ آور بادشاہ اپنے لاؤ لشکر سمیت واپس چلا گیا۔ پورے ملک میں خوشی کے شادیانے بجائے جانے لگے۔

فقیر نے بادشاہ سلامت سے رخصت چاہی تو بادشاہ نے کہا ''نہیں! ہم تمھیں ایسے جانے نہیں دیں گے۔ تم نے ہماری سلطنت بچائی ہے۔ اس لیے تمھیں منہ مانگا انعام دیا جائے گا۔ بولو! تمھیں کیا چاہیے؟''

اس پر فقیر نے کہا: ''گستاخی معاف جہاں پناہ! لیکن جو کچھ مجھے چاہیے، آپ کا خزانہ وہ دینے کے قابل نہیں۔''

یہ سن کر بادشاہ آگ بگولا ہوگیا کہ ایک فقیر میں اتنی ہمت کیسے آ گئی کہ وہ شاہی خزانے کو بے حیثیت کہے..... اس نے فقیر کو حکم دیا کہ وہ اپنی فرمائش بیان کرے ورنہ اس کا سر قلم کر دیا جائے گا۔ یہ سن کر فقیر کہنے لگا: ''جناب! میری فرمائش تو صرف اتنی سی ہے کہ آپ مجھے بساط بھر چاول اس طرح سے عطا فرمایئے کہ (شطرنج کی) بساط کے ہر خانے میں پچھلے خانے سے دو گنی تعداد میں چاول ہوں اور بس۔''

یہ عجیب و غریب فرمائش سن کر بادشاہ اور اس کے درباریوں نے ہنستے ہنستے پیٹ پکڑ لیے، مگر فقیر کی سنجیدگی میں فرق نہیں آیا۔ جب یہ لوگ اچھی طرح سے فقیر کا مذاق اڑا چکے تو شاہی خزانے کے نگراں کو حکم دیا گیا کہ وہ فقیر کو سرکاری غلہ گودام میں لے جائے اور اس کی فرمائش پوری کر دے۔

لیکن وہی ہوا جیسا فقیر نے کہا۔ غلہ گودام میں رکھے ہوئے چاولوں کی ساری بوریاں خالی ہوگئیں لیکن فقیر کے مانگے ہوئے ''بساط بھر چاول'' پورے نہ ہو سکے۔ بادشاہ کو جب یہ خبر ہوئی تو اس نے فوراً فقیر کو بلوا بھیجا اور ماجرا دریافت کیا۔ اس پر فقیر نے کہا: ''انسان کو چاہیے کہ وہ اپنی بساط سے بڑھ کر خدائی دعوے نہ کرے۔'' یہ کہہ کر وہ دربار سے چلا گیا اور پھر کبھی دکھائی نہیں دیا۔

امی جی کی سنائی ہوئی کہانی تو یہاں آ کر ختم ہوگئی۔ لیکن بچپن میں یہ کہانی اس لیے ہماری سمجھ میں نہیں آ سکی کیونکہ ہمیں اس میں پوشیدہ ریاضی سے واقفیت نہ تھی۔ اب ذرا حساب لگایئے کہ شطرنج کی بساط پر فقیر کی

http://www.bookstube.net/

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

فرمائش کے مطابق کتنے چاول آئے ہوں گے۔

یاد رہے کہ شطرنج میں ۶۴ خانے ہوتے ہیں۔ لہٰذا ہر خانے میں چاول کے دانوں کی تعداد اور مختلف خانوں میں رکھے گئے چاولوں کی تعداد کا مجموعہ کچھ اس طرح سے معلوم کیا جا سکتا ہے:

خانہ نمبر	خانے میں چاولوں کی تعداد	دانوں کی مجموعی تعداد
1	1	1
2	$2=2^1$	$3=2^2-1$
3	$4=2^2$	$7=2^3-1$
4	$8=2^3$	$15=2^4-1$
5	$16=2^4$	$31=2^5-1$
6	$32=2^5$	$63=2^6-1$
7	$64=2^6$	$127=2^7-1$
8	$128=2^7$	$255=2^8-1$

پہلے آٹھ خانوں کی ترتیب سامنے رکھیں تو ایک فارمولا اخذ کیا جا سکتا ہے۔ اگر خانے کا نمبر N ہو تو اس خانے میں چاول کے دانوں کی تعداد 2^n-1 ہوگی، جب کہ پہلے خانے سے اس خانے تک میں (جسے ہم nواں خانہ بھی کہہ سکتے ہیں) چاول کے دانوں کی مجموعی تعداد 2^n-1 ہوگی۔

اب چونکہ شطرنج کی بساط میں 64 خانے ہوتے ہیں، لہٰذا 64ویں خانے (n=64) تک پہنچتے پہنچتے، بساط پر چاول کے دانوں کی مجموعی تعداد یہ ہوگی۔

$$2^{64}-1$$

قوت نما (Power) کے استعمال نے اس تعداد کو ظاہری طور پر بہت مختصر کر دیا۔ لیکن درحقیقت یہ عدد بہت بڑا ہے۔ البتہ اپنے کام کو آسان بنانے (اور چاولوں کی صحیح تعداد معلوم کرنے کے لیے ہم اس عدد کو چھوٹے اعداد میں توڑ کر آپس میں ضرب دے سکتے ہیں۔ کچھ اس طرح:

$$2^{64}=2^8 x 2^8 x 2^8 x 2^8 x 2^8 x 2^8 x 2^8 x 2^8$$

چونکہ 2^8 کا حاصل 256 ہوتا ہے، لہٰذا:

256x256x256x256x256x256x256x256

اس حساب کا حاصل ضرب یہ ہے:

18,446,744,073,709,551,616

لیکن یہ تو صرف تعداد ہے۔ اگر ہم یہ معلوم کرنا چاہیں کہ اتنے چاولوں کا وزن کتنا ہوگا تو ہمیں یہ بھی پتا ہونا چاہیے کہ چاول کے ایک دانے کا اوسط وزن کتنا ہوتا ہے۔ اب تک کی کھوج سے معلوم ہوا ہے کہ چاول کے ایک دانے کا اوسط وزن ۳۰ ملی گرام ہوتا ہے۔ لہٰذا اوپر دی گئی تعداد کو ۳۰ سے ضرب دینے پر ہمیں ان چاولوں کا وزن (ملی گرام میں) حاصل ہو جائے گا، جو یہ ہوگا:

553,402,322,211,286,548,480۔

اس وزن کو گرام میں لانے کے لیے ۱۰۰۰ سے تقسیم کیجیے کیونکہ ایک ملی گرام دراصل ایک گرام کا ہزارواں حصہ ہے۔ لہٰذا چاولوں کا وزن (گراموں میں) یہ ہوگا:

553,402,322,211,286,548.48

ہمارا کام اب بھی پورا نہیں ہوا، بلکہ ابھی یہ دیکھنا باقی ہے کہ یہ چاولوں کی کتنے کلوگرام مقدار ہے۔ لہٰذا اوپر حاصل ہونے والے عدد کو ہم ایک بار پھر ۱۰۰۰ سے تقسیم کریں گے کیونکہ ''کلوگرام'' کا مطلب ہے ایک کلوگرام۔ یہ مقدار ہوگی:

553,402,322,211,286.54848

لیکن آج کل زرعی اجناس کی پیداوار کے لیے جو پیمانہ رائج ہے، وہ ''میٹرک ٹن'' کہلاتا اور ۱۰۰۰ کلوگرام

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

کے برابر ہوتا ہے۔ لہٰذا میٹرک ٹنوں میں ان چاولوں کا وزن یہ ہوگا:

553.402.322.211.286548480

ابتداء میں ہم نے جو فارمولا معلوم کیا تھا، اس کے مطابق بساط پر چاولوں کی مجموعی تعداد 1-264 ہے۔ اب چونکہ 30 ملی گرام کا مطلب 0.00000003 ٹن ہوتا ہے۔ لہٰذا اوپر حاصل کردہ وزن میں سے یہ ننھی منی مقدار بھی نفی کر دیں گے تو بساط بھر چاولوں کا تخمینی وزن (میٹرک ٹنوں میں) یہ ہوگا:

553,402,322,211,28654845

یعنی یہ وزن ساڑھے پانچ کھرب ٹن سے بھی زیادہ ہے! اتنے چاول تو ساری دنیا کے کسان مل کر بھی نہیں اگا سکتے۔ بھلا بادشاہ کے خزانے کی اس کے سامنے کیا حیثیت ہے۔

کہانی کی ریاضیاتی وضاحت جو ہم نے ابھی پیش کی، اس کا تعلق الجبرا میں "ہندسی تسلسل" (Geometric sequence) سے ہے۔ ہندسی تسلسل میں کوئی بھی رقم (Term) حاصل کرنے کے لیے اس سے پچھلی کو کسی خاص عدد سے ضرب یا تقسیم کرنا پڑتا ہے۔ البتہ، اگر آپ اب بھی اسے محض حسابی شعبدہ بازی سمجھنے پر مُصر ہیں تو مختصراً صرف اتنا جان لیجیے کہ طبیعات سے لے کر معاشیات تک، ہماری زندگی کے متعدد شعبوں میں ہندسی تسلسل کا بہت دخل ہے۔

زنجیری عمل (Chain reaction) اس کی ایک اچھی مثال ہے جس میں تابکار یورینیم (U-235) کا ایک ایٹم ٹوٹتا ہے اور اس سے تین آزاد نیوٹرون خارج ہوتے ہیں۔ یہ تین نیوٹرون، اردگرد موجود مزید تین یورینیم 235 ایٹموں سے ٹکراتے، ان کے مرکزوں کو توڑتے اور زبردست توانائی کے ساتھ ساتھ (ہر یورینیم 235 ایٹم سے) تینوں نیوٹرونوں کے اخراج کا باعث بنتے ہیں۔ یہ سب کچھ اتنی تیز رفتاری سے ہوتا ہے کہ صرف چند سیکنڈ میں کھرب ہا کھرب یورینیم ایٹموں کے مرکزے ٹوٹ جاتے ہیں اور ہم کہتے ہیں کہ ایٹم بم پھٹ گیا۔

ایٹمی بجلی گھروں میں ایسے دھاتی عناصر کی سلاخیں لگائی جاتی ہیں جو نیوٹرون جذب کرنے کے قابل ہوں، تاکہ عمل انشقاق (Fission) کو حسب ضرورت قابو میں رکھا جا سکے۔ اگر خدانخواستہ کبھی اس نظام میں خرابی واقع ہو جائے اور نیوٹرون جذب کرنے والی سلاخوں کو بروقت ایٹمی بجلی گھر کے قلب (Core) میں اتارا نہ جا سکے تو صرف چند منٹوں میں پورا ایٹمی بجلی گھر کسی ایٹم بم میں بھی تبدیل ہو سکتا ہے..... جیسا کہ چرنوبل میں ہوا۔

بساط بھر چاولوں کی اس کہانی میں ہمارے لیے ایک نصیحت تو یہ ہے کہ انسان کو اپنی اوقات بھول کر خدائی دعوے نہیں کرنے چاہئیں۔ دعوے اور تکبر صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہی کو زیب دیتے ہیں۔ دوسری اور علمی نصیحت ان لوگوں کے لیے ہے جو سائنس اور انجینئرنگ کے میدان میں ریاضی کو حقیر سمجھتے ہیں۔ آج ریاضی کو تمام سائنسی علوم کی ماں (Queen of all Sciences) کہا جاتا ہے۔ ہندسی تسلسل تو اس کی صرف ایک مثال ہے ورنہ سائنس کے میدان میں ریاضی کا اطلاق ہر گوشے میں پھیلا ہوا ہے۔ اگر ہمارے قارئین یہ نکتہ سمجھ گئے تو ان شاء اللہ آئندہ وہ ریاضی کو فضول سمجھ کر اس پر نکتہ چینی نہیں کریں گے اور نہ ہی اس کا مذاق اڑائیں گے۔

(بشکریہ ماہنامہ گلوبل سائنس، کراچی)

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk

گھوڑا گاڑی

بے رحم باپ کے ہاتھوں پٹے ایک معصوم بچے کا نوحہ وہ صرف اپنے خوابوں میں بسنا چاہتا تھا

نیلوفر اقبال

سائیکل زوردار آواز کے ساتھ صحن کے پکے فرش پر گر گئی۔ گڈو سہم کر دیوار کے ساتھ لگ گیا اور خوف سے پھٹی آنکھوں کے ساتھ کمرے کے بند دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ حسب توقع کمرے کا دروازہ کھلا اور اس کا چڑچڑا باپ سرخ آنکھیں لیے بڑبڑاتا ہوا نکلا۔ پہلے اس نے جھک کر سائیکل کا معائنہ کیا۔ پھر آہستہ آہستہ اسے کھڑا کر دیا۔ سائیکل کی بتی چکنا چور ہو گئی تھی۔ نیا چمکیلا پینٹ کئی جگہوں سے اکھڑ گیا تھا۔ مارے غصے کے باپ کے منہ سے کف جاری ہو گیا۔

"آج زندہ نہیں چھوڑوں گا کتے کی اولاد۔" باپ نے گڈو کو سوکھے بازو سے پکڑ کر گھسیٹ لیا۔

"کہاں ہے میری چھڑی؟" شہتوت کی لچکیلی پتلی چھڑی اسی مقصد کے لیے صحن کے کونے میں کھڑی رہتی تھی۔

ماں اور دوسرے بہن بھائی سہمے ہوئے خاموش کھڑے تھے۔ ایسے موقع پر کسی کی معمولی لغزش بھی چھڑی کا رخ اس کی طرف موڑ سکتی تھی۔ ویسے بھی سب کا خیال تھا کہ گڈو تھوڑی بہت سزا کا مستحق ضرور ہے۔ سائیکل بہت چاؤ اور ارمانوں کے ساتھ گھر میں آئی تھی۔ یہ باپ کو کارخانے کی طرف سے آسان قسطوں پر ملی تھی۔ جب سائیکل آئی باپ خلاف معمول بہت خوش تھا۔ لڈوؤں اور رنگ برنگے بدانے کے لفافے اور بڑا سا تربوز لایا۔ گھر میں عید کا سا سماں تھا۔ باپ کہہ رہا تھا کہ شہر جا کر سائیکل کو

http://www.bookstube.net/

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

سجانے کے لیے پلاسٹک کے پھول اور رنگین ٹوکری لائے گا۔ دونوں طرف دو شیشے لگائے گا۔

باپ کے خوش ہونے کی وجہ سے ماں بھی چہک رہی تھی۔ کیونکہ عام طور پر جب وہ کارخانے سے آتا' تو پیدل طویل سفر اور تھکاوٹ کی وجہ سے اس پر بدمزاجی کا بھوت سوار ہوتا۔ ایک ادھ بچے کی پٹائی' تو ہو ہی جاتی۔ ماں تو خیر گالیوں کی عادی ہو گئی تھی۔ آج گڈو سے جو جرم سرزد ہوا تھا، اس پر سب دم سادھے کھڑے تھے کہ دیکھیں آج باپ بیٹے کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے۔

شہتوت کی چھڑی پازیب کی آواز کے ساتھ گڈو کے دبلے پتلے بدن پر برسنے لگی' تو وہ چیختا ہوا زمین پر لوٹ گیا۔ ''بس ابا! بس ابا! بس۔'' اس نے چھڑی کو اپنے ہاتھوں پر روکنے کی کوشش کی۔

''آج نہیں چھوڑوں گا۔'' باپ پر بھوت سوار تھا۔

آخر ماں سے برداشت نہ ہو سکا۔ اس نے دوڑ کر بچے کو بازوؤں میں چھپا لیا۔ چھڑی اس کے بھنچے ہوئے ہاتھوں کی ہڈی پر سفید نشان چھوڑ گئی' تو وہ چیخ اٹھی۔ ''بس کرو نا، جان لو گے بچے کی اتنی بات پر؟''

''اتنی سی بات؟ یہ اتنی سی بات ہے؟ ستیاناس ہو گیا نئی سائیکل کا...... کوئی چیز...... کوئی چیز؟'' وہ غصے کی شدت سے ہکلا رہا تھا۔ ''کوئی چیز یہ حرام کے پلے نہیں چھوڑتے اس گھر میں۔ یہ سب تیرا بگاڑ ہے۔ میں تو دس منٹ میں سیدھا کر دوں ساروں کو...... آج نہیں چھوڑوں گا...... سبق سکھا کے چھوڑوں گا۔''

اس نے گڈو کو ماں کی گرفت سے کھینچا اور گھسیٹتا ہوا صحن کے کونے میں بنی کوئلوں اور کباڑ والی کوٹھڑی کی طرف لے گیا۔ گڈو کو اندر دھکیل کر باہر سے کنڈی چڑھائی، سب کو تنبیہی نظروں سے دیکھتے ہوئے چھڑی لہرائی اور بولا ''اگر کسی نے دروازہ کھولا' تو کھال کھینچ لوں گا۔ جب تک میں

مصنّفہ سے ملیے

اسلام آباد سے تعلق رکھنے والی افسانہ نگار، نیلوفر اقبال تقریباً ربع صدی سے کہانیاں لکھ رہی ہیں۔ اس دوران آپ کے دو تین افسانوی مجموعے بھی شائع ہو چکے۔ آپ معاشرتی موضوعات کو بڑی خوبصورتی سے اپنے افسانوں میں نمایاں کرتی اور اپنی ہر تخلیق کو ایک فن پارے کی حیثیت دیتی ہیں۔ رواں دواں انداز بیان قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ اردو ڈائجسٹ مستقبل میں بھی آپ کے عمدہ افسانے شائع کرے گا۔

خود نہ کھولوں، خبردار جو کسی نے کنڈی کو ہاتھ لگایا۔''

اس نے ایک بار پھر سائیکل کا معائنہ کیا۔ اکھڑے ہوئے پینٹ والی جگہوں پر ہاتھ پھیرا۔ پلاسٹک کے پھولوں کو اٹھا کر مٹی جھاڑی۔ ٹوٹی بتی کی کرچیوں کو ہاتھ میں لے کر کتنی ہی دیر خاموش کھڑا رہا۔ پھر سرخ سرخ آنکھوں سے سب کو گھورا اور پیر پٹختا کمرے کے اندر چلا گیا۔

☆☆

اس روز دوپہر ہی سے گڈو بیری کے درخت پر چڑھ کر ایک موٹی سی شاخ کی کرسی بنائے بیٹھا تھا۔ وہ مزے لے لے کے کھٹے میٹھے سرخ سرخ بیروں سے وقت گزاری کر رہا تھا۔ ''پھو'' کی آواز کے ساتھ کسی گٹھلی کو ہوا میں اڑا دیتا اور وہ غیر محسوس سی ٹپ کی آواز کے ساتھ صحن کی مٹی میں بکھری سیکڑوں کنکریوں، پتوں اور دوسری بے نام اشیا میں شامل ہو جاتی۔

نرم نرم ہوا کے جھونکے، میٹھے میٹھے بیر اور ہوا کے جھونکوں سے بجتا ہوا درختوں کے پتوں کا ساز اور سامنے پھیلا ہوا محبوب نظارہ...... سرسوں کے کھیت کے زرد اور سبز

www.pdfbooksfree.pk

قطعے، اس سے پرے چلتی ہوئی سڑک اور اس پر چمکتی دمکتی وہ رنگ برنگی پریاں! سڑک پر چلتے تو تانگے، ریڑھے اور ٹرک بھی تھے، لیکن وہ صرف گاڑیوں کو دیکھتا...... نیلی پیلی سرخ سبز سفید دھوپ میں دمکتی گاڑیاں، کسی دوسری دنیا کی مخلوق خوبصورت جادوگرنیاں جنھیں دیکھتے وہ نہ تھکتا۔ ان کے اندر بیٹھنے کا تو وہ سوچتا بھی نہیں تھا۔ اسے تو بس دیکھنے میں مزا آتا۔ وہ انھیں رنگوں کے حساب سے گنتا...... پانچ لال، گیارہ سفید، بیس کالی اور چار پیلی۔

لیکن آج اس کا دل گاڑیاں گننے میں نہیں لگا۔ آج کا دن دوسرے دنوں جیسا تھوڑا ہی تھا۔ اس کے دوسرے بہن بھائی بے پروائی سے ادھر ادھر کھیل رہے تھے۔ جیسے آج کا دن بھی دوسرے دنوں جیسا تھا۔ لیکن وہ کتنا بے تاب تھا، اسی لیے تو کب سے درخت پر چڑھا دور سڑک پر نظریں جمائے تھا اور بے خیالی میں کتنے ہی کچے پکے بیر کیڑوں سمیت کھا گیا۔

''آ گیا ابا'' اس نے پورے زور سے چلا کر کہا اور درخت سے پھسلتا ہوا نیچے کود گیا۔ اس کی ہتھیلیاں اور گھٹنے چھل گئے۔ لیکن وہ تو چھلاوہ بن گیا اور زمین پر پیر پڑتے ہی اگلے لمحے پگڈنڈی پر تھا۔ صحن میں گویا بھونچال سا آ گیا۔ اس کے پیچھے پانچ کے پانچ بہن بھائی بے لگام گھوڑوں کی طرح سرپٹ بھاگے۔ حتیٰ کہ ڈھائی سالہ چھوٹا جو ہر وقت لباس کے نام پر بالشت بھر کی ملگجی سی کرتی میں ملبوس رہتا تھا اور ستر پوشی کے تمام ضابطوں سے مبرا سمجھا جاتا' وہ بھی ''ابا آیا'' کہہ کر ڈگمگاتی ہوئی ٹانگوں سے پیچھے ہولیا۔

کھیتوں اور پگڈنڈیوں سے ہوتے ہوئے پودوں کو کچلتے، کودتے، پھاندتے انھوں نے باپ کو سڑک کی طرف سے آتی ہوئی پگڈنڈی پر جالیا۔ پھر ذرا سے فاصلے پر رک کر وہ شرما شرما کر دانت نکال دیکھنے لگے۔ ابا کے ساتھ وہ بھی تھی...... وہ سائیکل...... نئی سائیکل......، پھر وہ سارے سائیکل کے پیچھے جلوس کی شکل میں چلنے لگے۔

''پری ہے پری۔'' گڈو نے سرگوشی میں کہا۔ چھوٹے نے جرأت کر کے ہاتھ لگانے کی کوشش کی' تو گڈو نے زور سے ہونہہ کر کے اسے ہٹا دیا۔ پھر ان کی توجہ کیریئر میں پھنسے لفافوں کی طرف مبذول ہوگئی، جن پر لگے گھی کے دھبے اور مخصوص خوشبو بتا رہی تھی کہ اندر مٹھائی اور دوسرے کھانے پینے کی چیزیں ہیں۔ چھوٹی بہن ثوبی نے لفافوں کو ہاتھ لگانے کی کوشش کی تو گڈو نے ایسی چوٹی کھینچی کہ دہری ہوگئی۔ باپ ایک ہاتھ سے سائیکل تھامے تھا اور دوسرے میں بڑا سا تھیلا جس میں کسی گول بڑی سی چیز کا ابھار صاف نظر آ رہا تھا۔ ان سب نے باری باری جھانک کر دیکھ لیا...... اتنا بڑا تربوز۔

''سب کو باری باری سیر کراؤں گا...... اس کو ہاتھ نہیں لگانا۔ خراب ہو جائے گی۔ سمجھ گئے؟'' باپ نے تنبیہی انداز میں گردن گھما کر ان سب سے کہا تھا۔

⁂

وہ کتنی ہی دیر کوٹھڑی کے گرد آلود فرش پر پڑا سسکتا رہا۔ اس کی پسلیوں اور پشت پر چھڑی کی ضربوں سے ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ سخت گرمی اور حبس تھا۔ جون کی تپتی دوپہر میں کوٹھڑی کسی بھٹی کی طرح دہک رہی تھی۔ اس کا دم گھٹنے لگا اور شدید پیاس محسوس ہوئی۔ وہ اٹھ کر دونوں ہاتھوں سے دروازہ پیٹنے لگا۔ ''ماں! ماں! پانی۔''

جب کوئی بھی کوٹھڑی کے نزدیک نہ آیا' تو وہ بے دم ہو کر فرش پر بیٹھ گیا۔ اسے فرش قدرے ٹھنڈا لگا۔ کتنی ہی دیر وہ بے سدھ دیوار سے ٹیک لگائے پڑا رہا۔ کوٹھڑی میں جا بجا ردی کاغذ اور رسالے بکھرے پڑے تھے۔ اس کا چاچا ردی بیچنے کا کام کرتا تھا۔ طرح طرح کے لفافے، اخبار اور رسالوں کے ڈھیر لگے تھے۔ گڈو کچھ دیر یونہی کاغذ پھاڑتا اور گولے بنا بنا کر دیوار پر مارتا رہا۔ پیاس سے اس

www.pdfbooksfree.pk

کے حلق میں کانٹے پڑ رہے تھے۔ آہستہ آہستہ اس پر نقاہت اور غنودگی طاری ہونے لگی۔ اپنا گال مٹی سے اٹی زمین پر رکھ کر وہ اوندھا لیٹ گیا۔

دروازے کے نیچے سے آتی ہوئی دھوپ کی روشنی میں ایک رنگین چھپے ہوئے ورق نے اس کی توجہ کھینچ لی۔ یہ ایک رنگین تصویر تھی۔ اس نے تصویر اپنی طرف کھینچ لی اور دروازے کی جھری سے آتی ہوئی ہلکی ہلکی روشنی میں یونہی اوندھے لیٹے لیٹے غور سے اسے دیکھنے لگا۔ تصویر میں ایک گھوڑا گاڑی پھولوں بھرے رستے پر دوڑ رہی تھی۔ اس کے آگے چھ سفید گھوڑے جتے تھے۔ راستے کے اختتام پر دور ایک سنہرا محل تھا۔ گھوڑا گاڑی محل کی طرف رواں تھی۔ اس کی نرم گدگدی سی نشستیں عنابی مخمل کی تھیں اور ان پر سنہرے پھندنے لگے تھے۔ گڈو کوٹھڑی کے تاریک ماحول سے بے خبر گھوڑا گاڑی میں کھو گیا۔ گھوڑوں کے سروں پر سرخ پروں کی کلغیاں لگی تھیں اور وہ سینہ تانے بگٹٹ دوڑ رہے تھے۔ سب سے خوبصورت تو گھوڑا گاڑی کے پہیے تھے، سنہرے اور خوب بڑے بڑے۔ گڈو پہیوں کے حسن اور چمک دمک میں محو ہو گیا۔

یکایک گاڑی کے پہیے متحرک ہو گئے۔ ''ارے یہ تو چل پڑی! دوڑ کر اس میں بیٹھ جانا چاہیے۔'' گڈو لپک کر گاڑی پر چڑھا اور نرم نرم سی نشست میں دھنس کر بیٹھ گیا۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی اسے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے محسوس ہوئے.....ارے یہ تو بڑی مزیدار ہے۔ وہ گھوڑوں کی چال کی دھمک کے ساتھ ساتھ نشست پر اچھلنے لگا۔ ''یہ گاڑی شاید سامنے باغ میں جائے گی۔ جاتے ہی ٹھنڈا ٹھار پانی پیوں گا۔'' گاڑی گھنے درختوں سے بھرے رستے پر دوڑ رہی تھی۔ ہوا میں پتوں کی بھینی بھینی مہک تھی۔ گڈو لمبے لمبے سانس لینے لگا۔

گھوڑے باغ کے دروازے کے سامنے پہنچ کر رک گئے۔ گڈو چھلانگ لگا کر گاڑی سے اترا۔ وہ کسی تتلی کی طرح ہلکا پھلکا تھا۔ اچھلتا کودتا باغ میں داخل ہو گیا۔ ایسا باغ، تو اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ ایک ننھی سی پری کی طرح گھاس پر ادھر سے ادھر دوڑنے لگا۔ پھر ایک رنگ برنگی تتلی نے اس کی توجہ کھینچ لی۔ وہ اسے پکڑنے دوڑا۔

''اسے نہیں پکڑو۔ بچاری کے پر ٹوٹ جائیں گے۔'' اسے ایک ملائم سی آواز سنائی دی۔

گڈو نے چونک کر دیکھا سامنے ایک عورت کھڑی تھی۔ اتنی خوبصورت اور اتنے اچھے کپڑوں والی عورت تو اس نے پوری زندگی میں نہیں دیکھی تھی۔ عورت نے پیار سے گڈو کو کھینچ لیا۔ اس کے کپڑوں سے بھینی بھینی خوشبو آ رہی تھی۔ گڈو کو یوں لگا جیسے یہ ماں ہے۔ مگر نہیں ماں کے کپڑوں سے تو ہر وقت لہسن اور پسینے کی کھٹی کھٹی سی بو آتی تھی۔ اس کے چہرے کو کپڑوں کی ٹھنڈک اور خوشبو سے عجیب راحت ملی۔

''میرے ساتھ آؤ'' عورت اس کا ہاتھ تھامے محل کی طرف بڑھی۔ گڈو کو یوں لگ رہا تھا جیسے یہ محل اس نے پہلے بھی دیکھا ہوا ہے۔ یہاں کی سب چیزیں دیکھی بھالی ہیں۔ دیوار کے ساتھ بہت سی الماریاں تھیں۔ ان کے کواڑ رنگین شیشوں کے بنے تھے۔

''اس الماری میں شربت ہے۔'' اس نے انگلی سے اشارہ کر کے عورت کو بتایا۔

عورت ہنس پڑی بولی ''ہاں، اس میں شربت ہے.....مگر تمھیں کیسے پتا چلا؟''

''مجھے خود ہی پتا چل جاتا ہے۔''

''اچھا؟'' عورت نے مصنوعی حیرت سے بھنویں چڑھائیں۔ ''اور کیا'' گڈو تن کر بولا۔

عورت نے شربت نکال کر گڈو کو گلاس بھر بھر کر

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

دیے…… چار…… پانچ…… چھے گلاس۔

''اب بس میرا پیٹ پھٹ جائے گا۔''

''تم بہت اچھے بچے ہو۔'' عورت نے اس کی پیشانی چوم لی۔

''چلو کھیلیں۔'' وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر باہر لے آئی۔ باغ میں دوسرے بچے بھی کھیل رہے تھے۔ گڈو جھولے کی طرف لپکا۔

''میں جھولا جھول لوں؟ کوئی مارے گا تو نہیں؟''

''نہیں تو۔''

گڈو مزے مزے سے لمبے لمبے جھولے لینے لگا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا اس کے بال اور کپڑے اڑا رہی تھی۔ باغ میں اِدھر اُدھر رنگین بادل اُڑ رہے تھے…… سبز، گلابی، کاسنی۔ گڈو کا دل مچلا ان کو چھو لے، ان کے اندر گھس جائے۔ وہ جھولے سے اتر کر سبز بادل کے پیچھے دوڑا۔ ہاتھ بڑھا کر چھوا تو…… ارے یہ تو برف کا گولہ ہے! بادل کا ٹکڑا اس کے ہاتھ میں آ گیا۔ اس نے چکھا تو میٹھا برف کا گولہ تھا، وہ مزے سے چوستا ہوا عورت کی طرف پلٹا۔

''ایسے برف کے گولے ہماری گلی میں ایک آدمی آ کر بیچتا ہے، مگر ان کو کھا کر بعد میں منہ کڑوا ہو جاتا ہے۔ یہ زیادہ مزیدار ہے۔''

''آؤ نہر کی طرف چلیں۔'' عورت گڈو کا ہاتھ پکڑ کر دوڑنے لگی۔ اتنی بڑی عورت کو دوڑتا دیکھ کر گڈو اور تیز دوڑنے لگا۔

''میں جیت گیا۔'' اس نے عورت سے پہلے نہر کنارے پہنچ کر دونوں ہاتھ اٹھا کر کہا۔ نہر میں اور بچے بھی نہا رہے تھے۔ بس کمر تک پانی تھا۔ گڈو نے فوراً چھلانگ لگا دی……

''آہا! ٹھنڈا ٹھنڈا پانی۔ ٹھنڈا ٹھنڈا پانی!'' وہ خوشی سے چیخا۔

وہ مچھلی کی طرح اِدھر سے اُدھر تیرنے لگا۔ کبھی غوطہ لگاتا، کبھی چھینٹے اُڑاتا۔

''اب آ جاؤ…… گھوڑا گاڑی تمھیں لینے آ گئی۔''

گڈو نے گھبرا کر دیکھا، تو گھوڑا گاڑی نہر کنارے کھڑی تھی۔

''میں نہیں جاؤں گا'' گڈو نے خوفزدہ آواز میں کہا اور تیز تیز ہاتھ پیر مارتا دور نکل گیا۔

''گھر نہیں جاؤ گے؟''

''نہیں جاؤں گا'' وہ ٹھنک کر بولا۔

عورت ہنس پڑی بولی ''اچھا نہ جاؤ، مگر باہر تو نکلو۔''

''نہیں پہلے گھوڑا گاڑی کو واپس بھیجو۔''

عورت نے اشارہ کیا، گھوڑا گاڑی وہاں سے چل کر دور درختوں کے جھنڈ میں غائب ہو گئی۔

عورت نے اسے نہر سے باہر نکالا۔ ''تم بہت تھک گئے ہو۔ آؤ سلا دوں۔''

وہ اسے لیے ایک گھنیرے درخت کی چھاؤں میں ٹھنڈی گھاس پر بیٹھ گئی۔ اس نے گڈو کا سر اپنے زانوں پر رکھ لیا اور ہولے ہولے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔ سکون کے بے پناہ احساس کے ساتھ گڈو کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ آہستہ آہستہ اس پر گہری نیند طاری ہو گئی۔

☆☆

گڈو کے باپ نے جب اسے گرد آلود فرش سے اٹھایا، تو اس کے مٹی سے اٹے رخساروں پر آنسوؤں سے دو سفید لکیریں کھینچ گئی تھیں۔

''سو گیا ہے؟'' اس نے اسے چارپائی پر ماں کے پہلو میں لٹاتے ہوئے کہا۔

ماں اسے زور زور سے جھنجوڑنے لگی ''یہ تو…… یہ تو……'' وہ چیخی اور دہشت زدہ نظروں سے شوہر کو دیکھنے لگی۔ باپ نے جلدی سے سائیکل اٹھائی اور اس سال پڑنے والی شدید گرمی کے خلاف بکتا جھکتا حکیم جی کی دکان کی طرف تیز تیز پیڈل مارنے لگا۔

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

بدیسی ادب

خیال جب عمل میں ڈھل گیا

روحوں کی دعوت

تصورات کی پُراسرار ولامحدود دنیا سے ایک انہونے واقعے کی سوغات

البیلے روسی کہانی کار کے جادوئی قلم سے

الیگزنڈر پشکن

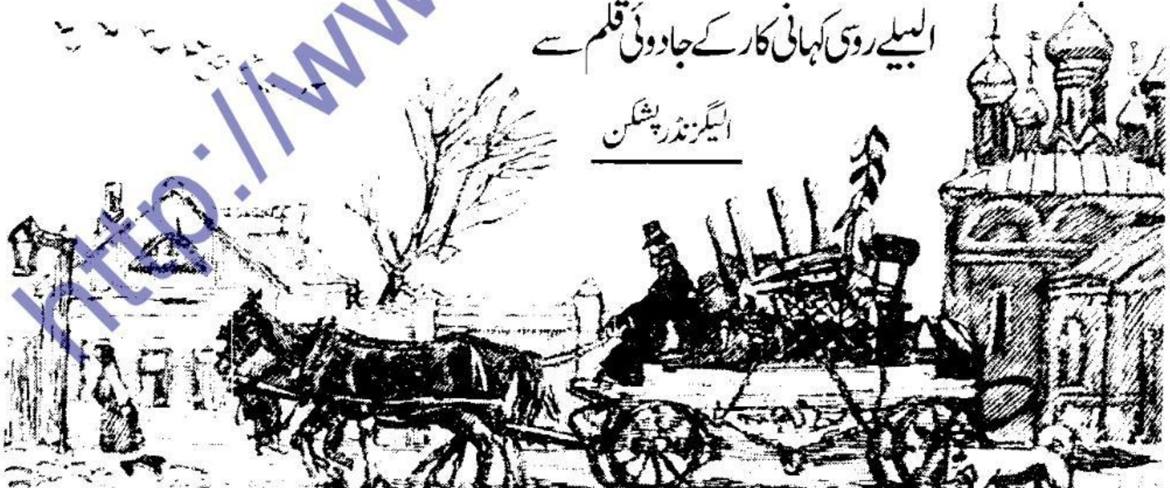

http://www.bookstube.net
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

آدریان

پروخوروف کے گھر کا سارا ساز وسامان جنازہ لے جانے والی گاڑی پر لد چکا تھا۔ مریل گھوڑے چوتھی دفعہ بسمانیا سے نکتسکایا سڑک کی طرف چلے جہاں اس نے نیا مکان خریدا تھا۔ تابوت ساز نے دکان مقفل کر باہر دروازہ پر اس اعلان کی تختی لٹکا دی کہ گھر کرایہ یا فروخت کے لیے خالی ہے اور خود پیدل اپنے نئے گھر کی طرف چل پڑا۔

نئے مکان کی اسے مدت سے آرزو تھی اور اس نے بھاری رقم ادا کر کے خریدا تھا۔ مگر جب وہ نئے گھر کی پیلی دیواروں کے قریب پہنچا، تو اسے یہ محسوس کر کے بہت تعجب ہوا کہ اس کے دل میں ذرا خوشی نہ تھی۔ نئے گھر کی اجنبی دہلیز سے گزر کر اس نے دیکھا، سارا سامان ابھی تک گڈمڈ پڑا ہے۔ اس وقت اسے اپنا پرانا ٹوٹا پھوٹا مکان یاد آیا جہاں وہ اٹھارہ سال تک رہا تھا، جہاں ہر چیز قرینے سے لگی رہتی تھی۔

اس نے اپنی نوکرانی اور دونوں لڑکیوں کو سستی پر ڈانٹ پلائی اور خود گھر کی درستی میں ان کی مدد کرنے لگا۔ تھوڑی دیر میں ہر چیز قاعدے سے رکھ دی گئی۔ مقدس تصویریں، چینی کے برتنوں کی الماری، میز، صوفہ اور پلنگ پچھلے کمرے میں ترتیب سے لگ گئے۔ آدریان پروخوروف کے کام کا سامان یعنی مختلف قسم، رنگوں اور پیمائش کے تابوت، ماتمی لباس، ماتمی عبائیں اور دستاریں اور مشعلوں سے بھری ہوئی الماریاں باورچی خانے اور دالان میں رکھ دی گئیں۔ باہر دروازے پر تختی لٹکا دی گئی جس پر لکھا تھا ''سادہ اور رنگین تابوت یہاں بنائے جاتے ہیں۔ نیز کرایہ پر ہر وقت مہیا کیے جا سکتے ہیں۔ پرانے تابوتوں کی مرمت کا بھی انتظام ہے۔'' کام ختم ہوا، تو اس کی بیٹیاں اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ نئے گھر کا معائنہ کرنے کے بعد وہ کھڑکی کے پاس بیٹھا اور سماوار گرم کرنے کا حکم دیا۔

شیکسپیئر اور سر والٹر اسکاٹ نے اپنی تصانیف میں گورکنوں کو بڑا خوش طبع اور زندہ دل دکھایا ہے۔ مگر ہمیں سچائی زیادہ عزیز ہے، اس لیے ہم ان کی تقلید نہیں کر سکتے۔ ہمارے تابوت ساز کی طبیعت اپنے منحوس پیشے کے بالکل مناسب تھی۔ آدریان پروخوروف بہت خاموش اور افسردہ مزاج آدمی تھا۔ اس کی خاموشی صرف دو دفعہ پر ٹوٹتی: ایک جب اسے اپنی بیٹیاں کھڑکی میں سے تاک جھانک کرتی نظر آتیں، تو انھیں ڈانٹنے پھٹکارنے کو اس کی زبان کھل جاتی۔ دوسرے جب اسے کسی بدنصیب (یا خوش نصیب) گاہک سے اپنی محنت کی زیادہ سے زیادہ اجرت وصول کرنی ہوتی۔

اس وقت بھی حسب معمول آدریان گم سم کھڑکی کے قریب بیٹھا اور چائے کی ساتویں پیالی پیتا اپنے افسردہ خیالات میں کھویا ہوا تھا۔ اسے وہ موسلادھار بارش یاد آئی جو پچھلے ہفتے ریٹائرڈ بریگیڈیئر کا جنازہ عین قبرستان پہنچتے ہی ہوئی تھی۔ پانی پڑنے سے کئی عبائیں سکڑ گئیں، ٹوپیوں کے پٹے تڑمڑ ہو گئے۔ اس کے ہاں سامان خاصا پرانا اور خستہ حالت میں تھا۔ اسے ڈر تھا کہ اب چیزیں ٹھیک کرانے میں کافی روپیہ خرچ ہو گا۔

اس نے سوچا، یہ نقصان سوداگر کی بوڑھی بیوہ تریوخینا کی تجہیز و تکفین سے پورا ہو جائے گا۔ وہ پچھلے سال سے گور میں پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی۔ مگر مشکل یہ تھی کہ وہ محلہ رازگلیائی میں رہتی تھی جو وہاں سے کافی دور تھا۔ پروخوروف کو ڈر تھا کہ اس کے وارث وعدہ کرنے کے باوجود وقت پر اسے بھول جائیں گے۔ وہ کسی قریبی

http://www.bookstube.net

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

صاحب افسانہ

روسی ادب کے بانیوں میں شامل الیگزینڈر پشکن ۶ر جون ۱۷۹۹ء کو ماسکو میں پیدا ہوئے۔ تعلق معزز خاندان سے تھا۔ آپ کی والدہ کے اجداد اریٹیریا سے بطور غلام روس لائے گئے تھے۔ آپ نے نوجوانی میں شاعری کی، نیز ڈرامے اور کہانیاں بھی لکھیں۔ روس میں بہ حیثیت عظیم ترین روسی شاعر جانے جاتے ہیں۔ ڈوئل (مقابلہ) لڑتے ہوئے ۱۰ر فروری ۱۸۳۷ء کو ہلاک ہو گئے۔ محض ۳۷ سال عمر پائی مگر دنیا والوں کو کئی بیش قیمت ادبی تخلیقات دے گئے۔

تابوت ساز سے معاملہ طے کر سکتے تھے۔

وہ اپنی سوچ میں گم تھا کہ دروازے پر کسی نے تین بار کمزور دستک دی۔ ''کون ہے؟'' آدریان نے چلا کر پوچھا۔

دروازہ کھلا اور ایک آدمی جو جرمن کاریگر معلوم ہوتا تھا، کمرے میں داخل ہوا اور بشاش لہجے میں آدریان سے کہنے لگا ''معاف کرنا ہمسائے'' اس نے ٹوٹی پھوٹی روسی میں کہا۔ ''اگر میری وجہ سے تمھارے کام میں ہرج ہوا تو معاف کرنا، مگر میں کئی دن سے تم سے ملنا چاہ رہا تھا۔ میں ایک موچی ہوں۔ میرا نام گوٹلب شلٹز ہے۔ تمھاری کھڑکی میں سے جو چھوٹا سا گھر نظر آتا ہے نا، میں اسی میں رہتا ہوں۔ کل میری شادی کی پچیسویں سالگرہ ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اور تمھاری لڑکیاں آ کر ہمارے ہاں کھانا کھائیں۔''

یہ دعوت خوش دلی سے قبول کر لی گئی۔ آدریان نے موچی کو بیٹھنے اور چائے پینے کا کہا۔ کچھ ہی دیر میں گوٹلب شلٹز کی سادہ اور پرخلوص طبیعت کی وجہ سے دونوں گھل مل کر باتیں کرنے لگے۔ آدریان نے پوچھا ''سناؤ تمھارے کاروبار کا کیا حال ہے؟''

''شکر ہے، چل رہا ہے۔'' شلٹز نے جواب دیا ''اونچ نیچ تو ہمارے ہاں بھی ہوتی ہے مگر اس کی شکایت کیا؟ میرا کام تمھاری طرح کا نہیں کیونکہ زندہ آدمی بغیر جوتوں کے گزارہ کر سکتا ہے مگر مردہ بغیر تابوت کے نہیں رہ سکتا۔''

''بالکل ٹھیک، بالکل ٹھیک۔'' آدریان نے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ ''مگر ساتھ ساتھ یہ بھی تو ہے کہ زندہ آدمی کے پاس جوتے خریدنے کو دام نہ ہوں، تو وہ ننگے پاؤں پھر لے گا۔ مگر مردہ بھک منگوں کو مفت تابوت دینا پڑتا ہے۔''

کچھ دیر یوں ہی بات چیت چلتی رہی۔ آخر موچی اٹھا اور جانے کی اجازت چاہی۔ چلتے چلتے ایک دفعہ پھر اپنے ہاں آنے کی یاد دہانی کرائی۔ اگلے دن دوپہر کے وقت آدریان اور اس کی بیٹیاں نئے مکان سے نکل کر پڑوسی کے گھر جانے کو روانہ ہوئیں۔ دونوں لڑکیاں زرد رنگ کی ٹوپیاں اور سرخ سلیپر پہنے ہوئے تھیں جو وہ خاص خاص مواقع پر پہنتیں۔

موچی کا ننھا سا کمرا مہمانوں سے کھچا کھچ بھرا تھا۔ ان میں زیادہ تر جرمن اہل ہنر، ان کی بیویاں اور شاگرد شامل تھے۔ صرف ایک روسی افسر تھا، پولیس کانسٹیبل یورکو۔ آدریان اس سے ملنے بڑھا، کیونکہ وہ جانتا تھا، جلد یا بدیر اسے کانسٹیبل کی مدد درکار ہوگی۔

جب مہمان میز پر بیٹھے، تو دونوں ایک دوسرے

http://www.bookstube.net

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

کے قریب تھے۔

شلتز، اس کی بیوی اور سترہ سالہ لڑکی لوٹ خین مہمانوں کے ساتھ شریک طعام تھے اور کھانا پیش کرنے میں نوکروں کی مدد بھی کر رہے تھے۔ یورکو نے چار آدمیوں کے برابر کھایا۔ آدریان بھی کچھ پیچھے نہ تھا، مگر اس کی بیٹیاں بڑے تکلف سے کھا رہی تھیں۔ گفتگو زیادہ تر جرمن زبان میں ہوئی۔ آوازیں بلند سے بلند ہوتی جا رہی تھیں کہ اتنے میں میزبان نے سب کو اپنی طرف متوجہ کر کے ایک بوتل کھولی اور پھر بہ آواز بلند روسی میں کہا "میری نیک شریک زندگی لوئیزا کا جام صحت!" ہلکے رنگ کا مشروب بوتل میں سے ابلنے لگا۔ مہمان خوشی خوشی نیک لوئیزا کا جام صحت پینے لگے۔

میزبان نے پھر دوسری بوتل کا کارک اڑاتے ہوئے کہا "اور یہ ہے میرے عزیز مہمانوں کا جام صحت!" مہمانوں نے شکریہ ادا کر کے گلاس پھر خالی کر دیے۔ اب کیا تھا، پے در پے جام صحت پیے جانے لگے۔ پہلے ہر مہمان کا جام صحت پیا گیا، پھر ماسکو شہر، پھر جرمنی کے چھوٹے چھوٹے درجن بھر غیر معروف شہروں، پھر ہر قسم کے کاروبار، پھر ہر کاریگر اور اس کے شاگرد کا۔ آدریان نے نہایت ایمانداری سے ہر دفعہ گلاس خالی کیا۔ آخر میں وہ نشے میں اتنا دھت ہو چکا تھا کہ ترنگ میں آ کر اپنا بھی ایک جام صحت تجویز کیا جو سب نے خوشی خوشی پیا۔

اتنے میں ایک مہمان نان بائی نے اپنا گلاس اٹھا کر پرجوش لہجے میں کہا "ان کا جام صحت جن کے لیے ہم کام کرتے ہیں یعنی ہمارے گاہکوں کے لیے!" یہ جام بھی اوروں کی طرح متفق طور پر جوش و خروش کے ساتھ پیا گیا۔

اب مہمانوں نے ایک دوسرے سے معانقہ شروع کیا۔ درزی نے موچی، موچی نے درزی، نان بائی نے ان دونوں سے، پھر سب لوگوں نے نان بائی اور یہ سلسلہ اس طرح چلتا رہا...... ان باہمی معانقوں کے دوران یورکو نے تابوت ساز سے کہا "پڑوسی! تم اپنے مردوں کا جام صحت پیو نا؟"

اس بات پر سب ہنس پڑے سوائے تابوت ساز کے جس نے غصے سے بھوئیں سکیڑ لیں۔ مگر سب پینے پلانے میں اتنے مشغول تھے کہ کسی نے اس کی طرف توجہ نہ دی۔ جب سب رخصت ہونے کے لیے اٹھے تو گرجا سے شام کے گھنٹوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔

مہمانوں کے رخصت ہوتے ہوتے کافی دیر ہو گئی۔ سب نشے میں دھت تھے۔ موٹے نان بائی اور ایک جلد ساز نے جس کا چہرہ سرخ چمڑے میں مجلّد معلوم ہوتا تھا، کانسٹیبل کو بغلوں میں ہاتھ دے کر اس کے ٹھکانے تک پہنچایا۔ یوں روسی کہاوت کہ "قرض کی ادائیگی نعمت ہے" پوری کر دکھائی۔

تابوت ساز گھر پہنچا، تو ناراض اور جھنجھلایا ہوا تھا۔ "آخر یہ کیا بات ہے؟" اس نے بہ آواز بلند سوچتے ہوئے کہا "کیا اور سب پیشے تو قابل عزت ہیں، میرا پیشہ کس بات میں گھٹیا ہے؟ کیا تابوت ساز جلاد کا بھائی بند ہوتا ہے؟ آخر یہ غیر ملکی احمق جرمن کس بات پر ہنس رہے تھے؟ کیا ان کے خیال میں تابوت ساز احمق یا مسخرہ ہے؟ اور میں...... میں سوچ رہا تھا کہ اپنے نئے گھر کی خوشی میں ہونے والی دعوت میں سب کو بلاؤں گا، مگر اب؟ اب نہیں...... بس اب تو میں ان لوگوں کو بلاؤں گا جن کی میں خدمت کرتا ہوں یعنی لاشوں کو۔"

"جناب! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" اس کی نوکرانی نے اس کے جوتے اتارتے ہوئے کانپ کر کہا۔ "ذرا

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

آپ سوچیے تو...... خدا کے لیے اپنے پر صلیب کا نشان بنائیے۔ آپ مردوں کو اپنے گھر دعوت پر بلائیں گے؟ اف خدایا میری توبہ!''

''ہاں تو کیا ہوا؟ خدا گواہ میں ایسا ہی کروں گا۔'' آدریان نے کہا ''اور کل ہی بلاؤں گا! اے میرے محسنوں کی روحو! کل رات کا کھانا میرے ساتھ کھاؤ اور جو کچھ روکھا سوکھا میرے پاس ہے، اس میں شریک ہو کر میری عزت بڑھاؤ۔'' یہ کہہ کر تابوت ساز اپنے پلنگ پر لیٹ گیا۔ جلد ہی وہ خراٹے لینے لگا۔

☆☆

صبح کا اندھیرا پوری طرح غائب نہ ہوا تھا کہ آدریان کو اٹھنا پڑا۔ تاجر کی مالدار بیوہ تریوخینا رات کو چل بسی تھی۔ ایک آدمی گھوڑے پر سوار یہ خبر آدریان کو پہنچانے آیا۔ تابوت ساز نے اسے دس کوپک انعام میں دیے اور خود عجلت میں کپڑے تبدیل کر کے گھوڑا گاڑی میں سوار راز گلیائی پہنچا۔ گھر کے دروازے پر پولیس کا پہرہ تھا۔ تاجر گدھوں کی طرح منڈلاتے ہوئے ادھر اُدھر پھر رہے تھے۔ میت میز پر رکھی تھی۔ بے جان موئی چہرے کے نقش و نگار ابھی تک بگڑے نہ تھے۔ رشتے دار، پڑوسی اور نوکر چاکر چاروں طرف سے اسے گھیرے ہوئے تھے۔ ساری کھڑکیاں کھلی تھیں۔ اندر موئی شمعیں جل رہی تھیں اور پادری دعائے میت پڑھ رہے تھے۔

آدریان متوفیہ کے بھتیجے کے پاس گیا جو نہایت فیشن ایبل کوٹ میں ملبوس ایک نوجوان تاجر تھا۔ آدریان نے جا کر کہا کہ تابوت، شمعیں، تابوت برادر اور جنازے کے ساتھ دیگر ضرور اشیا جلد اچھی حالت میں مہیا کر دی جائیں گی۔ وارث نے بے خیالی کے ساتھ شکریہ ادا کیا اور کہا کہ وہ مول تول کرنا نہیں چاہتا اور ہر بات اس کے

بیٹیاں پھول ہیں

بیٹیاں پھول ہیں
آنگن میں مہکتے ہوئے پھول
مسکراتی ہیں
تو کیاری کی ہر اک شاخِ نہال
جھوم اٹھتی ہے
بولتی ہیں، تو پرندے آ کر
محویت سے انھیں تکتے ہیں
چلتی ہیں، تو اسی انداز دلآویز کے ساتھ
تتلیاں اڑتی چلی آتی ہیں
ہنستی ہیں، تو ہری شاخوں پہ نجی
کونپلیں بند قبا کھولتی ہیں

☆☆

یک بہ یک دستکیں دیتا ہے حنا کا موسم
گھر کے ماحول پہ جنت کا گماں ہوتا ہے
روح کے سوئے ہوئے تار ہلاتا ہے کوئی
طربیہ ساز بجاتا ہے کوئی
اجنبی دیس سے آتا ہے کوئی
بیٹیاں اذنِ سفر مانگتی ہیں
اپنا سامانِ سفر باندھتی ہیں
جانبِ منزل نادیدہ چلی جاتی ہیں
پیکرِ مہر و محبت میں ڈھلی جاتی ہیں

☆☆

کنجِ تنہائی میں در آتی ہے اک شامِ فراق
یادِ ایام کے میلے میں ہیں گم
عمرِ آئندہ کے بوڑھے لمحے
صحن میں رنگِ حنا باقی ہے
گئے لمحوں کی صدا باقی ہے
نوکِ لب حرفِ دعا باقی ہے

(محمد انیس انصاری، جھنگ)

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

ایمان پر چھوڑتا ہے۔

تابوت ساز نے حسب عادت قسم کھا کر کہا کہ وہ ایک کوپک زیادہ لینا بھی حرام سمجھتا ہے۔ اس نے پھر مختار خاص سے نظروں ہی نظروں میں کچھ طے کیا اور اپنے گھر آ کر تیاری میں مشغول ہو گیا۔ سارے دن وہ نکلتسکی دروازے سے راز گلیائی تک پھیرے کرتا رہا۔ شام تک ہر چیز قاعدے کے مطابق وہاں پہنچ گئی۔ وہ کوچوان کو چھٹی دے کر اپنے گھر پیدل روانہ ہوا۔ چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ تابوت ساز بخیریت نکلتسکی دروازے تک پہنچ گیا۔ جب وہ گرجا کے پاس سے گزرا، تو یورکو نے ڈپٹ کر پوچھا ''کون ہے؟'' پھر تابوت ساز کو پہچان کر اسے شب بخیر کہا۔

رات زیادہ گزر چکی تھی۔ آدریان گھر کے قریب پہنچا، تو اسے ایسا لگا، کوئی چپکے سے اس کے دروازے میں غائب ہو گیا۔ ''اس کا کیا مطلب؟'' آدریان سخت حیران تھا۔ ''اس وقت کس کو میری ضرورت ہو سکتی ہے؟ کیا خبر کوئی چور ڈاکو ہو؟ یا کہیں ایسا تو نہیں کہ کوئی میری احمق لڑکیوں کے پاس آیا ہو؟'' اسے فوراً اپنے دوست یورکو کو مدد کے لیے بلانے کا خیال آیا۔ اتنے میں ایک اور آدمی دروازے کے قریب پہنچا۔ وہ اندر داخل ہونے ہی والا تھا کہ اس کی نظر آدریان پر پڑی جو تیزی سے گھر کی طرف آ رہا تھا۔ وہ ٹھہر گیا اور اپنی وردی کی ٹوپی سلام کے طور پر اٹھائی۔ آدریان کو اس کا چہرہ کچھ دیکھا بھالا معلوم ہوا۔ ''آپ کو کیا مجھ سے ملنا ہے؟'' اس نے تقریباً ہانپتے ہوئے سوال کیا۔ ''اندر تشریف لے آئیے۔''

''تکلف کی ضرورت نہیں صاحب'' اجنبی نے کھوکھلی آواز میں جواب دیا۔ ''آپ پہلے تشریف لے چلیے اور اپنے مہمانوں کو راستہ دکھائیے۔''

آدریان کو گھر پہنچنے کی اتنی جلدی تھی کہ اسے خود ہی تکلف گوارا نہ تھا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا، وہ گھر کی سیڑھیوں تک پہنچ گیا اور اس کے پیچھے پیچھے دوسرا بھی...... آدریان کو لگا کہ گھر میں کچھ لوگ ادھر ادھر چل پھر رہے ہیں۔ ''لعنت خدا کی، آخر بات کیا ہے؟'' اس نے تیزی سے اندر داخل ہوتے ہی سوچا اور...... اس کے گھٹنے جواب دے گئے جب اس نے دیکھا کہ سارا کمرا لاشوں سے بھرا ہوا تھا۔

کھلی کھڑکی میں سے چاندنی ان کے سرد اور نیلگوں چہروں، دھنسے ہوئے دہانوں، دھندلی نیم وا آنکھوں، اور ستی ہوئی ناکوں پر پڑ رہی تھی۔ آدریان نے خوف زدہ نگاہوں سے ان لوگوں کو پہچانا جن کے کفن دفن میں اس نے مدد کی تھی۔ پیچھے آنے والا وہی فوجی افسر تھا جو پچھلے ہفتے موسلا دھار بارش میں دفن ہوا تھا۔ سب مرد اور عورتیں اس کے چاروں طرف جمع ہو گئے اور اسے سلام اور مبارک باد پیش کرنے لگے۔ سوائے ایک غریب کے جو چند ہی دن ہوئے مفت دفنایا گیا تھا۔ اسے قریب آنے کی جرأت نہ ہوئی، وہ کمرے کے کونے میں ایسی عاجزی سے کھڑا تھا جیسے اسے اپنے چیتھڑوں پر شرم آ رہی ہو۔

غریب کے سوا سبھی ڈھنگ کے لباس پہنے ہوئے تھے۔ خواتین ربن والی ٹوپیاں اوڑھے تھیں۔ فوجی افسر اپنی کرم خوردہ وردی میں تھے۔ سب کی حجامتیں بڑھی ہوئی تھیں۔ تاجر نہایت بڑھیا لباس میں ملبوس تھے۔ فوجی افسر نے سب کی نمائندگی کرتے ہوئے کہا ''پروخوروف! ہم سب لوگ تمھارے بلاوے پر اٹھ کر آئے ہیں۔ صرف وہ جو بالکل خاک در خاک ہو چکے یا محض ہڈیوں کا ڈھانچہ

http://www.bookstube.net

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

تھے اور اٹھنے سے معذور ہیں، نہیں آ سکے۔ مگر ان میں سے بھی ایک آنے کا اتنا خواہش مند تھا کہ نہ رک سکا......"

اس دوران ایک چھوٹا سا ڈھانچہ مجمع میں گھس کر راہ بناتا ہوا آدریان کی طرف آیا۔ اس کے بے رونق چہرے پر محبت بھری خوفناک مسکراہٹ طاری تھی۔ شوخ سبز اور سرخ رنگ کے کپڑے کی دھجیاں اس کے چاروں طرف اس طرح لٹک رہی تھیں جیسے وہ کوئی کھمبا ہو..... ٹانگوں کی ہڈیاں اس طرح کھڑکھڑا رہی تھیں جیسے ہاون میں موسلی۔

"ارے پروخوروف! کیا تم مجھے نہیں پہچانتے؟" ڈھانچے نے کہا۔

"کیا تم ریٹائرڈ سارجنٹ پیوتر پتروِوچ کریل کن کو بھول گئے جس کے لیے تم نے پہلا تابوت بیچا تھا (جو تھا تو صنوبر کی لکڑی کا مگر تم نے بلوط کا کہہ کر دیا) ۱۸۹۹ء میں......" ان الفاظ کے ساتھ ڈھانچے نے اپنے بازو بغل گیر ہونے کے لیے بڑھائے۔

آدریان نے پوری طاقت سے چیخ ماری اور اسے دھکا دے کر پرے کر دیا۔ پیوتر پتروِوچ جھوما اور ہڈیوں کا ڈھیر بن کر زمین پر آ رہا۔ لاشوں میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی۔ سب اپنے ساتھی کی ہتک کا بدلہ لینے، کوسنے اور دھمکیاں دیتے آدریان کی طرف بڑھے۔ بدقسمت میزبان ان کی چیخوں سے تقریباً بہرا اور ان کے حملے سے اتنا بدحواس ہوا کہ بے ہوش ہو کر مرحوم سارجنٹ کی ہڈیوں کے ڈھیر پر گر پڑا۔

☆☆

سورج کی شعاعیں تابوت ساز کے پلنگ پر پڑ رہی تھیں۔ گرمی سے گھبرا کر اس نے آنکھیں کھولیں، تو خادمہ کو سماوار میں انگارے سلگانے میں مصروف پایا۔ آدریان کو گزشتہ رات کے خوفناک واقعات یاد آئے..... تریوخینا، فوجی افسر اور سارجنٹ کریل کن ابھی تک اس کے تخیل میں دھندلے دھندلے سایوں کی طرح منڈلا رہے تھے۔ پہلے تو چپ چاپ انتظار کرتا رہا کہ شاید ملازمہ خود ہی بات چھیڑے اور رات والے واقعہ کا انجام بتائے۔

"آدریان پروخوروِچ جناب، آج آپ بہت دیر تک سوتے رہے۔" اکسینیا نے اسے لباس دیتے ہوئے کہا۔ "ہمارا پڑوسی درزی آپ سے ملنے آیا تھا اور پولیس کانسٹیبل یہ بتانے کہ آج پولیس انسپکٹر کی سالگرہ ہے۔ مگر آپ تو ایسے بے خبر سو رہے تھے کہ میرا جی نہ چاہا، آپ کی نیند خراب کریں۔"

"مرحومہ تریوخینا کے ہاں سے تو کوئی نہیں آیا؟"

"مرحومہ؟ یعنی کیا..... کیا وہ مر گئیں؟"

"تم بھی کتنی احمق ہو۔ کیا کل تم نے ان کے کفن دفن کا سامان تیار کرنے میں میرا ہاتھ نہیں بٹایا تھا؟"

"آپ کا دماغ درست ہے جناب؟ یا ابھی تک رات کے نشے کا خمار باقی ہے؟ کل کس کا کفن دفن ہوا تھا؟ سارے دن تو آپ جرمن کے ہاں دعوت میں رہے۔ رات کو بالکل مدہوش واپس آئے۔ آتے ہی ایسے بے سدھ پلنگ پر پڑ گئے کہ اب جاگے ہیں..... گرجا کے گھنٹے بھی بج بج کر خاموش ہو گئے۔"

"اچھا؟ سچ مچ؟" تابوت ساز نے اطمینان کی سانس لے کر کہا۔

"سچ مچ نہیں تو کیا؟" ملازمہ نے جواب دیا۔

"اگر ایسا ہے تو لاؤ چائے جلدی سے، اور میری بیٹیوں کو بھی بلا لاؤ۔"

◆●●

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

پیر سائیں کے ببول کی

چھال کا کرشمہ

توہمات میں گھری بڑھیا کی کہانی، اللہ تعالیٰ کے فضل سے وہ تاریکی سے روشنی میں آ گئی

نجم عباسی / غلام مصطفیٰ سولنگی

سندھی افسانہ

میں گاؤں کے قریب پہنچ گیا تھا۔ سورج مغرب میں ڈبکی لگانے کی تیاری کر رہا تھا۔ آج اسکول سے گھر واپس آنے میں خاصی دیر ہو گئی تھی۔ عام طور پر میں تو چار پانچ بجے گھر پہنچ جاتا ہوں، لیکن آج ہیڈ ماسٹر نے اسمبلی میں اعلان کیا کہ اسکول میں صفائی کا دن منایا جائے گا، لہٰذا سب بچے چھٹی کے بعد اسکول میں ہی رک جائیں۔ اسکول کو صاف ستھرا کر کے پھر وہ اپنے گھروں کو جائیں گے۔

آدھا دن پڑھائی اور آدھا دن اسکول کی صفائی میں گزار کر جب میں اسکول سے نکلا تو بہت تھکن محسوس ہو رہی تھی۔ دھول مٹی سے پورا جسم اٹا ہوا تھا۔ بستہ اٹھائے تیز تیز قدموں سے چلنے لگا تاکہ

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

قارئین کے لیے نئے سال کا تحفہ

اپنے بچوں، دوستوں اور رشتہ داروں کو ادب سے روشناس کرائیے، آپ گزشتہ شمارے اپنے دوستوں کو تحفتاً بھی بھجوا سکتے ہیں، یہ سہولت اندرون و بیرون ملک دونوں کے لیے میسر ہے۔

کامیاب افراد کے حالات زندگی، ملک کی نامور شخصیات کے دلچسپ و خصوصی انٹرویز، سماجی، سیاسی، معاشی و معاشرتی کہانیاں، حالات حاضرہ اور سیاست کے بدلتے رنگ، معاشرتی مسائل اور ان کا حل، شکاریات، اسلامی واقعات، سائنس، طب و صحت، ٹیکنالوجی، کھیل، سیرت نبویؐ، اُردو ادب، افسانے، ڈرامے، تازہ ترین معلومات اور بہت کچھ.........

ایک شمارہ

روپے میں

ڈاک خرچ یا کوریئر چارجز اس کے علاوہ ہوں گے

شمارے حاصل کرنے کے لیے اپنا ایڈریس اور موبائل نمبر میسج کریں

subscription@urdu-digest.com

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

مغرب سے پہلے گھر پہنچ جاؤں۔ اچانک یاد آیا کہ بوڑھی اماں نے ایک چیز لانے کو کہا تھا۔ لیکن تھکن کی وجہ سے آج بھی مجھے یاد نہیں رہا تھا۔ بے حد افسوس ہوا۔ زیادہ افسوس اس بات کا بھی ہوا کہ اگر آج میں وہ چیز لاتا تو ان کی طرف سے مجھے کچھ پیسے مل جاتے۔

بوڑھی اماں کو پچھلے دو ڈھائی ہفتوں سے بخار آ رہا تھا۔ گاؤں کے حکیم سے دو چار مرتبہ دوائی لی تھی، لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ کل صبح جب میں اسکول کے لیے تیار ہو رہا تھا تو وہ ہمارے گھر آئی اور مجھے کہا ''بیٹا! میرے لیے پیر سائیں والے ببول کے درخت کی چھال لانا۔ حکیم صاحب کی دوائیوں نے تو کوئی فائدہ نہیں دکھایا۔ اب پیر سائیں کے ببول کی چھال بخار کو بھگائے گی۔''

بوڑھی اماں شدید بخار کے باعث سوکھ کر کانٹا ہوئی تھی۔ چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا اور آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں۔ بولتے ہوئے وہ بری طرح ہانپ رہی تھی۔ میں نے اس سے وعدہ کیا کہ ببول کی چھال ضرور لاؤں گا۔ لیکن اسکول سے چھٹی کے بعد مجھے یاد ہی نہیں رہا۔

آج صبح پھر وہ لاٹھی ٹیکے ہماری طرف آ گئی اور بہت منت سماجت کی کہ چھال ضرور لانا۔ ساتھ ہی یہ لالچ بھی دی کہ اگر چھال لاؤ گے تو تمھیں پانچ روپے دوں گی۔ ایک روپیہ تو جیب سے نکال کر اسی وقت پیشگی دے دیا۔ وہ بخار سے بے حال ہو چکی تھی۔ چاہتی تھی کہ پیر سائیں کے ببول کی چھال اپنے بازو سے باندھ کر جلد از جلد بخار سے چھٹکارا پالے۔

ہمارے گاؤں کے اکثر لوگ پیر سائیں کے ببول کی چھال بہ کثرت استعمال کرتے تھے۔ چھال کو ہر مرض کا شافی علاج سمجھا جاتا۔ جب کوئی دوائی اثر نہ کرتی، تو لوگ اس چھال کو لال کپڑے کے ٹکڑے میں لپیٹ کر بازو سے باندھ لیتے۔ کچھ لوگ تو حکیم صاحب تک جانے کی زحمت بھی گوارا نہ کرتے اور یہ چھال باندھ دیتے۔

اس چھال کی شفا پورے علاقے میں مشہور تھی۔ کہتے تھے کہ کئی لا علاج مریض بھی اس چھال کی کرامت سے صحت یاب ہو چکے۔ لوگوں کا اس چھال پہ بڑا پختہ یقین تھا۔ بڑے بوڑھے بتاتے ہیں کہ ایک مرتبہ بڑا پہنچا ہوا پیر سائیں اس ببول کے نیچے ٹھہرا۔ کئی بیمار لوگ پیر سائیں کا سن کر وہاں آ گئے۔ پیر سائیں نے ببول کی چھال توڑ کر ان کو دی جس سے وہ شفا یاب ہو گئے۔ نہ صرف یہ بلکہ پیر سائیں نے جب ایک اندھے کی آنکھوں پر چھال پھیری تو اس کی بینائی واپس آ گئی۔

پیر سائیں تو کچھ دنوں بعد چلا گیا۔ لیکن اس ببول کے درخت کو بڑا شرف حاصل ہو گیا۔ لوگوں نے ببول کے چاروں اطراف دوسرے درختوں کی شاخیں کاٹ کر ایک باڑ لگا دی۔ کئی عقیدت مند روزانہ صبح کو درخت کے نیچے جھاڑو دے کر مٹی کو چمکا دیتے۔ بعد ازاں لوگوں نے اپنی مرادیں پوری کرنے کی خاطر اس ببول کی شاخوں پر لال کپڑوں کے ٹکڑے باندھ دیے۔

پیر سائیں کا ببول میرے اسکول والے راستے پر تھا۔ چونکہ میں روزانہ اسی راستے سے اسکول جاتا تھا۔ لہٰذا اڑوس پڑوس کے بیمار لوگ اور دوسرے ضرورت مند مجھے ہی اس کی چھال لانے کو کہتے۔ میں جب چھال لاتا تو وہ خوش ہو کر مجھے کچھ پیسے دے دیا کرتے۔

آج دوسرے دن بھی میں بوڑھی اماں کے لیے چھال لانا بھول گیا۔ اب ان کو کیا منہ دکھاؤں گا؟ میرے انتظار میں تو ان کی آنکھیں بھی پتھرا گئی ہوں گی۔ چھال نہ پا کر وہ کتنا مایوس اور اداس ہو جائے گی۔ میں بھی انعام سے محروم رہ جاؤں گا۔ ببول کا درخت دو میل پیچھے رہ گیا تھا۔ تھکاوٹ سے میرا برا حال تھا۔ واپس جانا تو بہت مشکل لگ رہا تھا۔

میں ایک جگہ رک گیا۔ دماغ میں بوڑھی اماں کی منتیں گردش کرنے لگیں۔ اچانک میرے ذہن میں ایک خیال

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

ابھرا۔ یہ خیال آتے ہی میں نے اطمینان کا سانس لیا اور خود بخود مسکرانے لگا۔ پھر سوچنے لگا کہ اس طرح کی حرکت کرنا تو ٹھیک نہیں، یہ تو سراسر گناہ ہے۔ بے ایمانی ہے۔ عجیب کشمکش نے مجھے بری طرح گھیر لیا۔ میرے سامنے ببول کا ایک اور درخت موجود تھا۔ میں کچھ سوچ کر اس کی طرف لپکا اور چاروں اطراف منظر دوڑائی۔ مجھے دیکھنے والا کوئی بھی نہ تھا۔ میرا دل دھڑک رہا تھا۔ ببول سے چھال توڑتے وقت میرے ہاتھ بری طرح کانپ رہے تھے

☆☆

بوڑھی اماں ہمارے گھر بیٹھی شدت سے میرا انتظار کر رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر خوشی سے پھولے نہ سمائی اور بولی "بیٹا! آج میرے لیے پیر سائیں کے درخت کی چھال لائے ہونا......؟"

میں نے کچھ کہے بغیر بستے سے چھال نکال ان کی طرف بڑھا دی۔ بڑھیا نے چھال کو بڑے پیار اور عقیدت سے چوما۔ چار روپے نکال کر میرے ہتھیلی پر رکھے اور اور ڈھیر ساری دعائیں دیتی اپنے گھر کو چل دی۔ لیکن ان کی دعائیں بددعاؤں کے تیر بن کر مجھ پر برسنے لگیں۔ میں خوف و ہراس میں مبتلا ہو گیا۔

پیر سائیں والے ببول کے متعلق کئی روایات مشہور تھیں۔ کہتے تھے کہ جن لوگوں نے اس درخت کی کی بے حرمتی کی یا جانوروں کو کھلانے کے لیے شاخیں کاٹیں، وہ اندھے ہو گئے۔ فالج میں مبتلا ہوئے یا پھر کئی اور مصیبتوں میں پھنس گئے۔

میں ایک عام ببول کے درخت کی چھال کو پیر سائیں کے درخت والی بتا کر بہت پچھتایا۔ اب اس خوف سے کانپ رہا تھا کہ کوئی نہ کوئی مصیبت مجھ پر بھی نازل ہوگی۔ رات کو بہ مشکل تھوڑی سی نیند آئی۔ نیند میں ڈراؤنے خواب آتے رہے۔ دوسرے دن صبح کو اسکول جاتے ہوئے جب پیر سائیں والے درخت کے قریب پہنچا تو میں نے دوسرے راستہ پکڑ لیا۔ ڈر لگ رہا تھا کہ اگر اس درخت کے قریب سے گزرا تو کوئی نہ کوئی مصیبت مجھے گھیر لے گی۔

چار دن شدید پریشانی میں گزر گئے۔ مجھے یقین ہو چلا تھا کہ کوئی نہ کوئی مصیبت ایک دن ضرور مجھ پر نازل ہو گی۔ کئی اندیشے میرے ذہن میں کروٹیں لے رہے تھے۔ ایک یہ بھی تھا کہ میں امتحان میں ناکام ہو جاؤں گا۔ ویسے بھی پچھلے چار دن سے پڑھائی میں دل نہیں لگا تھا۔

ایک دن اسکول جاتے وقت لڑکھڑا کے گر گیا۔ "لو بھئی! آ گئی پیر سائیں کی طرف سے بھیجی ہوئی کوئی نہ کوئی مصیبت......اب تو جسم پر فالج گرنے ہی والا ہے۔" میاں کچھ دیر دم سادھے لیٹا رہا پھر ہمت کر کے اٹھا۔ دیکھا تو نیچے پتھر تھا۔ بے خیالی میں میرا پاؤں اس سے ٹکرا گیا تھا۔

اس دوران بوڑھی اماں بھی کہیں نظر نہ آئی۔ میں نے سوچا، شاید میری بے ایمانی نے اسے اور بھی بیمار کر دیا ہے۔ بالآخر پانچویں دن پکا ارادہ کر لیا کہ آج ہر صورت پیر سائیں والے ببول کی چھال توڑ کر اسے دے آؤں گا۔ اور اسے حقیقت بتا کر معافی بھی مانگوں گا۔

شام کو اسکول سے واپسی پر چھال توڑ سیدھا بوڑھی اماں کے گھر ہانپتا کانپتا پہنچا۔ وہ چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی۔ سخت بیمار تھی۔ میں نے بستے سے چھال نکال کر اس کی طرف بڑھا دی۔ وہ چارپائی سے اٹھ بیٹھی اور غصے سے چلائی "بھاڑ میں جائے پیر سائیں کے ببول کے درخت کی چھال! چار دن بازو میں باندھ رکھی لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ چھال کیا فائدہ دے گی......ہونہہ!"

یہ کہہ کر اس نے چھال میرے ہاتھ سے چھین کر باہر صحن میں پھینک دی اور بولی "کل صبح میں دوائی لینے شہر جا رہی ہوں۔ اپنے نواسے کو دوسرے گاؤں سے بلایا ہے۔" یہ بتا کر وہ چارپائی پر سکون سے لیٹ گئی۔ میں نے تھوڑی دیر اس کے غصے میں بھرے چہرے کو گھورا پھر بستہ کاندھے میں لٹکایا اور اپنے گھر کی طرف دوڑ لگا دی۔ ●●●

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

ایک غم زدہ باپ کی

انوکھی خواہش

قانون کے اندھے ہاتھوں میں پھنس جانے والے فاترالعقل نوجوان کی حیرت انگیز کتھا

ذان راس

گلی سنسان تھی۔ وہ کھمبے کے نیچے رک گیا۔ اس نے احتیاط سے دونوں طرف نظریں دوڑائیں۔ پھر اپنے بازوؤں میں سوئے بچے کو مضبوطی سے بھینچ کر اس کا معصوم چہرہ غور سے دیکھنے لگا۔ بچے کے بال سنہرے تھے۔ منہ پر اداسی چھائی ہوئی تھی، جیسے وہ روتے روتے سو گیا ہو۔ نوجوان چند لمحے اسی حالت میں کھڑا رہا جیسے وہ کوئی قطعی فیصلہ کرنے سے قاصر ہو۔ اس کا لباس شکن آلود تھا۔ بال سیاہ اور چہرے کی رنگت زرد تھی۔ اور وہ خوف زدہ نظر آ رہا تھا۔

پھر وہ فیصلہ کن انداز میں اچانک مڑا اور تیز تیز قدم اٹھاتا سرخ اینٹوں والی عمارت کی طرف بڑھا۔ اندر داخل ہو کر اس نے عمارت میں رہنے والے کرائے داروں کی تختیوں پر نظر ڈالی۔ اسے ایڈورڈ نامی شخص کی تلاش تھی۔ ایڈورڈ دوسری منزل کے ایک فلیٹ میں مقیم تھا۔

نوجوان بچے کو مضبوطی سے تھامے جلدی جلدی

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ دوسری منزل کے ایک فلیٹ کے سامنے رک کر اس نے اطلاعی گھنٹی بجائی اور دروازہ کھلنے کا انتظار کرنے لگا۔ راہداری میں جلنے والا بلب کم قوت کا تھا۔ نوجوان نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ کچھ دیر بعد دروازہ کھلا اور اندر سے ایک نوجوان نے جھانک کر باہر دیکھا۔ پھر وہ پورا دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ اس کے جسم پر پتلون اور بنیان کے سوا کچھ نہیں تھا۔ چہرہ ستا ہوا اور آنکھیں بے خوابی کی وجہ سے سرخ ہو رہی تھیں۔

"یہ لو اپنا بچہ!" نوجوان نے پرسکون لہجے میں کہا اور بازوؤں میں سویا بچہ ایڈورڈ کی طرف بڑھایا۔ "دیکھ لو، بالکل ٹھیک ہے۔"

ایڈورڈ نے لپک کر جھپٹتے ہوئے بچہ اپنی گود میں لے لیا۔ اس کے منہ سے سسکی سی نکلی۔ اس نے اپنے بچے کو سینے سے لگا کے زور سے بھینچا۔ نوجوان ٹکٹکی باندھے باپ کے تاثرات دیکھ رہا تھا۔ چند لمحوں بعد ایڈورڈ کسی خیال کے زیرِ اثر زور سے چونکا۔ اس نے دہشت زدہ نظروں سے نوجوان کو دیکھا جو اس کا بچہ لے کر آیا تھا۔ پھر وہ بچے کو سینے سے چمٹائے جلدی سے دوڑ کر فلیٹ میں چلا گیا۔

نوجوان چند لمحے خالی خالی نظروں سے فلیٹ کا کھلا ہوا دروازہ تکتا رہا۔ اس وقت وہ عجیب جذباتی کیفیت محسوس کر رہا تھا۔ پھر ایک جھٹکے سے مڑا اور تیزی سے سیڑھیاں اترنے لگا۔ عمارت سے باہر نکلتے ہی اچانک تاریکیوں سے سائے ابلنے لگے اور کسی نے اس کے چہرے پر طاقتور ٹارچ سے روشنی ڈالی۔ پھر کچھ ہاتھوں نے بے دردی سے اسے گرفت میں جکڑ لیا۔ "پولیس۔" ایک کھردری سخت آواز نے کہا۔ "خود کو قانون کے حوالے کر دو، خاموشی کے ساتھ!"

چند منٹ بعد پولیس کی گاڑی ہیڈکوارٹر کے سامنے رکی۔ اخباری نمائندوں نے گاڑی چاروں طرف سے گھیر لی۔ دروازہ کھلا اور نوجوان سادہ لباس والے دو سپاہیوں کے درمیان گاڑی سے نکلا۔ پیچھے پیچھے چند باوردی پولیس والے نکلے اور یہ چھوٹا سا قافلہ ہیڈکوارٹر میں داخل ہو گیا۔

کچھ دیر بعد نوجوان کو ایک بڑے کمرے میں لے جایا گیا۔ کشادہ میز کے پیچھے ایک پستہ قد گنجا آدمی بیٹھا تھا۔ اس کے دونوں طرف سادہ لباس والے سپاہی موجود تھے۔ "میں انسپکٹر ونٹر ہوں۔" پستہ قد گنجے نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ "تمھارے حق میں یہی بہتر ہوگا کہ تم فوراً اپنے جرم کا اعتراف کر لو۔ اس طرح ہمارا وقت ضائع ہونے سے بچ جائے گا اور عدالت بھی سزا سناتے وقت تمھارا یہ تعاون پیشِ نظر رکھے گی۔"

نوجوان نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور بولا "کیا آپ کا خیال ہے کہ میں نے بچے کو اغوا کیا تھا؟ آپ غلط فہمی کا شکار ہیں۔"

انسپکٹر کا چہرہ سخت ہو گیا۔ اس کے لبوں پر مضحکہ اڑانے والی مسکراہٹ پھیل گئی۔ "یہ بہت پرانا گھسا پٹا جملہ ہے۔" اس نے قلم سنبھالتے ہوئے کہا۔ "تمھارا نام اور پتا؟"

"والٹر اسنو۔" نوجوان نے نام بتا کے اپنا پتا لکھوایا۔

"پیشہ؟"

"موسیقار ہوں۔ لیکن آج کل کوئی کام نہیں کرتا۔"

"شادی شدہ ہو؟"

والٹر نے اثبات میں سر ہلایا۔ "ہاں لیکن میری بیوی مجھے چھوڑ کر چلی گئی ہے۔"

انسپکٹر نے قلم میز پر رکھ دیا اور آگے جھک کر غور سے والٹر کو دیکھا۔ "اب تم یہ بتاؤ کہ تم نے بچے کو پہلے اغوا

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

کیوں کیا؟ پھر اسے واپس کیوں کر دیا؟ اگر تم بچے کو اغوا کر کے والدین سے رقم حاصل کرنا چاہتے تھے تو اُسے واپس کیوں کر دیا؟ اگر تمھارا ارادہ شروع ہی سے بچے کو واپس کرنے کا تھا تو تم نے اسے اغوا کیوں کیا؟"

والٹر نے ایک گہری سانس لی۔ بےبسی کے عالم میں سر ہلایا اور کہا "انسپکٹر میں پہلے ہی کہہ چکا کہ میں نے بچے کو اغوا نہیں کیا۔ صرف اسے اس کے والدین کو واپس کیا تھا۔"

انسپکٹر نے اپنے ان دونوں ساتھیوں کو دیکھا جو والٹر کے دائیں بائیں بیٹھے تھے۔ پھر وہ چند لمحے نوجوان ملزم کو دیکھتا رہا۔ "دیکھو والٹر میں معموں میں گفتگو کرنے کا قائل نہیں۔ یہ بتاؤ کہ اگر تم نے بچے کو اغوا نہیں کیا تھا تو یہ تمھیں کہاں سے اور کیسے ملا؟"

"میں اپنی گاڑی میں آوارہ گردی کر رہا تھا" نوجوان نے سادگی سے کہا "مجھے اپنے گھر سے بڑی وحشت ہوتی ہے۔ اس لیے آج کل سارا دن گاڑی میں گھومتا رہتا ہوں۔ آج مجھے کچھ سامان بھی خریدنا تھا۔ میں اپنی گاڑی ایک مارکیٹ کے پاس کھڑی کر کے خریداری کرنے اندر چلا گیا۔ جب واپس آیا تو میری گاڑی کی اگلی نشست پر ایک بچہ بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی قمیص پر پن سے ایک پرزہ چپکا ہوا تھا جس پر بچے کے والدین کا پورا نام اور پتا لکھا ہوا تھا۔"

انسپکٹر نے بےیقینی کے انداز میں سر ہلایا "وہ پرزہ کہاں ہے؟"

"میں نے اس کی قمیص سے علیحدہ کر لیا تھا" والٹر نے کہا "بچہ بھوک کی وجہ سے رو رہا تھا۔ میں اسے اپنے گھر لے گیا۔ اسے دودھ پلایا اور وہ پرزہ پھاڑ کر پھینک دیا۔"

"خوب! خوب!" انسپکٹر نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "اچھا، اس مارکیٹ کا نام اور پتا کیا ہے؟ اور تم کس وقت وہاں گئے تھے؟"

والٹر نے آہستگی سے اس کے تمام سوالوں کے جواب دیے جنھیں انسپکٹر ایک صفحے پر لکھتا رہا۔ پھر اس نے وہ کاغذ اپنے ایک ماتحت کی طرف بڑھایا اور بولا "تمھیں ان تمام باتوں کی تصدیق کرنی ہے۔" پھر نوجوان کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا "تمھیں یہ تو معلوم ہوگا کہ وہ اغوا کیا ہوا بچہ تھا اور پولیس اسے اور ملزموں کو تلاش کر رہی تھی؟"

> میں پولیس میں ملازم ہونے کے باوجود انسان رہنے کی کوشش کرتا ہوں، مگر بسا اوقات مجھے بہت دشواری ہوتی ہے۔

والٹر نے اثبات میں سر ہلایا "ہاں میں نے سہ پہر کے وقت گاڑی کے ریڈیو پر اغوا کی خبر سنی تھی۔"

انسپکٹر نے زور سے میز پر گھونسا مارا اور آگے کی طرف جھک کے نوجوان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا "اس کے باوجود تم نے بچے کو فوراً پولیس کے حوالے نہیں کیا بلکہ تم اسے اپنے گھر لے گئے، جہاں تمھارے کہنے کے مطابق وہ کئی گھنٹے تک رہا۔ کیا میں اس احمقانہ کہانی پر یقین کر سکتا ہوں؟"

نوجوان نے بےبسی سے کاندھے اچکائے اور کہا "میں نے جو کچھ کہا اس کا ایک ایک لفظ سچ ہے۔"

"سچ سننا چاہتے ہو تو مجھ سے سنو۔" انسپکٹر نے تیز لہجے میں کہا "پہلے تم نے بچے کو اغوا کیا۔ پھر تم اس جرم کے نتائج سے دہشت زدہ ہو گئے، اس لیے تم نے یہی بہتر سمجھا کہ بچہ والدین کو واپس کر دیا جائے۔"

http://www.bookstube.net/

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ انسپکٹر نے ہاتھ بڑھا کر چونگا اُٹھا لیا۔ اور کچھ دیر خاموشی کے ساتھ چونگا کان سے لگائے رکھا۔ درمیان میں وہ ہوں ہاں کرتا رہا۔ پھر اس نے چونگا کریڈل پر رکھ دیا اور گہری نظروں سے والٹر کو دیکھنے لگا۔ اب اس کے چہرے کے تاثرات بڑی حد تک تبدیل ہو گئے تھے۔ ''والٹر!'' ابھی جو ٹیلی فون آیا۔ وہ میرے ایک نائب نے تمھارے فلیٹ سے کیا تھا۔ وہ وہاں تمھارے سامان کی تلاشی لینے گیا تھا۔ کیا یہ درست ہے کہ چند ماہ قبل تمھارا چھے سالہ بچہ ایک حادثے میں ہلاک ہو گیا تھا؟''

والٹر پر اس سوال کا عجیب ردعمل ہوا۔ اس کا زرد چہرہ اور زرد ہو گیا' بدن کو جھٹکا سا لگا۔ وہ اپنی نشست پر سیدھا ہو گیا۔ اعصاب تن گئے۔ لیکن اس کا چہرہ اب بھی جذبات سے عاری تھا اور جب وہ بولا تو لہجہ بالکل سپاٹ تھا۔ ''ہاں، میں شہر سے باہر تھا۔ وہ گلی میں کھیل رہا تھا کہ ایک ٹرک اسے کچلتا ہوا چلا گیا۔''

انسپکٹر کا چہرہ نرم پڑ گیا۔ اس نے نظریں جھکا لیں اور میز پر رکھی ایک فائل دیکھنے لگا۔ جب وہ بولا' تو اس کا لہجہ دھیما تھا۔ ''میں تمھیں یہ بتانا چاہتا ہوں والٹر کہ میں پولیس میں ملازم ہونے کے باوجود انسان رہنے کی کوشش کرتا ہوں' مگر بسا اوقات مجھے بہت دشواری ہوتی ہے۔ پھر بھی میں اپنی سی کوشش ضرور کرتا ہوں۔ میں تمھارے حالات سمجھ سکتا ہوں۔

''بیوی نے ساتھ چھوڑا' تو تم تنہا رہ گئے اور تنہائی کے ساتھ تم پر بچے کی پرورش کا بوجھ بھی پڑ گیا۔ پھر تم سے تمھارا بچہ بھی چھن گیا' لیکن یہ صورت حال تمھارے حق میں بہت نقصان دہ ہے۔ تمھارا کیس اور کمزور ہو جائے گا۔ ہمارا تجربہ بتاتا ہے کہ لوگ جب شریک حیات چھوٹنے کے بعد دوسری شادی نہیں کرتے اور ان سے بچے بھی چھن جائیں، تو ان میں سے کچھ جرائم کی طرف راغب ہو جاتے ہیں۔ بچوں کے اغوا میں عام طور پر عورتیں ملوث پائی گئی ہیں۔ لیکن یہ کوئی کلیہ نہیں' مردوں سے بھی اس حرکت کی توقع حیرت انگیز نہیں ہے۔ سمجھ رہے ہو میرا مطلب؟''

والٹر نے نظریں اٹھا کر انسپکٹر کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے کرب و اذیت نمایاں تھی۔ ''میں بے قصور ہوں جناب! میں نے بچہ اغوا نہیں کیا تھا'' اس نے دھیمے لہجے میں دہرایا۔

''اچھا ہم کچھ دیر کے لیے تمھارے بیان درست تسلیم کر لیتے ہیں۔'' انسپکٹر نے تھکے تھکے لہجے میں کہا ''اب ہمیں یہ معلوم کرنا پڑے گا کہ جس وقت بچہ اغوا کیا گیا، اس وقت تم کہاں تھے؟ اسے آج صبح تقریباً ساڑھے گیارہ بجے اغوا کیا گیا تھا؟''

نوجوان کا سر جھک گیا۔ وہ چند لمحے گہری سوچ میں ڈوبا رہا۔ ''مجھے نہیں معلوم کہ میں اس وقت کہاں تھا؟ بس اتنا معلوم ہے کہ میں اپنی گاڑی میں آوارہ گردی کر رہا تھا۔''

''یہ کہنے سے جان نہیں چھوٹے گی۔'' اچانک انسپکٹر کا لہجہ پھر پہلے کی طرح سخت ہو گیا۔ ''بچے کو آج صبح گیارہ بج کر بیس اور پچیس منٹ کے درمیان اس کے گھر کے قریب سے اغوا کیا گیا۔ وہ گلی میں کھیل رہا تھا۔ اگر تم یہ ثابت نہیں کر سکے کہ اس وقت تم جائے واردات کے بجائے کسی دوسری جگہ تھے تو تمھارے بے گناہ ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ عدالت تمھیں مجرم تسلیم کر لے گی۔ تمھیں معلوم ہے، ہمارے ملک میں بچوں کو اغوا کرنے کی سزا کتنی سخت ہے؟''

www.pdfbooksfree.pk

نوجوان نے دوبارہ سر اٹھا کے انسپکٹر کو دیکھا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں جائے واردات سے اپنی غیر موجودگی کس طرح ثابت کر سکوں گا؟'' اس نے کہا ''جب میں اپنے مکان میں دیر تک رہوں' تو مجھ پر وحشت سوار ہو جاتی ہے۔ میں جنونی ہو جاتا ہوں۔ اس وقت میں اپنی گاڑی میں بیٹھ کر نکلتا ہوں۔ میری کوئی منزل نہیں ہوتی۔ صرف ایک مقصد ہوتا ہے، اپنے گھر سے دور رہنا۔ پھر میں اس وقت تک آوارہ گردی کرتا رہتا ہوں، جب تک میری حالت معمول پر نہیں آ جاتی۔ میری وحشت کا یہی ایک علاج ہے۔ ڈرائیونگ کے دوران مجھے یہ ہوش نہیں رہتا کہ کہاں جا رہا ہوں؟ بس میں ایک سڑک پر چلتا رہا ہوں، چلتا رہتا ہوں، یہاں تک کہ تھک جاتا ہوں۔ پھر واپس گھر آتا ہوں۔''

''آج تم کس سمت گئے تھے؟''

''آج میں شمال کی طرف گیا تھا۔ مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ آج میں نے بہت طویل سفر کیا تھا۔ شہر ختم ہو گیا۔ پھر بھی میں چلتا رہا۔ یہاں تک کہ دیہی علاقے شروع ہو گئے اور مجھے دور دور تک کھیت اور باغات پھیلے ہوئے نظر آئے۔ پھر میں واپس آ گیا۔''

''خوب۔'' انسپکٹر نے کہا۔ ''تم تنہا تھے؟ راستے میں تمھیں کوئی ایسا شخص بھی نظر نہیں آیا جو تمھارا جاننے والا ہو؟ تم کسی ہوٹل میں کافی وغیرہ پینے کے لیے بھی نہیں گئے؟ تم نے کسی پمپ سے اپنی گاڑی میں پٹرول بھی نہیں ڈلوایا؟''

''میری گاڑی کی ٹینکی پٹرول سے بھری ہوئی تھی۔

> یہ نکتہ مجھے بہت دیر سے پریشان کیے ہوئے ہے کہ جب تم نے بچے کو اپنی گاڑی میں دیکھا' تو اسے فوراً پولیس اسٹیشن کیوں نہیں لائے؟

بھوک آج کل مجھے بہت کم لگتی ہے۔'' نوجوان نے آزردہ لہجے میں جواب دیا۔

انسپکٹر سوالات کرتا اور نوجوان جواب دیتا رہا۔ اس کے جواب پہلے کی طرح فضول تھے۔ انسپکٹر نوجوان کا بازو پکڑے کمرے سے باہر آیا۔ راہداری میں ایک اور باوردی سپاہی نے نوجوان کا بازو پکڑا اور اسے لے جا کے حوالات میں بند کر دیا۔

☆☆☆

دوسرے روز صبح دس بجے نوجوان ایک بار پھر انسپکٹر کے دفتر میں موجود تھا۔ انسپکٹر نے کہا ''والٹر! میں پھر شروع سے آخر تک تمھاری کہانی سننا چاہتا ہوں۔''

نوجوان کے چہرے کا رنگ اُڑا ہوا تھا۔ وہ بہت افسردہ اور تھکا نظر آ رہا تھا۔ انسپکٹر کے حکم پر اس نے دھیمے لہجے میں ٹھہر ٹھہر کے ایک بار پھر اپنا بیان دہرایا۔ اس کی کرب میں ڈوبی ہوئی آواز اتنی دھیمی تھی کہ انسپکٹر کو آگے کی طرف جھک اور کان لگا کر اس کا بیان سننا پڑا۔ اس کے باوجود وہ کئی فقرے نہیں سن سکا۔ ''یہ سب بالکل سچ ہے انسپکٹر! اس میں جھوٹ کا شائبہ تک نہیں۔'' نوجوان نے بیان ختم کرتے ہوئے کہا۔

انسپکٹر نے نشست پر سیدھے ہوتے سگریٹ سلگائی اور ایک گہرا کش لیا۔ ''ممکن ہے والٹر! یہ سب سچ ہو لیکن ایسا نظر آتا ہے کہ تمھیں اپنی بے گناہی عدالت کے سامنے ثابت کرنا پڑے گی۔''

اسی وقت کسی نے دروازے پر دستک دی۔ ایک پولیس والا اندر داخل ہوا۔ اس کے عقب میں ایک اور

http://www.bookstube.net
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

آدمی بھی تھا۔ وہ خاکی وردی میں ملبوس تھا۔

''یہ صاحب آپ کو کچھ بتانا چاہتے ہیں جناب!'' سپاہی نے اپنے ساتھ آنے والے شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ادب سے انسپکٹر کو مخاطب کیا۔

''تم کچھ دیر انتظار نہیں کر سکتے تھے۔'' انسپکٹر نے ناگواری سے کہا۔

خاکی وردی والا آدمی آگے بڑھا اور والٹر کے قریب کھڑا ہو گیا۔ ''یہ میرا خیال ہے جناب! میں جو کچھ آپ کو بتانا چاہتا ہوں، وہ بہت اہم ہے۔'' اس نے والٹر کی طرف دیکھا۔ ''یہ نوجوان بے گناہ ہے جناب! مسٹر ایڈورڈ کا بچہ اس نے اغوا نہیں کیا۔''

کمرے میں مکمل سکوت طاری ہو گیا۔

''میں نے آج صبح کے اخبار میں اغوا کی کہانی پڑھی اور مسٹر والٹر کی تصویر دیکھی۔ میں فوراً پہچان گیا کہ یہ وہی نوجوان ہے جو کل باقی پیسے لیے بغیر چلا گیا تھا۔ میں چنگی میں ملازم ہوں۔ یہ نوجوان کل اپنی گاڑی میں آیا اور اس نے چنگی کے لیے مجھے پانچ ڈالر کا نوٹ دیا۔ میں نے پچاس سینٹ کاٹ کر باقی ساڑھے چار ڈالر واپس کرنے چاہے، لیکن یہ رکا ہی نہیں۔ میں نے اسے آوازیں دیں، مگر اس نے میری آواز نہیں سنی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی گہرے صدمے نے اس کے حواس معطل کر دیے ہیں۔ اس وقت دن کے ساڑھے گیارہ بجے تھے۔ میری ڈیوٹی ساڑھے گیارہ بجے ختم ہوتی ہے۔ میں اپنی جگہ آنے والے دوسرے شخص کا انتظار کر رہا تھا۔ یہ نوجوان بے گناہ ہے کیوں کہ یہ ساڑھے گیارہ بجے کے قریب شہر سے چالیس میل دور تھا۔ اس لیے بچے کو اغوا کر ہی نہیں سکتا۔''

''تم نے پہلے اطلاع کیوں نہیں دی؟'' انسپکٹر نے پوچھا۔

''میں نے اغوا کی تفصیلات آج صبح کے اخبار میں پڑھیں اور پھر اس نوجوان کی تصویر بھی دیکھی۔ اخبار میں یہ بھی لکھا تھا کہ بچے کو ساڑھے گیارہ بجے کے قریب اغوا کیا گیا۔''

☆☆☆

تھوڑی دیر بعد انسپکٹر نوجوان کے ساتھ پولیس ہیڈکوارٹر کے باہر کھڑا تھا۔ وہ اسے باہر تک رخصت کرنے آیا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر والٹر سے دوستانہ انداز میں گرمجوشی سے مصافحہ کیا۔ ''میں ایک بات اب تک نہیں سمجھ سکا والٹر۔'' انسپکٹر نے تشویش نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا ''یہ نکتہ مجھے بہت دیر سے پریشان کیے ہوئے ہے کہ جب تم نے بچے کو اپنی گاڑی میں دیکھا، تو اسے فوراً پولیس اسٹیشن کیوں نہیں لائے؟ تم اسے اپنے گھر کیوں لے گئے اور کئی گھنٹے اسے وہاں کیوں رکھا؟ تمھارا یہ طرزِعمل میرے لیے غیرمعمولی ہے۔ میں اس کی وجہ سمجھنے سے قاصر ہوں۔''

والٹر جواب دینے سے پہلے ہچکچایا۔ اس نے نظریں پھیر لیں اور سڑک کا ٹریفک دیکھنے لگا۔ ''اگر میں اس کی وجہ بتا بھی دوں انسپکٹر، تو شاید آپ سمجھ نہ سکیں۔'' اس نے دھیمی آواز میں کہا۔

''میں سمجھنے کی کوشش کروں گا۔'' انسپکٹر نے کہا۔

''بہت اچھا۔'' نوجوان نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''میں اس باپ کا چہرہ دیکھنا چاہتا تھا جس کا بچہ اس سے چھن گیا ہو، مگر پھر اچانک اسے واپس مل جائے۔''

◆◆◆

http://www.bookstube.net

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

عندلیب گلشن ناآفریدہ

چودھری رحمت علی

ڈاکٹر طاہر مسعود ہمارے عہد کے ایک صاحب اسلوب ادیب اور تحقیق و تخلیق کی ایک منفرد آواز ہیں۔ ان کی تصانیف علمی حلقوں میں بڑی قدر و منزلت سے دیکھی جاتی ہیں۔

شاعر مشرق علامہ اقبالؒ نے کہیں لکھا ہے:

"قومیں شاعروں کے دلوں میں جنم لیتی اور سیاست دانوں کے ہاتھوں میں پہنچ کر مر جاتی ہیں۔"

کسے معلوم تھا کہ مصور پاکستان کے قلم سے نکلا ہوا یہ الہامی فقرہ ایک ساعت بد میں خود ان ہی کے خواب کی تعبیر ثابت ہوگا۔ کوئی نہیں سوچتا کہ ایک دلکش سہانے خواب کی تعبیر ایسی الم انگیز اور غم ناک کیوں نکلی۔ اس عاجز کے نزدیک دنیائے فانی میں تعمیر و تخریب کے جو واقعات بھی ظہور پذیر ہوں، وہ ظاہری و باطنی علل کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ ہماری نگاہ ظاہربیں خارجی اسباب کی متلاشی ہوتی ہے۔ خداوند تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں وہ چشم باطن عطا فرمائے کہ ہم باطنی اسباب کی کھوج کرید بھی کبھی کیا کریں۔

اپنے گناہوں، اپنی بداعمالیوں، اپنی خودغرضیوں اور کم ظرفیوں کا دوش دوسروں کو دینا کتنا آسان ہوتا ہے اور یہ اعتراف کتنا کٹھن کہ ہاں جو کچھ ہوا، بہت برا ہوا۔ یہ چشم باطن دکھاتی ہے کہ اپنی کس بدنیتی سے ہم نے ٹھوکر کھائی، زخم لگے اور لہولہان ہوئے۔ کس قدر پیش پاافتادہ جملہ ہے کہ سنتے سنتے کان پک گئے ہیں کہ یہ ملک بڑی قربانیوں سے معرض وجود میں آیا ہے، اس کی بنیادوں میں لاکھوں انسانوں کا لہو، ہزاروں بہو بیٹیوں کی عصمتیں شامل ہیں وغیرہ مگر کبھی یہ سننے میں نہ آیا کہ یہ ملک ہماری ناشکر گزاری، احسان فراموشی اور ایک غفلت مسلسل سے دولخت ہوا اور اب تو نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ اسے ناکام ریاست، خطرناک ترین ریاست اور نہ جانے کن کن القابات سے دنیا میں نوازا جا رہا ہے۔ جب ناکامی اور خطرناکی کے ظاہری اسباب کو تلاش کیا جاتا ہے، تو سارے گناہوں کا پشتارہ کبھی سیاست دانوں کبھی

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

سول اور خاکی بیوروکریسی، کبھی جاگیرداروں اور ملاؤں پر ڈال کر ہم خود کو بری الذمہ کر لیتے ہیں۔ ہاں کبھی کبھی جھنجھلا کر، اس خود فراموشی کے رویے کو دیکھ کر میرا جی چاہتا ہے کہ کسی پہاڑی پر استادہ ہوجاؤں اور پکار پکار کر کہوں:

''اے لوگو! مجھے دیکھو! یہ میں ہوں، اس ملک کی شکست و ریخت کا ذمے دار مجھے اس جرم عظیم کی سزا دو کہ خدا کی یہ بستی جس کا نام پاکستان ہے، یہاں سبھی پاکباز، پوتر اور مقدس نفوس بستے ہیں۔''

مگر ایسا صرف سوچ کے رہ جاتا ہوں، کر نہیں پاتا کہ میں بھی تو اپنے باطن میں خود کو ویسا ہی سمجھتا ہوں گا جیسا دوسرے سمجھتے ہیں۔ کیا میں ان سے الگ ہوں؟

اب یہ لفظ ''پاکستان'' کا ذکر آیا ہے تو آج کے حرماں نصیب ملک کا نام یقیناً چودھری رحمت علی نے کسی شبھ گھڑی تجویز کیا تھا۔ صرف تجویز ہی نہیں کیا جس چار ورقی پمفلٹ میں یہ نام پہلی بار دنیا کے سامنے آیا، یعنی ''اب یا کبھی نہیں'' (Now or nerver) اسے پڑھ کر میں حیران ہوتا ہوں کہ حکیم الامت کے خطبہ الہ آباد کے صرف تین سال بعد اور قرارداد پاکستان سے سات سال پہلے لکھے گئے اس پمفلٹ میں بڑے گرم جوش جذبات اور محکم عقلی دلائل سے پاکستان کا مقدمہ لڑا گیا ہے۔ یہ وہی دلائل ہیں جن سے بعد میں قائداعظم نے گورے آقاؤں اور تنگ نظر کانگریس کو قائل کیا۔

مورخ پاکستان کے کے عزیز نے اپنی وقیع محققانہ کتاب A History of the Idea of Pakistan کی جلد دوم (ص ۲۴۴) میں لکھا ہے کہ لاہور میں مسلم لیگ کے ۱۹۴۰ء کے سیشن میں جب قرارداد پاکستان پیش کی گئی تو اس موقع پر قائداعظم نے اپنے صدارتی خطبے میں مسلمانوں کے ایک علیحدہ قوم ہونے کے متعلق جو کچھ فرمایا، اس میں چند جملے تو بالکل وہی تھے جو چودھری رحمت علی نے اپنے ''اب اور کبھی نہیں'' والے پمفلٹ میں درج کیے تھے۔ کے کے عزیز جو چودھری رحمت علی پر ایک نہایت محققانہ کتاب A Complete works of Choudhry Rehmat Ali کے مرتب بھی ہیں۔

انھوں نے لکھا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے مختلف اور جداگانہ قوم ہونے کا جتنا واضح اور دوٹوک لب و لہجے میں اعلان چودھری رحمت علی نے کیا، ان سے قبل کسی اور نے نہیں کیا۔ جب مسلم لیگ نے دوقومی نظریے کی بنیاد پر قیام پاکستان کی تحریک چلائی تو اس کے پاس مسلمانوں کے ایک قوم ہونے کے وہی دلائل تھے جو چودھری رحمت علی اپنے مذکورہ پمفلٹ میں پوری قوت سے بیان کر چکے تھے۔ قیام پاکستان کے حق میں کوئی نئی دلیل، نیا نکتہ، نیا وژن مسلم لیگی راہنماؤں کے پاس نہ تھا۔

اگر کسی کو اس امر میں شبہ ہو تو وہ خواجہ رضی حیدر کے کتابچے ''چودھری رحمت علی، تاریخ کے آئینے میں'' شامل اس پمفلٹ کا ترجمہ پڑھ لے۔ پھر خود ہی فیصلہ کرے کہ تصور پاکستان کے اس خالق، ایک وژنری مفکر، مسلمانان ہند کے سچے ہمدرد و غم خوار، مگر انتہائی بدنصیب، کیمبرج کے اس نوجوان طالب علم کے ساتھ ہماری قوم کے مورخین، مصنفین، دانش وروں اور خود مسلم لیگ اور تحریک پاکستان کے راہنماؤں نے کیا سلوک کیا، کیسی بے اعتنائی، بے مروتی اور احسان فراموشی کا سلوک!

چودھری رحمت علی کا قصور فقط اتنا تھا کہ وہ بھی غالب کے الفاظ میں عندلیب گلشن ناآفریدہ تھے۔ ایک ایسے نابغہ (Genious) جو وقت سے پہلے پیدا ہو کر ناقدری زمانہ کی سختیاں جھیلتے رہے۔ گول میز کانفرنس

http://www.bookstube.net/

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

صاحبِ مضمون

ڈاکٹر طاہر مسعود ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔ صحافت سے عملی زندگی کا آغاز کیا۔ بعدازاں ذرائع ابلاغ کے مختلف شعبوں سے منسلک رہے۔ کالم نگاری بھی کرتے ہیں۔ فی الوقت کراچی یونیورسٹی میں شعبہ ماس کمیونیکیشن کے سربراہ ہیں۔ آپ کی زیرِ قیادت یہ شعبہ روز افزوں ترقی کر رہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے زیرِ نظر مضمون چودھری رحمت علی مرحوم کی برسی کے موقع پر اردو ڈائجسٹ کو بھجوایا ہے۔

لندن کے مندوبین میں جب یہ انقلابی پمفلٹ تقسیم کیا گیا' تو اسے ایک طالب علم کی ناقابلِ التفات، ناقابلِ عمل اور جذباتی کوشش سے تعبیر کر کے رد کر دیا گیا' مگر جس محنت میں خلوص اور نیک نیتی کی مہک شامل ہوتی ہے' اسے خالقِ ارض و سماں کبھی رائگاں نہیں جانے دیتا کہ یہ اُس کی سنت ہے۔

پمفلٹ میں تجویز کردہ نام ''پاکستان'' قبول کر لیا گیا۔ ظلم یہ ہوا کہ پمفلٹ کے مندرجات نظرانداز کر کے چودھری رحمت علی مرحوم کی قیامِ پاکستان کے لیے قائم کی جانے والی تنظیم ''پاکستان نیشنل موومنٹ'' کی سرگرمیوں کو پرکاہ کے برابر اہمیت نہ دے کر نسلِ نو کو پڑھائی جانے والی تاریخ میں سے ان کی خدمات کو حذف کر دیا گیا، یعنی آدھا سچ چھپا لیا گیا۔ آج ہم اور ہماری نئی نسل چودھری رحمت علی کو صرف پاکستان کے نام کے خالق کی حیثیت سے جانتی ہے۔

نوجوانانِ پاکستان کو علم نہیں کہ قرار دادِ پاکستان ۱۹۴۰ء سے قبل بقول ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی مختلف شخصیات کی جانب سے تقسیمِ ہند کی جو وقتاً فوقتاً پندرہ تجاویز پیش کی گئیں، ان میں علامہ اقبال کے خطبہ الہ آباد سے بھی بہت پہلے ۱۹۱۵ء میں چودھری رحمت علی نے بزمِ شبلی میں خطبہ دیتے ہوئے کہا تھا: ''شمالی ہند مسلم ہے اور ہم اسے مسلم ہی رکھیں گے۔ نہ صرف یہ بلکہ ہم اسے مسلم مملکت بنا دیں گے' مگر ہم ایسا اُسی وقت کر سکتے ہیں جب ہمارا شمالی حصہ ''ہندوستان'' نہ رہے۔ کیونکہ یہ اس کے لیے شرطِ اولین ہے۔ پس ''ہندوستانیت'' کو ہم جس قدر جلد ترک کر دیں' ہمارے اور اسلام کے لیے وہ اتنا ہی بہتر ہے۔'' (بحوالہ جدوجہد پاکستان۔ ص ۳۔۱۶۴) ڈاکٹر قریشی نے لکھا ہے کہ تقسیمِ ہند اور مسلمانوں کے لیے علیحدہ وطن کا تصور جمال الدین افغانی کے بعد جس شخص نے پیش کیا، وہ چودھری رحمت علی تھے۔

چودھری رحمت علی ۱۶رنومبر ۱۸۹۷ء کو مشرقی پنجاب میں ضلع ہوشیار پور کے گاؤں موہر میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۱۵ء میں انھوں نے علامہ شبلی نعمانی کے حوالے سے ''بزمِ شبلی'' کی داغ بیل ڈالی۔ ان کی اپنی روایت کے مطابق اسی بزم سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے پہلی بار برصغیر میں ایک آزاد مسلم مملکت کا تصور پیش کیا۔ یہ درست کہ ان کا تصورِ پاکستان اسی طرح ناپختہ تھا جیسے مولانا حسرت موہانی کا گاندھی جی سے بھی پہلے ہندوستان کے لیے آزادیٔ کامل کا مطالبہ کرنا۔

جس طرح حسرت موہانی کا مطالبۂ آزادی وقت سے پہلے ہونے کی وجہ سے اس زمانے میں صدا بصحرا ثابت ہوا' اسی طرح چودھری رحمت علی کا ''مطالبہ پاکستان'' ہندوستان کی سیاسی زمین ہموار نہ ہونے، خود اس تصور کے نئے، اجنبی اور نامانوس ہونے کی وجہ سے حیرت اور حقارت کے سوا کوئی دیرپا طلاطم پیدا نہ کر سکا۔ لیکن سیاست کی سطح

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

آپ پر انھوں نے پہلا پتھر پھینک دیا تھا۔ اس سے جو لہریں اٹھیں انھوں نے ترکی کی ادیبہ خالدہ، ادیب خانم کو اس بات کی طرف متوجہ کیا کہ وہ چودھری رحمت علی سے نہ صرف ان کے تصور پاکستان پر مکالمہ کریں بلکہ اسے اپنی کتاب Inside India کا ایک باب بنائیں۔

چودھری رحمت علی کی بابت تمام اہم اور چیدہ تفصیلات نہایت اختصار کے ساتھ خواجہ رضی حیدر نے اپنے کتابچے میں بیان کی ہیں۔ ان سے میری درخواست ہے کہ وہ کے کے عزیز کی چودھری رحمت علی پر مرتبہ کتاب اور اے ہسٹری آف آئیڈیا آف پاکستان کے جلد دوم میں چودھری مرحوم سے متعلقہ باب کو بھی اردو میں منتقل کریں تاکہ مطالعہ پاکستان کے شائقین کو جن کی کے کے عزیز کی کتابوں تک رسائی نہیں' معلوم ہوسکے کہ اس ارض پاک کے فکری خالقوں میں ایک مظلوم محسن ایسا بھی ہے کہ جب یہ ملک قائم ہوگیا' تو اس کی خدمات کو نہ تاریخ کی کتابوں میں پوری طرح ریکارڈ کیا گیا اور نہ اس خلوص، محنت، محبت بلکہ اس وارفتگی اور دیوانگی کی خاطرخواہ قدر کی گئی جو چودھری رحمت علی کے اندر اس ارض پاک تصور کے حوالے سے تھی۔

یہ ارض پاک ان کے ذہن میں ایک خیال وخواب بن کر رہا اور جب وہ وجود میں آیا' تو کسی نے نہ پکارا کہ ''رحمت علی! اپنے خوابوں کی سرزمین دیکھنے نہ آؤ گے؟''

جب چودھری رحمت علی دل کے درد کے ہاتھوں مجبور، بن بلائے خود سے آئے' تو مفاد پرست حکمراں ٹولے نے ان کے پیچھے اپنے شکاری کتے چھوڑ دیے جن کا سرکاری نام ''سی آئی ڈی'' تھا۔ حسین شہید سہروردی کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ وہ کلکتہ میں مسلم کش فسادات کی روک تھام کے لیے وہاں ٹھہر گئے اور جب ڈھاکہ آئے' تو حکمراں ٹولے نے ہراساں ہوکر ان کے پیچھے بھی سی آئی ڈی لگا دی تھی۔

بے چارہ شیخ مجیب الرحمان جو قائداعظم سے اتنی عقیدت رکھتا تھا کہ جب شیر بنگال قائداعظم سے کسی بات پر خفا ہوئے' تو وہ مولوی فضل الحق کے خلاف سیاہ جھنڈیوں کے ساتھ جلسے جلوس کرتا تھا۔ حتیٰ کہ فضل الحق کے چہیتے بنگالیوں کے ہاتھوں پیٹا بھی گیا۔ اس کٹر پاکستانی شیخ مجیب الرحمان کو قیام پاکستان کے فوراً بعد بھی پہلے مسلم لیگ سے نکالا گیا اور پھر فکر ونظر کے اختلاف کو جو اس کا جمہوری حق تھا، بنیاد بنا کر اسے دو ڈھائی سال جیل یاترا کرائی گئی۔

میں تو تحریک پاکستان کے حوالے سے تاریخ کی کتابوں، سوانح عمریوں' خودنوشت اور آپ بیتیوں کو پڑھتا ہوں' تو اس سوال کا کوئی جواب نہیں پاتا کہ جن ہاتھوں نے اس ملک کی بنیادوں کی اینٹیں رکھیں' ملک کی عمارت کھڑی ہونے کے بعد محض فکری اختلاف یا ہوس اقتدار میں انھیں ''کھڈے لائن'' کیوں لگا دیا گیا...... اور کیوں ایسا ہوا کہ

ع منزل انھیں ملی جو شریک سفر نہ تھے۔

میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ اس حرماں نصیب ملک کے بدبخت عوام اور مقتدر و بااثر طبقات کی نجات کی راہ آخر کیا ہے؟ کوئی چپکے سے کہتا ہے: داغ دار ماضی سے رجوع اور اپنے گناہوں پر صدق دل سے توبہ ہی میں نجات ہے۔ مجھے جانے کیوں یقین سا ہے کہ توبہ کی توفیق ایک دن ضرور نصیب ہوگی۔ تب چودھری رحمت علی کا جسد خاکی کیمبرج سے لاکر قائداعظم کے پہلو میں آسودہ خاک کیا جائے گا۔ وہ دن قوم کی احسان شناسی اور پاکستان کی ترقی وعروج کے آغاز کا پہلا دن ہوگا۔ ان شاء اللہ! چودھری مرحوم نے ۳ فروری ۱۹۵۱ء کو وفات پائی اور انگلستان میں دفن ہوئے۔

(چوہدری رحمت علی میموریل سوسائٹی کے زیراہتمام ''قائداعظم کا پاکستان اور چوہدری رحمت علی کا اعزاز'' کے موضوع پر منعقدہ سیمینار میں پڑھا گیا۔)

◆◆◆

http://www.bookstube.net/

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

TRUTH
Always Prevails
Sadruddin Hashwani

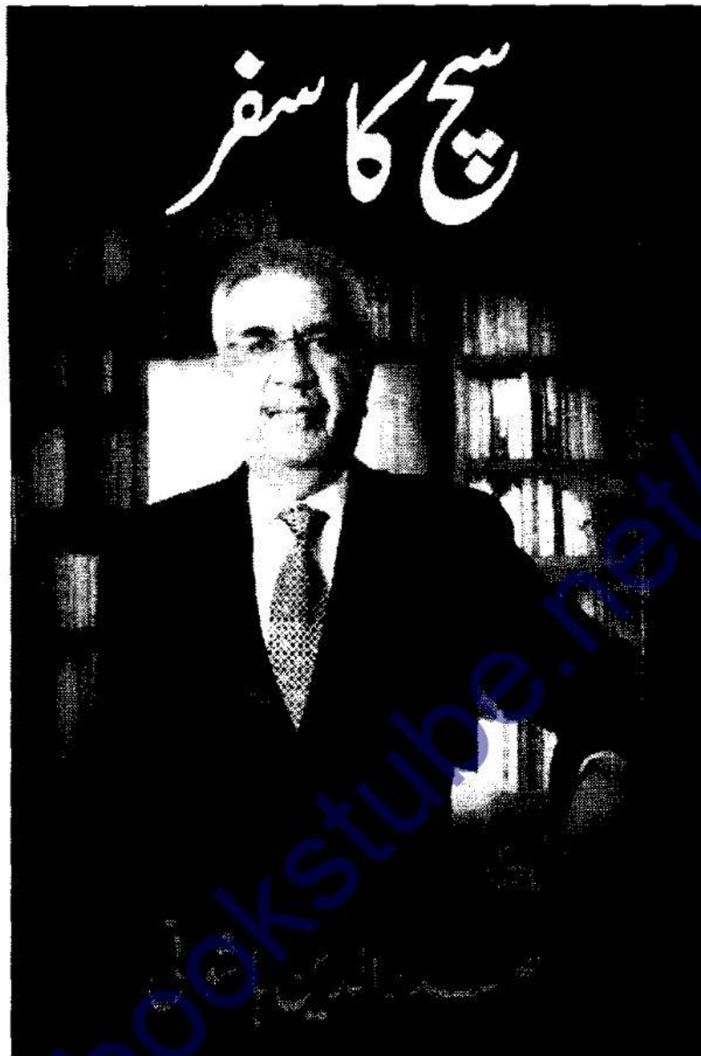

چشم کُشا انکشافات

پاکستان کے ممتاز ترین بزنس مین کی خود نوشت

وہاں پہنچنے پر مجھے بہت لگن سے تعمیر کیا گیا خوبصورت ہوٹل نہیں بلکہ کسی جنگ زدہ علاقے کا منظر دکھائی دیا... میرے سامنے میرے مہمانوں، میرے ساتھیوں اور میرے دوستوں کی لاشیں بکھری پڑی تھیں۔ چہرے جو شناسا تھے، چہرے جن کے ساتھ میں کام کرتا اور ہنستا مسکراتا رہا۔ مگر وہ منظر جس نے مجھے دم بخود کر دیا، 60 فٹ چوڑے اور 20 فٹ گہرے اس گڑھے کا تھا جو ایک ہزار کلوگرام دھماکہ خیز مواد پھٹنے سے بنا تھا۔ ہوٹل پر حملہ نہیں ہوا تھا... بلکہ اسے تاراج کر دیا گیا تھا۔ لاشیں اور بکھرے انسانی اعضا، خون کے تالاب...

فون کال پر کتاب خریدیے یا قریبی بک سٹال سے حاصل کریں
Rs.590

JUMHOORI PUBLICATIONS 042-36314140

www.jumhooripublications.com Info@jumhooripublications.com

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

صدائے بام دنیا

مصنف: ڈاکٹر ندیم شفیق ملک، ناشر: ادارہ فروغ قومی زبان، ایوان اردو، ایچ۔۸/۴، پطرس بخاری روڈ، اسلام آباد۔ قیمت: ۲۵۰ روپے۔ فون: ۰۳۰۱۔۵۵۵۰۵۷۱

یہ چند سال پہلے کی بات ہے، ڈاکٹر ندیم شفیق کی والدہ محترمہ اسپتال میں داخل تھیں۔ فرزند جی جان سے ان کی تیمارداری کر رہے تھے۔ وقت گزاری کے لیے مختلف کتب زیر مطالعہ رہتیں۔ انہی دنوں ڈاکٹر صاحب نے پاکستانی زبانوں وادبیات کے موضوع پر پہلی کتاب پڑھی۔ یہ موضوع انھیں اتنا دلچسپ معلوم ہوا کہ اسی پر ایم فل کرنے کا ارادہ کر لیا۔ ڈاکٹر ندیم

شفیق نے پھر وخی یا واخی زبان، ادب و معاشرت پہ ایم اے کا انگریزی مقالہ سپردِ قلم کیا۔ یہ کتاب اسی مقالے کا اردو ترجمہ ہے۔

وخی زبان ''بام دنیا'' کہلائے جانے والے علاقے، واخان میں بولی جاتی ہے۔ ماضی میں یہ علاقہ تاجکستان سے لے کر پاکستان تک پھیلا ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے، آج بھی ان دونوں ممالک کے علاوہ افغانستان میں بھی واخی زبان بولنے والے پائے جاتے ہیں۔ ان کی تعداد تقریباً ایک لاکھ ہے۔

دنیا کی قدیم ترین زبانوں میں واخی زبان شامل ہے۔ یہ ایرانی زبانوں کے ''پامیری'' خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ پامیری خاندان کی دیگر زبانوں میں روشانی، برتنگی، مونگی، اشکاشیمی، شغنی وغیرہ شامل ہیں۔ واخی کا رسم الخط موجود نہیں، تاہم اسے ایجاد کرنے کی کوشش جاری ہے۔

ڈاکٹر ندیم شفیق اپنے مقالے میں اس پاکستانی زبان کی خصوصیات، ادب و معاشرت سے ہمیں بخوبی آگاہ کراتے ہیں۔ یوں قاری واخی باشندوں کی تہذیب

http://www.bookstube.net
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

کتاب سے بہتر دوست کہاں!!! جمہوری سے بہتر کتابیں کہاں!!!

عمران خان۔ فسانہ یا حقیقت
بچپن سے راہنمائی تک
فرینک حضور
قیمت 680 روپے

”ترکی ہی ترکی“ تاریخ، تہذیب، ثقافت، سیاحت اور سیاست

ترکی پر ایک منفرد اور شاندار کتاب
مصنف: فرخ سہیل گوئندی
قیمت 400 روپے

اتاترک۔ نئی قوم اور جمہوریہ کا ظہور	پیٹرک مناس	2200	سندھ ساگر اور قیامِ پاکستان		اعتزاز احسن	600
پاکستان میں جمہوریت کے تضادات	سلمان عابد	490	قانون دان اقبال		ظفر علی راجا ایڈووکیٹ	860
اسلام کا معاشی نظام اور تحریکِ پاکستان	شیخ محمد رشید	125	حیاتِ قائد اعظم		ہیکٹر بولیتھو	580
غیر مقدس جنگیں (Unholy Wars)	جان کے کولی	490	اکہتر کے وہ دن (مشرقی پاکستان کے آخری 9 ماہ)		جہاں آرا امام	500
پاکستان سے بنگلہ دیش۔ ان کہی جدوجہد	شریف الحق دالیم	580	میرا لہو۔ ذوالفقار علی بھٹو۔ سیاست و شہادت		فرخ سہیل گوئندی	500
پاکستان کا مستقبل	[illegible]	200	جو میں نے دیکھا		راؤ رشید	320
ورلڈ آرڈر کی حقیقت	نوام چومسکی	450	انسانی منظر نامہ	منظوم ناول	ناظم حکمت مترجم منو بھائی	650
سرکش ریاستیں	نوام چومسکی	450	کم سخن یوسف	ناول	صباح الدین علی	450
ریاستی دہشت گردی	نوام چومسکی	450	ناموس	ناول	ایلف شفق	580
عالمی بینکاروں کی دہشت گردی۔ سرمائے کے آقا	فرخ سہیل گوئندی	180	سرخ میرا نام	ناول	اورحان پاموک	780
اسلام کا معاشی نظام اور تحریکِ پاکستان	شیخ محمد رشید	125	شہرِ اطمینان	ناول	احمت حمدی طانپنار	650
لاہور۔ تاریخ و تعمیر	رضوان عظیم	280	جنگل میں منگل	ناول	انیس احمد	460
کامی کازی ڈائری۔ جاپانی خودکش طلبا کے تاثرات	امیکو اونوکی تیرنے	450	ایک ترک خاندان		عرفان اورگا	400
سلیمان عالیشان۔ تاریخِ سلطنتِ عثمانیہ	ہیرالڈ لیمب	520	کنیز۔ عثمانی سلطان کی حقیقی داستانِ عشق	ناول	گل ارن پلو	390
تاریخ سلطنتِ مغلیہ۔ ظہیر الدین بابر	ہیرالڈ لیمب	385	سرزمین		انطونیو توریس	300
صلیبی جنگوں کی تاریخ۔ صلاح الدین ایوبی	ہیرالڈ لیمب	590	سمرقند	ناول	امین معلوف	425
تاریخ سلطنتِ منگولیا۔ چنگیز خان	ہیرالڈ لیمب	250	بوئے گل	ناول	یشار کمال	480
ٹیپو سلطان، مزاحمت اور جدیدیت کی داستان	عرفان حبیب	200	انجامِ بہاراں	ناول	عدالت آغا اوغلو	450
استنبول (تاریخی و رومانی شہر)	جے اے کدن	450	فاطمہ گل آخر میرا قصور کیا؟	ناول	ودات ترکالی	250

Free Delivery ایک فون کال پر گھر بیٹھے کتاب خریدیئے

جمہوری پبلیکیشنز۔ 2۔ایوانِ تجارت روڈ، لاہور 042-36314140
www.jumhooripublications.com

http://www.bookstube.net

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

NOTICE INVITING TENDERS.

Sealed tenders for below mentioned works based on MRS of Govt. of the Punjab (Finance Department(For Layyah District) the estimate cost above or below is hereby invited from the contractors firms (enlisted renewed) for the year 2014-15 with secretary C & W Department as well as with the Office of the EDO Works & Services Department Layyah and the Chief Engineer District Support & Monitoring Department Lahore in the field of Building works.

Tender documents can be obtained from the Office of the undersigned against written request accompanied with attested copies of Enlistment up to date renewal letter and fee receipt P.E.C. License for the year 2015. Authority letter on pad form of contractor firm. Identity card of contractor Managing partner of the firm along with registered power of attorney and on payment of prescribed tender fee (in cash) any cutting /overwriting will not be accepted

Tender rates and amounts should be field in figures a well as in words and tenders should be signed as per general directions given in the tender documents. No rebate on tender rates will be acceptable.

Tenders will be received in the office of the undersigned upto **1:50 PM** of the date of the opening tenders and will be opened at **2.00 PM** as per PPRA rule 30 (1) of 2014 by the tender opening board in the presence of tender opening Board and intending Contractors or their representatives.

Deposit at call (issued from the scheduled bank) 2% of the bid amount noted against the each work shall have to be attached/accompanied with the tenders (with out 2% E.M. tender will not be entertained/ accepted).

No tender will be issued to the contractor whose progress of the works already allotted is not upto the mark.

In case of total tender amount is less then 5% of approved estimated (DNIT) amount, the lowest bideer will have to deposit additional performance Security from the schedule bank ranging from 5% and above upto the percentage quoted below T.S.estimate by him with in 15 days of the receipt of tenders and any notice relating deposit of additional performance security will not be issued. In case of failing the Earnest money will be forfeited in favour of Govt. and tender will considered as cancelled.

Rates quoted by the contractor in his bid schedule must be cleared and should not beyond 3 decimals. Tender rates beyond 3 decimals shall be rejected.

i) Procuring agency may reject all bids or purposal at any time prior to the acceptance of bids or purposal

ii) The procuring agency shall upon request communicate to any bidders, the grounds for its rejection of all bids or purposeless, but shall not be required to justify those grounds.

The original estimate/ renewal letter Pakistan Engineering Council license and other documents of Contractors/Firms will be seen at the time of issuance of tenders if required on any complication.

If the contractor illegible according to the above requirement will have considered and if he accepts all condition than apply for issuance of tenders.

The undersigned have rights to reject one or all the tender with out assigning any reason there of.

The Tenders will be issued upto [redacted]-2-2015 & Received Opened on ~~09-2-2015~~ 12-2-15

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

S#	Name of Works.	Estimated Cost Rs.	Earnest money Rs.	Time Limit.	T.S. No. & Date.	Tender Fee Rs.
[illegible]	Repair and Renovation with all Services of Labour Room with attached Bath, LHV quarter, Class four quarter At Basic Health Unit Jakhar Peer	Rs.2,94,[illegible]	Rs.5[illegible]	01Month	T.O No. 2413-14 DB dated. 15-1-2015	Rs. 147/-
[illegible]	Repair and Renovation with all Services of Labour Room with attached Bath, LHV quarter, Class four quarter At Basic Health Unit Lohanch Nashaib.	Rs.2,94,000/-	Rs.5[illegible]	01Month	-do-	Rs. 147/-
[illegible]	Repair and Renovation with all Services of Labour Room with attached Bath, LHV quarter, Class four quarter At Basic Health Unit Shah Pur.	Rs.2,94,[illegible]	Rs.5[illegible]	01Month	-do-	Rs. 147/-
[illegible]	Repair and Renovation with all Services of Labour Room with attached Bath, LHV quarter, Class four quarter At Basic Health Unit Chak No. 120 TDA	Rs.2,9[illegible]	Rs.5[illegible]	01Month	-do-	Rs. 147/-
[illegible]	Repair and Renovation with all Services of Labour Room with attached Bath, LHV quarter, Class four quarter At Basic Health Unit Chak No. 172 TDA.	Rs.2,94,000/-	Rs.5[illegible]	01Month	-do-	Rs. 147/-
[illegible]	Repair and Renovation with all Services of Labour Room with attached Bath, LHV quarter, Class four quarter At Basic Health Unit Lachana.	Rs.2,94,000/-	Rs.5880/-	01Month	-do-	Rs. 147/-
[illegible]	Repair and Renovation with all Services of Labour Room with attached Bath, LHV quarter, Class four quarter At Basic Health Unit Grey Wala.	Rs.2,94,000/-	Rs.5880/-	01Month	-do-	Rs. 147/-
[illegible]	Repair and Renovation with all Services of Labour Room with attached Bath, LHV quarter, Class four quarter At Basic Health Unit Chak No.90-ML.	Rs.2,94,000/-	Rs.5880/-	01Month	-do-	Rs. 147/-
[illegible]	Repair and Renovation with all Services of Labour Room with attached Bath, LHV quarter, Class four quarter At Basic Health Unit Chak No 75-A TDA.	Rs.2,94,000/-	Rs.58[illegible]	01Month	-do-	Rs. 147/-
[illegible]	Repair and Renovation with all Services of Labour Room with attached Bath, LHV quarter, Class four quarter At Basic Health Unit Jharkil.	Rs.2,94,000/-	Rs.58[illegible]	01Month	-do-	Rs. 147/-

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

	Repair and Renovation with all Services of Labour Room with attached Bath, LHV quarter, Class four quarter At Basic Health Unit Sher Garh.	Rs.2,94,000/-	Rs.5880/-	01 Month	-do-	Rs.147/-
	Repair and Renovation with all Services of Labour Room with attached Bath LHV quarter, Class four quarter At Basic Health Unit Nawan Kot.	Rs.2,94,000/-	Rs.5880/-	01 Month	-do-	Rs.147/-
	Repair and Renovation with all Services of Labour Room with attached Bath, LHV quarter, Class four quarter at Rural Health Centre Jaman Shah.	Rs.4,90,000/-	Rs.9800/-	01 Month	-do-	Rs.245/-
	Repair and Renovation with all Services of Labour Room with attached Bath, LHV quarter, Class four quarter at Rural Health Centre Pahar Pur.	Rs.4,90,000/-	Rs.9800/-	01 Month	-do-	Rs.245/-
	Repair and Renovation with all Services of Labour Room with attached Bath, LHV quarter, at Rural Health Centre Mirhan.	Rs.4,90,000/-	Rs.9800/-	01 Month	-do-	Rs.245/-

IPL-854

MUMTAZ AHMED TAHIR JOIYA,
DISTRICT OFFICER BUILDINGS,
SECRETARY TENDER BOARD. LAYYAH.

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

آنکھیں توجہ چاہتی ہیں!

- ✓ کیا آپ اپنی بیماری کی نوعیت کو سمجھنا چاہتے ہیں؟
- ✓ شوگر آنکھوں کو کیا نقصان پہنچاتی ہے؟ اِس سے بچاؤ کا کیا طریقہ ہو سکتا ہے؟
- ✓ کالا موتیا کیا ہے اور کیا اِس کا علاج ہو سکتا ہے؟
- ✓ بچوں کو عینک کیوں لگتی ہے؟
- ✓ کیا عینک اُتر سکتی ہے؟ لیزر سے عینک اُتارنے کا اپریشن کیسے کیا جاتا ہے؟
- ✓ آپ نے اپریشن کروایا اب آپ کو کیا احتیاطیں کرنی چاہئیں؟
- ✓ کیا آپ کو لیزر لگوانے کا مشورہ دیا گیا ہے اور آپ کو سمجھ نہیں آ رہی کہ لگوائیں یا نہ لگوائیں کیونکہ لوگ کہتے ہیں کہ لیزر نقصان دہ ہوتی ہے؟

اپنے سوالوں کے جواب جاننے کے لئے مندرجہ ذیل Website کا مطالعہ کریں

www.drasifkhokhar.com

آنکھوں کی بیماریوں سے متعلق اُردو کی واحد ویب سائٹ

ڈاکٹر آصف کھوکھر

AMERICAN ACADEMY OF OPHTHALMOLOGY
The Eye M.D. Association
MEMBER

ایم بی بی ایس (پنجاب) ایم سی پی ایس (آنکھ) ایم اے (علوم اسلامیہ)

آپریشن لاہور میڈی کیئر جیسے جدید ترین آئی ہسپتال میں کئے جاتے ہیں

Vitreoretinal Surgery
- ✓ آنکھ کے پردے کے اُکھڑ جانے (Retinal Detachment) کا آپریشن
- ✓ آنکھ کے اندر خون جمع ہو جانے (Vitreous Hemormage) کا آپریشن
- ✓ Macula کو پہنچنے والے نقصان کے علاج کے لیے ہونے والے آپریشن

Phaco Surgery
- ✓ بغیر ٹیکے اور بغیر ٹانکے سفید موتیے کا علاج
- ✓ قریب اور دور کی نظر بیک وقت صحیح کرنے والا Multifocal لینز

Laser Surgery
- ✓ ذیابیطس دیگر بیماریوں سے Retina کو پہنچنے والے نقصان کا بذریعہ لیزر علاج
- ✓ Excimer یا Epi-LASIK آپریشن کی مدد سے عینک سے نجات
- ✓ Argon، Yag اور Diode لیزر کی مدد سے علاج
- ✓ سفید موتیے کے آپریشن کے بعد بننے والی جھلی کا بذریعہ Yag لیزر علاج

Corneal grafting surgery
- ✓ امریکہ سے عطیہ شدہ آنکھیں منگوا کر قرنیہ کی پیوند کاری

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

www.ogdcl.com - www.ogdcl.com - www.ogdcl.com - www.ogdcl.com - www.ogdcl.com - www.ogdcl.com - www.ogdcl.com - www.ogdcl.com -

TENDER NOTICE

Oil & Gas Development Company Limited (OGDCL) is the largest Exploration & Production listed Company of Pakistan. The details about the company can be obtained from website **http://www.ogdcl.com.** Sealed Bid(s) are invited for the material / services given below under competitive bidding procedure, as per Public Procurement Regulatory Authority (PPRA) rules.

S. NO.	TENDER ENQUIRY NO.	DESCRIPTION	BID SUBMISSION DATE & TIME	BID OPENING DATE & TIME
1.	PROC-FD/CB/EXPL-1401/2015	HIRING OF AERO GRAVITY SURVEY TO STRESS FIELD DETECTION (SFD) FOR OGDCL'S DIFFERENT LOCATIONS IN BALUCHISTAN, KHYBER PAKHTOONKHWA AND PUNJAB PROVINCES	05-03-2015 AT 1030 HRS	05-03-2015 AT 1100 HRS
2.	PROC-FE/CB/WL-1381/2015	PERFORATING HARDWARE AND ACCESSORIES	05-03-2015 AT 1430 HRS	05-03-2015 AT 1500 HRS
3.	PROC-FD/CB/SYSTEM-1303/2014	HIRING OF SERVICES FOR RENEWAL OF ORACLE ERP LICENSES	06-03-2015 AT 1030 HRS	06-03-2015 AT 1100 HRS
4.	PROC-FE/CB/P&P-1368/2015	GAS DETECTOR TUBES	09-03-2015 AT 1030 HRS	09-03-2015 AT 1100 HRS
5.	PROC-FA/CB/PROD/PUMP-1376/2014	CRUDE DISPATCH PUMPS	09-03-2015 AT 1430 HRS	09-03-2015 AT 1500 HRS
6.	PROC-FB/CB/PROD-1391/2015	BALL AND CHECK VALVES	10-03-2015 AT 1030 HRS	10-03-2015 AT 1100 HRS
7.	PROC-FC/CB/P&P/NASHPA-1387/2015	SPARES FOR OFF GAS COMPRESSOR	10-03-2015 AT 1430 HRS	10-03-2015 AT 1500 HRS
8.	PROC-FD/CB/DO-1379/2015	HIRING OF HYDRO MECHANICAL UNDER REAMER SERVICES	11-03-2015 AT 1030 HRS	11-03-2015 AT 1100 HRS
9.	PROC-FD/CB/EXPL-1385/2015	HIRING OF SURFACE GEOLOGICAL MAPPING IN TIRAH, ORAKZAI, BOSTAN, ZHOB AND KHUZDAR NORTH BLOCKS	11-03-2015 AT 1430 HRS	11-03-2015 AT 1500 HRS

.com - www.ogdcl.com - www.ogdcl.com - www.ogdcl.com - www.ogdcl.com - www.ogdcl.com - www.ogdcl.com - www.ogdcl.com - www.ogdcl.com - www.ogdcl.com

http://www.bookstube.net/

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

10.	PROC-FE/CB/EXP./G&R LAB-1339/2015	TOTAL ORGANIC CARBON ANALZER	12-03-2015 AT 1030 HRS	12-03-2015 AT 1100 HRS
11.	PROC-FE/CB/LOG-1337/2015	PRIMER MOVERS 6 X 4	12-03-2015 AT 1430 HRS	12-03-2015 AT 1500 HRS
12.	PROC-FC/CB/ P&P/1277/2014	LPG ODORIZING INJECTION UNIT	13-03-2015 AT 1030 HRS	13-03-2015 AT 1100 HRS

2. Tender Document(s), Annexure(s), SOR / TOR can be viewed and downloaded from website **www.ogdcl.com** under the title bar of **Tenders**.
3. The bids will be delivered at the reception of OGDCL House, Jinnah Avenue, Blue Area, Islamabad, Pakistan on or before the date and time above and the same will be opened as per the schedule mentioned above
4. OGDCL reserves the right to accept or reject any bid and to annul the bidding process and reject all the bids as per Public Procurement Regulatory Authority (PPRA) Rule-33.

EXTENSION

Reference our Tender Notice published in this newspaper on 02-01-2015, it is notified that in order to encourage the interested bidders to participate in the bidding process, the bid submission / opening date is extended as follows:-

S. NO.	TENDER ENQUIRY NO.	DESCRIPTION	EXTENDED	
			FROM	TO
1.	PROC-FC/CB/PROJ/ 1363/2015	DESIGN, MANUFACTURING, SUPPLY AND COMMISSIONING OF HOT OIL PACKAGE	02-02-2015	17-02-2015
2.	PROC-FC/CB/PRO/KPD-1366/2015	HIRING THE SERVICES OF CONTRACTOR FOR FABRICATION, INSTALLATION / ERECTION OF EQUIPMENT & PACKAGES, CONSTRUCTION AND COMMISSIONING AND SUPPLY OF EQUIPMENT, MATERIAL & MISCELLANEOUS ITEMS FOR KPD-TAY INTEGRATED DEVELOPMENT PROJECT (PC-4)	02-02-2015	17-02-2015

2. **Bid submission / opening time and all other terms & conditions shall remain unchanged.**

General Manager (Supply Chain Management)

OIL & GAS DEVELOPMENT COMPANY LIMITED

OGDCL House, Jinnah Avenue, Islamabad, Pakistan

Phone No: +92-51-920023540, Fax No: +92-51-9215090

PID(I)3804/14

We Explore Prosperity

www.ogdcl.com - www.ogdcl.com - www.ogdcl.com - www.ogdcl.com - www.ogdcl.com - www.ogdcl.com - www.ogdcl.com
http://www.bookstube.net/

www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

ایک مقابلہ صرف نوجوانوں کے لیے

بوجھیں تو جانیں

مرتب: سجاد قادر

(جواب لکھنے سے پہلے دیکھ لیجیے کہ آپ کی عمر 18 سے 28 سال کے درمیان ہی ہے)

ماہ جنوری میں دیے گئے اسلامی کوئز کے درست جوابات

اسلامی کوئز ۱۔ (الف) حضرت ابوبکر صدیقؓ (ب) امیہ بن خلف اسلامی کوئز ۲۔ (الف) ابوجہل (ب) حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ

قرعہ اندازی میں جیتنے والوں کے نام

1۔ عاتکہ زینب 2۔ محمد داؤد 3۔ فاطمہ صغیر 4۔ حسن روحانی

قرعہ اندازی میں جیتنے والوں کے نام

فاطمہ تحریم (کراچی)، محمد عبداللہ عمر بن محمد تجمل (دینہ)، حسن روحانی (اسلام آباد)، فیصل قریشی (راولپنڈی)، حسن مظفر (راولپنڈی)، حافظ سعد عبداللہ (ہری پور)، عابدہ عنایت (پشاور)، فاطمہ صغیر (منڈی بہاؤالدین)، ماہ رخ (حیدرآباد)، ولی حسین (حیدرآباد)، منیر احمد (حیدرآباد)، مرزا ہادی بیگ (حیدرآباد)، طہ حسین (حیدرآباد)، مرزا اسفار بیگ (حیدرآباد)، عصمت اللہ ساجد (واہ کینٹ)، اویس شیخ (ٹوبہ ٹیک سنگھ)، معاذ امین (اسلام آباد)، اشتیاق احمد (ملاکنڈ)، محمد بلال حسن جنجوعہ (سرگودھا)، محمد تنزیل عباس جنجوعہ (سرگودھا)، محمد تکلیل عباس جنجوعہ (سرگودھا)، محمد مبشر عباس جنجوعہ (سرگودھا)، حمزہ شہزاد خان (سرگودھا)، محمد داؤد (جڑانوالہ)، بشریٰ حبیب (کراچی)، میاں محمد اویس مظہر (لاہور)، محمد حمزہ قادری (حیدرآباد)، ملک ساجد ممتاز (چکوال)، اویس حبیب (فیصل آباد)، شمیم اختر (فیصل آباد)، محمد حبیب (فیصل آباد)، محسن حبیب (فیصل آباد)، حافظ امداد اللہ (اوکاڑہ)، عاتکہ زینب (راولپنڈی)، ربیعہ محمد حنیف (حیدرآباد)، نفاست حنیف (کراچی)، حماد انور (راولپنڈی)، فیضان اکرم (ہری پور)

اسلامی کوئز ۱

روم کے بادشاہ ہرقل نے حضورﷺ اور مسلمانوں سے جنگ کے لیے اپنی فوج جمع کر لی۔ جب یہ اطلاع حضورﷺ کو ملی تو آپ نے ''اسلامی جہاد'' کا عام اعلان فرمایا۔ ایسے اہم اعلان کے وقت معذوروں کو چھوڑ کر ہر مسلمان کا جہاد میں نکلنا فرض ہو جاتا ہے۔ یہ زمانہ سخت گرمی کا تھا۔ ملک میں خشک سالی اور قحط پڑا ہوا تھا۔ لوگ فاقہ کشی میں مبتلا تھے۔ صورت حال کے پیش نظر اس غزوہ کو ایک مخصوص نام دیا گیا۔ ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو جہاد کے لیے تیاری کا حکم وحی کے ذریعے دیا۔

(الف) اس غزوہ کا کیا نام ہے اور یہ کب ہوا؟ (ب) قرآن حکیم کی کس سورۃ میں اس جہاد کا حکم ملا؟

اسلامی کوئز ۲

اہل اسلام کا کفار سے یہ مقابلہ بہت سخت تھا۔ مشرکین تعداد اور سازوسامان کے لحاظ سے بہت زیادہ تھے۔ مسلمانوں کی تعداد کم تھی اور سامان جنگ بھی پوری طرح میسر نہ تھا۔ موسم شدید سردی کا تھا۔ کچھ کمزور ایمان، بوڑھے اور ضعیف لوگ ایسے تھے جو اللہ تعالیٰ کے بارے خیال کرنے لگے کہ دیکھیں اللہ تعالیٰ اب کیا کرتا ہے۔ اہل اسلام کی نصرت و مدد فرماتا یا انھیں شکست و ہزیمت سے دوچار کرتا ہے۔ اہل اسلام صحیح و سالم بچتے یا ہلاک ہو جاتے ہیں۔ اس وقت اہل اسلام میں کچھ لوگ انہی خیالات میں غلطاں و پیچاں تھے۔ چناں چہ اس جنگ کی پوری تصویر کشی ایک سورہ میں بیان کی گئی۔ جس میں اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کے امتحان اور نفرت کا ذکر کیا۔ اس جنگ میں اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کا ایک لشکر بھیج دیا جنھیں دیکھ کر کفار ڈر گئے اور گھبرا گئے۔

(الف) اس غزوہ کے کون سے ۲ نام ہیں؟ (ب) قرآن کریم کی کون سی سورۃ میں اس غزوہ کا ذکر ہے؟

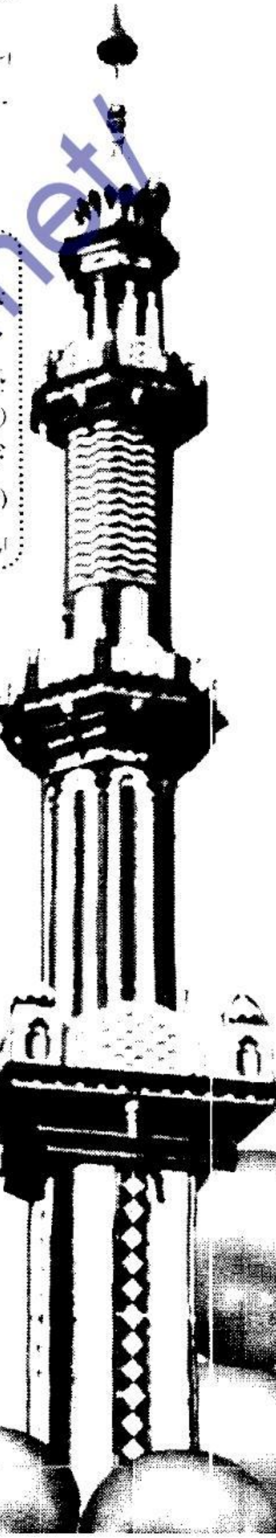

نوٹ: تمام قارئین اپنا نام و پتا جس پر TCS پہنچ سکے درست لکھیں اور ساتھ میں اپنا موبائل نمبر یا پی ٹی سی ایل نمبر دینا لازم ہے وگرنہ TCS پہنچ نہیں پاتا اور گزشتہ کئی ماہ سے ہمیں TCS واپس مل رہے ہیں۔ (مدیر اردو ڈائجسٹ لاہور)

انعامات کے لیے تعاون
اسلامک پبلی کیشنز
منصورہ ملتان روڈ لاہور

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material